روگ

فائزہ افتخار

آج ہی یہاں برقی قمقمے سجائے گئے تھے۔
سارا گھر جگر جگر کر رہا تھا۔

وہ رات کے اس پہر.....اس آخری پہر..... جب باقی سب تھک ہار کے جہاں جگہ ملی وہاں سو چکے تھے، اکیلی ٹیرس پہ کھڑی اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں جھانک رہی تھی۔

آج ہی اسے مایوں بٹھایا گیا تھا۔ ان کے ہاں شادی سے ہفتہ بھر پہلے ہی مایوں بٹھا دینے کا رواج تھا۔ دن میں محفلِ میلاد تھی۔ تقریباً سب ہی عزیز و اقارب موجود تھے۔

شام کو جب اسے مایوں بٹھایا گیا تو کتنی رونق تھی یہاں۔ چھوٹا سا لان بھرا پڑا تھا۔ لڑکے والوں کے ہاں سے میلاد اور مایوں کی سادہ سی گھریلو تقریب میں شرکت کے لئے صرف چار خواتین آئی تھیں۔ لڑکے کی والدہ، چھوٹی بہن جو شادی شدہ تھی، ایک پھوپھی اور ایک خالہ، ان کے باقی رشتہ دار دوسرے شہروں میں رہتے تھے ان کی شمولیت بعد کے فنکشنز میں ہونا تھی۔

وہاں سے صرف چار عورتوں کے آنے کے باوجود رونق خوب لگی۔ اس کی بہنیں، اپنی نندوں، دیورانیوں اور جٹھانیوں سمیت موجود تھیں۔ خاندان کی چچیوں، ممانیوں، خالاؤں کے ساتھ ساتھ درجن بھر کنواری اور آدھ درجن شادی شدہ کزنز بھی بال بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ خود اس کی دوستیاں بے حد محدود تھیں۔ امی نے تو کہا تھا کہ وہ اس موقع پر جتنی دوستوں کو چاہے مدعو کر سکتی ہے لیکن وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

جان پہچان اور اچھی بات چیت تو کلاس کی سب ہی لڑکیوں سے تھی۔ مگر خاص دوستی بینش کے علاوہ کسی سے نہ ہو پائی تھی۔ اس میں بھی زیادہ ہاتھ بینش کا تھا۔ جب سے کالج چھوٹا تھا اس نے بہت سی کلاس فیلوز کے نمبرز موجود ہونے کے باوجود ان سے رابطہ کرنا

ضروری نہ سمجھا تھا۔ یہ بینش ہی تھی جو دوسرے تیسرے دن فون بھی کرلیا کرتی اور مہینے میں ایک آدھ چکر بھی لگالیتی، ورنہ وہ ہوتی اور اس کا کمرہ، گھر کے گنے چنے کام جو اس کے ذمے تھے، انہیں وہ خاموشی سے نمٹاتی اور کمرہ بند کر کے رسالوں، ڈائجسٹوں کی دنیا میں گم ہو جاتی۔ بینش کی وجہ سے کبھی کبھار اسے اپنے خول سے باہر آنے کا موقع ملتا تھا۔ اسی لئے امی کو بینش کا آنا اچھا لگتا تھا۔ ابھی بھی اس کی شادی کی تاریخ ٹھہرتے ہی انہوں نے بینش سے بصد اصرار کہا تھا وہ شادی کے کچھ دن پہلے ہی ان کے ہاں آجائے۔ سو آج سے وہ اپنے کپڑے وغیرہ لے کر آچکی تھی۔ ڈھولک کے بعد چائے پی کر بجائے تازہ دم ہونے کے سب ہی لڑکیاں اِدھر اُدھر لڑھک کر سو چکی تھیں۔ ایک وہی تھی جو امی اور باجی کے ساتھ پھیلاوا سمیٹ رہی تھی۔ جھوٹے برتن، شگن کی مٹھائی، میوے اور اُبٹن کے تھال..... خالی بوتلیں وغیرہ۔

اس کی نظریں اب تک لان کے درختوں سے لٹکتے اور بیرونی دیوار اور گیٹ کے ساتھ ساتھ لگے خوبصورت رنگین برقی قمقموں پر جمی تھیں۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں نہ تو ان روشنیوں کا کوئی عکس تھا نہ ہی آنے والے دنوں کے حوالے سے کوئی حسین سپنا۔

وہ اپنے وجود سے پھوٹنے والی اُبٹن اور مہندی کی نرالی اَن چھوئی مہک سے بھی بے نیاز تھی۔

ٹھنڈی جالی سے ٹیک لگائے وہ ٹیرس کے پار نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

اماں نی، میری نیندیں بھاگیں
مجھ سے کوسوں دور
اماں نی، میرے سپنے ٹوٹے
چبھ گئی سینے پھانس
دل دریا کے بیچ
اماں نی، میری سنے نہ کوئی
ہاری کر کرتین
اماں نی، میری کشتی ڈوبی
عین کنارے پاس
اماں نی، میرے اندر بادل
بارش رو کے کون
اماں نی، میں نے چاند چرایا

جیون ہوا اندھیرا
اماں نی.....

''سویرا!'' امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''اتنی مگر ٹھنڈ (یخ سردی) میں تُو یہاں کیوں کھڑی ہے اور وہ بھی اس وقت، سحری ہونے والی ہے اب تو۔ نہ کوئی سویٹر، نہ جرابیں، ہلکی سی شال لے کر کھلے سر کھڑی ہے۔ کچھ عقل بھی ہے یا نہیں۔ سرسوں کا تیل بھی لگا ہوا ہے سر میں۔ پتہ بھی ہے کہ رات کو تیل بالوں میں لگا رہے تو تجھے نزلہ ہو جاتا ہے۔ اب سر نہیں دھو سکتی تو اسے ڈھانپ کے تو رکھ سکتی ہے۔''

اس نے گردن موڑ کے دیکھا۔ وہ بستر کی چادر بدلتے ہوئے ساتھ ساتھ اسے لیکچر دے رہی تھیں۔

''بچھی رہنے دیں یہی..... اسے کیا ہے؟'' وہ بے زاری سے بولی۔ شاید اسے اپنی تنہائی میں یہ مداخلت اچھی نہیں لگی تھی۔

''پتہ نہیں کس کے بدتمیز بچے بستر پہ بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ کل میں نے نئی نکور بچھائی تھی کہ تیرے کمرے میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا اور یہ دیکھ سالن گرا دیا ہے کسی نے۔'' انہوں نے لپک جھپک دوسری گہرے رنگوں والی دھاری دار بیڈ شیٹ بچھا دی اور وہ ہلکی گلابی اور سفید چادر گول مول کر کے بغل میں دبالی۔ ان کے ہاتھوں میں اب ایک ٹرے تھی، جس میں سویرا کے کمرے میں اِدھر اُدھر پھیلے گلاس، کپ اور پلیٹیں رکھی تھیں۔

''گرل بند کر کے اندر آجا..... سارا برآمدہ ٹھار (ٹھنڈا) دیا ہے تُو نے۔ نیچے ہال میں تو ہیٹر تک لگا ہوا ہے اور تُو ہے کہ رات کے ساڑھے تین بجے کھڑکیاں دروازے کھول کے بغیر گرم کپڑوں کے کھڑی ہے۔ ٹھنڈ لگ گئی تو مصیبت..... شادی کے دن کتنے رہ گئے ہیں۔ دو دن بعد تیری مہندی ہے اور سب سے بڑی بات، مایوں کے بعد ویسے بھی ننگے سر، کھلے آسمان کے نیچے آنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ ہوائی چیزوں کا سایہ ہو جاتا ہے۔''

وہ اپنی عادت کے مطابق ڈھیروں کے حساب سے نصیحتیں کرتی رہیں اور وہ اپنی عادت کے مطابق سر ہلاتی رہی۔

''بینش کو میں نے کہا ہے، تیرے لئے چائے بنا رہی ہے۔ میں ساتھ میں کاجو، پستہ بھیجتی ہوں۔ تیرے سسرال والوں نے بڑے عمدہ میوے بھیجے ہیں۔ سارے واہ واہ کر رہے ہیں۔'' جاتے جاتے انہوں نے مزید کہا۔

نہ تو سسرال والوں کے نام پہ سویرا کا رنگ گلابی ہوا، نہ دو دن بعد ہونے والی مہندی

کے تذکرے نے اس کی دھڑکنیں تیز کیں۔ وہ یونہی ٹہلتی بیٹھی رہی۔ اسے اپنے کمرے میں بینش کی متوقع موجودگی پہ بھی اُلجھن محسوس ہو رہی تھی حالانکہ بینش کی محبت اور خلوص پہ اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اگرچہ مزاجاً اس سے مختلف تھی اور بے شک اس کی شوخیوں میں اس کا ساتھ نہ دے پاتی پھر بھی اس کی دلچسپ باتوں کو انجوائے ضرور کیا کرتی۔

آج وہ بینش کا تو کیا اپنا سایہ بھی برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ اکیلے رہنا چاہتی تھی۔ اتنی اکیلی کہ اس کی کوئی سوچ، کوئی یاد تک اس کے آس پاس نہ بھٹکے۔

''کیا سوچ رہے ہو دو دن کے مہمانو؟'' بینش کی شوخ آواز نے اس کی آمد کا اعلان کیا۔

مگر وہ رخ بدلے دیوار کی جانب کروٹ لئے لیٹی رہی۔

''میرے خوابوں میں جو آئے
آ کے مجھے چھیڑ جائے''

اس سے کہو میری نیندنہ چرائے۔''

بینش نے چائے کے کپ پہ چمچہ بجا کے اپنی شریر آواز میں گیت چھیڑا اور سویرا کی بے زاری عروج پہ پہنچ گئی۔

''کیسا ہے، کون ہے وہ جانے کہاں ہے۔
جس کے لئے میرے ہونٹوں پہ ہاں ہے۔
اپنا ہے یا بیگانہ ہے وہ۔
سچ ہے یا کوئی افسانہ ہے وہ۔''

''بینش پلیز..... پلیز خاموش ہو جاؤ۔''

اس کی آواز میں غصہ نہیں تھا۔ ایک عجیب طرح کی بے بسی تھی۔ جسے بینش نے محسوس کیا تو اس کے گنگناتے لب خاموش ہو گئے۔

''مسئلہ کیا ہے سویرا! تم صبح سے عجیب طرح سے ری ایکٹ کر رہی ہو۔ اس قدر چڑچڑی ہو رہی ہو۔ کسی سے بھی ڈھنگ سے بات کر رہی ہو نہ ہی منہ کے زاویے درست ہو رہے ہیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا ہے۔ تمہیں کچھ احساس ہے کہ تمہارا رویہ لوگوں کو سو باتیں بنانے کا موقع دے سکتا ہے۔ ابھی آنٹی بھی یہی خدشہ ظاہر کر رہی تھیں۔''

''امی تو بس [illegible] سویرا نے سر جھٹکا۔ ''کوئی نہیں باتیں بناتا۔ سب مجھے عرصے سے [illegible] میں ایسی ہی ہوں۔''

''ہاں ہاں پتہ ہے سب کو..... اور مجھے بھی اچھی طرح پتہ ہے کہ آپ جناب بڑی سنجیدہ خاتون اور مدبر بی بی ہیں۔ فضول کی کھی کھی اور بے کار کا ہنسی ٹھٹھول آپ کو پسند نہیں۔ زیادہ گھلنے ملنے اور بے تکلف ہونے کی آپ عادی نہیں۔ بلا وجہ مسکرانا، بغیر کسی بڑی بات کے خوش نظر آنا یہ سب آپ کے نزدیک اسراف کے زمرے میں آتا ہے لیکن محترمہ سویرا عابد صاحبہ! سنجیدہ اور آدم بیزار ہونے میں اور زنجیدہ وملول ہونے میں بہت فرق ہے۔ زیادہ منہ لٹکا کے بیٹھو گی تو سب یہی سمجھیں گے کہ یہ شادی تمہاری مرضی کے خلاف ہو رہی ہے اور ضرور تم کسی دوسرے لڑکے کے چکر میں ہو۔''

''بکواس مت کرو۔''

''سچ کہہ رہی ہوں، آنٹی کے خدشے بالکل درست ہیں۔ کسی کو بھی شک ہو سکتا ہے۔ وہ تو آنٹی ماں ہونے کے ناطے اور میں دوست ہونے کے ناطے تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم اور کچھ بھی کر سکتی ہو حتیٰ کہ کسی کو قتل بھی کر سکتی ہو مگر کسی سے محبت..... ناممکن..... ورنہ یہ جو ساڑھے بارہ تمہاری شکل پہ بجے ہوئے ہیں یہ کسی کو بھی شک میں ڈال سکتے ہیں۔''

''تو کیا کروں میں؟'' وہ بے چارگی سے کہہ اٹھی۔

''سویرا! خشک سے خشک ترین مزاج والی لڑکی کے خوابوں میں بھی ان دنوں بہار آ جاتی ہے۔ کیا واقعی تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوتا؟'' وہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔

''یا پھر تم بنتی ہو.....؟ یا..... یا خواب دیکھنے سے کتراتی ہو، یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ کم آن یار..... سوچو..... سوچو کیسا ہوگا وہ؟ کیسا نظر آتا ہوگا۔ اس کی عادتیں کیسی ہوں گی؟'' بینش نے اس کے اندر اشتیاق جگانا چاہا۔

''میرے سوچنے سے کیا ہوتا ہے، وہ جیسا ہے ویسا ہی ہوگا۔ جیسی عادتیں اللہ نے اس کی بنائی ہیں ویسی ہی ہوں گی۔''

''توبہ کتنی بور ہو تم۔'' اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''میری دوستوں میں تم پہلی ہو جس کی شادی ہو رہی ہے۔ مگر ذرا مزہ نہیں آ رہا۔ نہ کوئی شوخی شرارت..... نہ کھٹی میٹھی باتیں۔ نہ کوئی رنگین خوابوں کا ذکر..... بڑی ہی ''بلیک اینڈ وائٹ'' سوچ ہے تمہاری اور تو اور تصویر تک دیکھنے سے انکار کر دیا۔ بھلا کیا جاتا دیکھنے میں..... وہ لوگ خود دے کر گئے تھے نا! آج کل تو شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کی باقاعدہ ملاقاتیں تک کرائی جاتی ہیں، چاہے شادی ارینج ہی کیوں نہ ہو۔ ایک دوسرے کو شادی سے پہلے جان لینے میں اور اچھی طرح سمجھ لینے میں کوئی برائی نہیں۔''

''ضروری نہیں۔'' سویرا نے اختلاف کیا۔

"کبھی کبھی پہلے سے کچھ جان لینا کسی کے حق میں برا بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔"

"ساری رات جاگنے کے بعد انسان کو کوئی بات دیر سے ہی سمجھ میں آتی ہے۔ سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔"

اس نے گفتگو سمیٹتے ہوئے لیٹنے کی تیاری کی اور اس سے پہلے کہ بینش کوئی اور سوال کرتی اس نے کمبل منہ تک تان لیا۔

☆======☆======☆

دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔

بھلے گھروں میں اس وقت بیبیاں کام کاج سے فارغ ہو کے بچوں کے لئے روٹیاں توے پہ ڈال رہی ہوتی ہیں۔ جن کے سکولوں سے آنے کا وقت ہوتا ہے۔

لیکن یہ گھر، ان گھروں میں سے تھا جہاں نہ تو کھانے پینے کے کوئی وقت اور اصول مقرر تھے، نہ صفائی ستھرائی کے۔

اس گھر کی سب سے بزرگ ہستی دادی تھیں جو صحن میں رکھی چارپائی پہ بیٹھی گنڈیریاں چوس رہی تھیں۔ نیچے اینٹوں کے فرش پہ چھوک کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جن میں پیاز، لہسن اور آلو، مٹر کے چھلکے بھی شامل تھے۔ چارپائی کے بڑے سے رنگین پائے کے نزدیک زمین پہ تانبے کا بڑا سا گلاس لڑھکا ہوا تھا۔ جس میں سے باقی بچی ہوئی لسی زمین میں جذب ضرور ہو گئی تھی لیکن اتنی جگہ اور گلاس کے کناروں پہ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ کھلے آنگن میں صرف یہی ایک چارپائی نہیں تھی بلکہ تین چارپائیاں بھی تھیں۔ گرمی کا موسم تھا۔ لہٰذا وہ کھلے صحن میں پیڈسٹل فین لگا کے چارپائیوں پہ سوئے ہوئے تھے۔ عموماً ذکیہ کے چیخنے چلانے پہ آٹھ نو بجے تک حمیرا برے برے منہ بناتی اٹھتی اور بستر تہہ کر کے چارپائیاں برآمدے میں کھڑی کر دیا کرتی یا پھر دس ساڑھے دس بجے صفائی والی ماسی دیناں آ کے یہ فریضہ انجام دیتی۔ مگر آج نہ تو ذکیہ گھر پہ تھی نہ ہی دیناں ابھی تک لوٹی تھی اس لئے دوپہر ایک بجے تک چارپائیاں بھی پڑی رہیں اور ان پہ بکھرے بستر بھی..... ذکیہ نے جانے سے پہلے اپنی چارپائی پہ بیٹھ کے جو ناشتہ کیا تھا اس کے برتن تک جوں کے توں پڑے تھے۔ مکھیوں کا ایک غول ان پہ بھی دعوت اڑا رہا تھا۔ ذکیہ کو صبح صبح مانگا منڈی جانا پڑا تھا۔ جہاں اس کی ایک قریبی سہیلی کی ساس کا چالیسواں تھا۔ ایسی کتنی ہی قریبی اور یکی سہیلیاں تھیں ذکیہ کی جن سے اس کی ساس ناواقف تھی۔ کچھ تو یہیں بورے والہ کی رہنے والی تھیں، ان کے ہاں بھی آنا جانا لگا رہتا۔ یا ان میں سے کوئی نہ کوئی

آئی رہتی۔ ایسا نہ ہوتا تو ذات برادری میں کوئی کم ملنا ملانا تو نہیں تھا ذکیہ کا، وہ گھومنے پھرنے کی شوقین تھی۔ سو گھر پہ ٹک کے اس سے بیٹھا نہ جاتا۔ کیا سسرال، کیا میکہ..... کیا محلے داری، کیا دوستی..... ہر جگہ اس نے تعلقات بنا کے رکھے تھے۔ دور پرے کے اور دوسرے شہروں دیہاتوں کے رہنے والوں کی خوشی غمی میں بھی لازماً شریک ہوتی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا شوہر عابد چودھری کویت میں تھا۔ سات آٹھ سال ہو گئے تھے، اسے ملک سے باہر گئے ہوئے۔ سب سے چھوٹی والی بیلی ابھی گود میں تھی جب عابد کا ویزا لگا۔ تب سے اب تک کویت کے دینار آ رہے تھے۔ اس نے پلٹ کے پاکستان کی جانب نہیں دیکھا تھا۔ گھر میں نئی نئی خوشحالی آئی تھی۔ مرد کی جانب سے پابندی نہ تھی۔ بچوں کی ذمہ داری بھی خاص نہ تھی، بوڑھی ساس رکھوالی کے لئے موجود تھی۔ اس نے تنہائی سے فرار اور دل بہلائے رکھنے کا یہی طریقہ اختیار کیا۔ ویسے بھی جب اچانک پیسہ آ جائے تو اپنے سے کم حیثیت والے رشتے داروں کے ہاں جا کر ملنے میں الگ ہی لطف آتا ہے۔ اپنے قیمتی لباس اور زیور دکھانے کا لطف..... آؤ بھگت کروانے کا لطف..... ذکیہ میں غرور یا اکڑ نہیں تھی۔ ہاں وہ ذرا خوشامد پسند اور دکھاوے والی ضرور تھی۔ اس نے غریب عزیزوں سے ملنا بھی ترک نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے ہاں جاتے ہوئے کبھی پھل، کبھی مٹھائی اور اپنے بچوں کی پرانی اُترن لے جانا، یہ سب اس کی نمائشی فطرت کو تسکین دیتا تھا۔

چار بچے تھے، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا فرخ، جو دن چڑھے سو کر تب اٹھا تھا جب اس کی ماں کو گھر سے نکلے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ بازار سے حلوہ پوری کا ناشتہ کر کے آنے کے بعد وہ اس وقت چھت پہ چڑھا پتنگ بازی کا شوق پورا کر رہا تھا۔ بہن بھائیوں میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ پندرہ سال کا تھا مگر کاٹھی مضبوط اور اٹھان اچھی تھی۔ خوش خوراکی اور بے فکری نے اچھی صحت عطا کی تھی۔ آس پاس کے رہنے والے اپنی عمر کے لڑکوں کے مقابلے میں وہ خاصا بڑا لگتا تھا۔ مزاج کا تیز تھا۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں کا منہ چڑھا بھی تھا۔ جس عمر میں بچوں کو ماں کے لاڈ کے ساتھ ساتھ باپ کی سختی اور سرپرستی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس عمر میں باپ پیسے کمانے کے لئے اولاد کو ماں کے حوالے کر گیا اور ماں کو جب بھی سفارتی دوروں سے فرصت ملتی، بے پناہ لاڈ پیار کے ذریعے کسر پوری کر لیتی۔ اسی وجہ سے آٹھویں کے بعد جب اس نے سکول جانے سے انکار کر دیا تو ماں سختی نہ کر سکی۔ ویسے بھی آٹھویں میں اس نے تین سال تو لگا ہی دیئے تھے۔ اب ایک سال سے وہ گھر میں آدھا دن سو کر یا پتنگ بازی کر کے گزارتا اور باقی کا دن گھر سے باہر دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کے۔

اس سے ڈیڑھ سال بڑی حمیرا تھی۔ بڑی ہونے کے ناطے وہ بھی گھر کے ہر معاملے میں ذکیہ کی مشیر تھی۔ ماں کی طرح اسے بھی دوستیاں گانٹھنے کا خاصا شوق تھا۔ ذکیہ کے گھر سے نکلنے کے بعد اس نے ناشتے کے جھوٹے برتن دھونے یا صحن میں جھاڑو لگانے، بستروں کو تہہ لگانے والی کسی ہدایت پر عمل نہیں کیا جو ذکیہ جاتے ہوئے سرسری طور پہ کر گئی تھی۔ فرخ ناشتہ کرنے جھورے حلوائی کی دکان پہ جا چکا تھا، اسے بازاری کھانے کی چاٹ تھی۔ دادی کو اس نے ماں کے ساتھ ہی نمٹا دیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے اس نے رنگ گورا کرنے والی کریم اپنے سانولے چہرے، ٹیالی گردن اور نرم ہاتھوں پہ جی بھر کے تھوپی، پھپھلی حمید پہ سلوایا گیا جارجٹ کا میرون سوٹ پہنا۔ اسی کلر کی لپ اسٹک لگائی۔ پنسل والے کاجل سے آنکھوں کو کنارا کیا اور اونچی ہیل والی سینڈل پہن کے دینا کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ اسے گھر سے اکیلے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اس نے اس واجبی سی پابندی کو کبھی اپنا اور دوسر نہیں بنایا تھا۔ وہ کام کرنے والی لڑکی دینا کے ساتھ اپنی سہیلیوں کے ہاں چلی جاتی۔ اگر دیر تک رکنے کا پروگرام ہوتا تو دینا چھوڑ کے واپس آجاتی۔ آج بھی حمیرا کا زیتون کے ساتھ بازار جانے کا پروگرام بنا تھا اور دینا اب تک نہ آئی تھی اس کے نہ آنے کی وجہ سے دوپہر کے ایک بجے تک صفائی کا باقی کام ویسا کا ویسا پڑا تھا۔

ہر جانب بھنبھناتی مکھیاں، بکھرے تکیے، چارپائیوں کے نیچے جھولتے کھیس اور سمٹی چادریں، جھوٹے برتنوں کا ڈھیر..... یہ سب دیکھ دیکھ کے دادی کا دم الجھ رہا تھا۔ سب سے بڑھ کے بھوک بے تاب کر رہی تھی۔

''وے فرخا.....!'' دادی نے گردن اونچی کر کے اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کے پوتے کو آواز دینے کی کوشش کی لیکن اوپر مچے ''بوکاٹا'' کے ہاہا کار میں اس کی ناتواں آواز کہاں پہنچ سکتی تھی۔

''کجھ کنڈا نہیں پتا اس گھر کا۔'' تھک ہار کے پیش گوئی کی۔

''بیچارہ پردیس میں مزدوریاں کر کر کے اپنا لہو، مشینوں میں ڈال کے انہیں لمبی لمبی رقمیں بھیجتا ہے اور اِدھر نہ گھر والی کو قدر ہے نہ اولاد کو پرواہ، آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔''

دن میں تین چار بار وہ اسی طرح دل کی بھڑاس نکال لیا کرتی تھی۔ چاہے کوئی سننے والا ہو یا نہ ہو۔

''ذکیہ نامراد کو تو سیر سپاٹوں سے فرصت نہیں۔ حمیرا کو بھی اسی کام پہ لگا دیا ہے۔ وہ تو گھر بھی پھپھی کا جو آنکھوں دیکھی مکھی نگل رہی ہے۔ میری بیٹی ہے نا، ماں کے کہنے

پہ..... اور بھائی کی محبت میں اس کی لڑکی مانگ بیٹھی ہے۔ جس کا نہ منہ نہ متھا..... اور نہ کوئی گھر داری..... نہ سلیقہ کنگھی پٹی کرا کے سہیل پنا (دوستیاں) کروا لو بس..... جیسی ماں ویسی بیٹی۔ لڑکا ہے تو وہ اک نمبر کا اتھرا، (اڑیل) الف کا بے نہیں پڑھا۔ سڑکیں ناپے، پتلونیں کسنے اور باپ کی کمائی اُجاڑنے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔ ہزاروں روپیہ بھیجتا ہے اور ایسا بدنصیب گھر ہے جس کے چولہے ٹھنڈے پڑے رہتے ہیں۔ چولہا جلانے والے ہاتھوں کو اور بہتیرے کام دھندے ہیں۔ ماں کی ہر وقت سفر کے لئے ٹکٹ کٹی رہتی ہے، بیٹی کے بازاروں کے چکر ختم نہیں ہوتے۔ بوڑھی دادی بھوکی پڑی ہے صبح کی..... ہے کوئی روٹی پوچھنے والا۔''

اس نے دہائی دی۔ اتنے میں دروازہ دھڑ سے کھلا اور سمیرا اور بیلی آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئیں۔ یونیفارم کی نیلی قمیص، سفید شلواریں دھول مٹی سے اٹی تھیں۔ بھاری سکول بیگ کمر پہ لادے ہوئے وہ ایک ہاتھ میں بھٹہ اور دوسرے میں گولیاں، ٹافیاں دابے ہوئے تھیں۔ جتنی صبح وہ سکول کے لئے نکلتیں اس وقت کوئی بھی ناشتہ بنانے پہ تیار نہ ہوتا۔ نہ ذکیہ نہ ہی حمیرا، اس لئے ان دونوں کو اچھا خاصا جیب خرچ ملتا تھا۔ سکول میں چاٹ، نان چنے یا سموسے کھانے کے علاوہ چھٹی کے بعد بھی وہ کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی چیز ساتھ لے آتیں۔ سمیرا بارہ سال کی تھی، چھٹی میں پڑھتی تھی اور سب سے چھوٹی بیلی تیسری جماعت میں تھی اور نو سال کی تھی۔

''امی.....!'' دادی کو مارے باندھے سلام کرنے کے بعد اس نے برآمدے میں جھانکا۔

''تیری ماں آگے کبھی گھر میں ہوئی ہے جو آج ہوگی۔'' دادی نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''دادی..... بھوک.....'' بیلی جو دادی کے پہلو سے چپک کے بیٹھی تھی، منہ بسورتے ہوئے بولی۔

''تُو تو ہے ہی بھوکی..... نان پکوڑے بھی کھائے، نمک مرچ والے امرود بھی، ابھی بھٹہ لے کر دیا ہے۔'' سمیرا نے زمین پہ بیگ پھینک دیا اور دونوں پیر آپس میں رگڑ کے جوتے اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔

''کیا پکا ہے دادی؟'' بیلی نے اس کی باتیں نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کلیجہ پکا ہے میرا۔'' دادی نے اسے پرے ہٹایا۔ بھوک میں لاڈ بھی اچھے نہ لگ رہے تھے۔

''پکانے کے لئے پکانے والی کا ہونا ضروری ہے اور نہ تیری ماں کا تلوا نکلتا ہے گھر میں نہ بہن کا۔ پکانا کس نے ہے؟''

''تو دادی تم تو گھر پہ ہو۔ تم پکالو، اس عمر میں آ کے پکانا بھی بھول گئی ہو۔''

سمیرا اپنی بڑی بہن اور بھائی کی طرح منہ پھٹ اور بدتمیز تھی، اس لئے تنک کے بولی۔

''مر..... بے ہدایتی.....'' دادی بلبلا اٹھی۔

''مجھے نہ نظر صحیح طرح آتا ہے، نہ ہڈی ہڈیاں گھسیٹ کے چلا جاتا ہے۔ اب میں اس عمر میں کھوتے جتنی جوان لڑکیوں کو پراٹھے پکا کے دوں۔''

''نہ سہی پراٹھے، سوکھی روٹی ہی پکادو۔'' دادی کو تپا کے اسے بڑا مزہ آتا تھا۔

''اور ویسے بھی ابھی کل خالہ ثریا تم کو کہہ رہی تھیں کہ تمہاری اتنی عمر نہیں جتنی عام طور پر نانیوں دادیوں کی ہوتی ہے۔''

''تو بڑی کن سوئیاں لیتی ہے میری، ماں کی چمچی۔'' دادی نے چپل اٹھائی۔ ''ہاں نہیں ہے میری عمر..... مگر حال اپنے سے بڈھی عورتوں سے برا ہے۔ تیری کچی (سگھڑ) ماں نے مجھے بخشیاں بنانا کے نہیں پلائیں۔ جتنی تیری زبان چلتی ہے، اتنے ہی ہاتھ پیر ہلا لے۔ تُو کیوں نہیں پکالیتی۔ تیری عمر کی لڑکیاں ساری ہانڈی روٹی کرتی ہیں۔''

''کرتی ہوں گی۔ ساری لڑکیوں کے ابا کویت نہیں ہوتے۔'' وہ اِتراتی۔ ذکیہ نے بچوں کے دماغ میں اچھی طرح یہ بات بٹھادی تھی کہ وہ اس محلے کے باقی لوگوں سے الگ ہیں۔ وہ تو گھر میں کوئی جوان مرد نہ ہونے کی وجہ سے اس کے شوہر نے یہ تاکید کی ہوئی تھی کہ وہ اس پرانے محلے کو نہ چھوڑیں، جہاں پرانی جان پہچان ہے۔ ورنہ وہ گھر میں معقول پیسے بھجوانے کے علاوہ بینک میں بھی برابر رقم جمع کراتا رہتا تھا۔ تاکہ وطن واپس لوٹنے پہ اچھا سا مکان کسی بڑے شہر میں لے سکے اور نیا کاروبار بھی شروع کر سکے۔ اس کے بچوں نے ابھی سے خود کو بوریوالہ کا سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔

''روٹی پکاتی ہے میری جوتی۔ بلی! جا بشیرے کے ہوٹل سے دو قیمے والے نان پکڑ لا۔ کہنا، امی شام کو پیسے دے دے گی۔''

''نامراد، بے دید..... دادی یاد نہیں؟ اس کے ساتھ پیٹ نہیں لگا ہوا؟''

''چلو، دادی! کیا یاد کرو گی۔ ایک نان تمہارا بھی منگوا لیتے ہیں۔''

''تو کون سا احسان کر رہی ہے۔ جو ایسے جتا رہی ہے۔ تیری تو چھینٹی لگانی پڑے گی اب، گھڑی گھڑی میرے منہ کو آتی ہے۔''

''چل اٹھ نا، قیمے والے نان کا سن کر اب مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔'' سمیرا نے بلی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

''میں نے نہیں جانا۔ میں تھکی ہوئی ہوں۔ بشیرے کے ہوٹل پہ رش بھی بڑا ہوتا ہے۔ اتنی دیر سے باری آتی ہے۔''

''اسے رہنے دے سمیرا! اس وقت ہوٹل پہ جو لفنگا ہوتا ہے، وہ جمع ہوتا ہے، فرخ سے کہہ وہ لادے۔''

''لو دادی کی بات سنو.....'' سمیرا نے کھینچ کھانچ کے آخر بلی کو کھڑا کر دیا۔

''فرخ بھائی تو امی کے کہنے پہ کبھی نیچے نہیں اُترے۔ میری بات کیا ماننی ہے اس نے۔ چل بلی جلدی کر۔''

بلی چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب سے دبتی تھی اور کچھ فطرتاً بھی دبو تھی۔ دل نہ چاہنے کے باوجود کھڑی ہو گئی۔ اپنی خاموش طبیعت کی وجہ سے دادی کی حفاظتی بھی تھی۔ اب بھی دادی کو اس پہ ترس آنے لگا۔

''لو، ذرا سی بچی، گرمی میں پیدل چل کر سکول سے گھر آئی ہے اور ماں کا سکھ نصیبوں میں ہے، نہ پکی پکائی روٹی۔ اب پھر گلی گلی پھرے گی۔ پیٹ بھرنے کے لئے۔'' وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ بلی دس پندرہ منٹ بعد اخبار میں لپٹے گرم گرم قیمے والے نان لے بھی آئی۔ سمیرا نے پلیٹیں لانے کی زحمت کئے بغیر اخبار میں سے ہی نوچ نوچ کر کھانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ دادی نے سر اٹھایا۔

''لو آ گئی تمہاری مسافر ماں، اسے بھی خوشبو آ گئی ہو گی قیمے والے نان کی۔ سہیلیاں بھی تو بھوکے ننگے خاندانوں کی بنائی ہیں۔ الٹا ان کے لئے خوراکیں خرید کے لے جاتی ہے۔ آگ لگادی ہے مرد کے پیسوں کو۔''

دادی اس وقت اپنے منہ سے دونوں کام برق رفتاری سے لے رہی تھی۔ کھانے کا بھی..... اور طعنے دینے کا بھی۔ ذکیہ کے لئے شاید یہ معمول کی بات تھی۔ اس نے ساس کی باتوں کا جواب دینا تو درکنار ان پہ برا ماننے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ چادر اتار کے چارپائی پہ پھینکنے کے بعد وہیں بیٹھ کے ہاپنے لگی۔ اس نے ناگواری سے زمین پہ کری گندگی، برتنوں اور بستروں کو دیکھا ضرور تھا، مگر ان کے بارے میں کسی سے بازپرس کرنا ضروری نہ سمجھا تھا۔

''پیدل چل کے آ رہی ہے مانگے منڈی سے؟'' دادی پھر طنزیہ بولی۔

''اچھی بھلی سویرے گھر سے نکلی تھی۔ وہاں جاتے ہی پیٹ میں درد اور مروڑ..... توبہ، برا حال ہے۔'' وہ وہیں دراز ہوگئی اور چادر سے پلو سے بندھا ہوا بٹوہ نکالا۔

''ببلی! جانگڑ کے کھوکھے سے سوڈے کی بوتل لے آ۔''

''امی، میں نے نہیں جانا۔'' اس نے ٹھنک کے کہا۔

''میں ابھی ابھی باہر سے نان لے کے آئی ہوں۔ میرے سے نہیں جایا جاتا بار بار۔''

''نا تو تیرے باپ نے دس دس نوکر رکھ کے دیئے ہوئے ہیں مجھے۔'' پیٹ کے درد سے وہ پہلے ہی بے حال تھی۔ ببلی کے انکار نے اسے سیخ پا کر دیا۔

''وہ دس کیا بارہ نوکر بھی رکھ دے تب بھی اس گھر کا کچھ نہیں ہونے والا۔'' پیٹ پوجا کرنے کے بعد دادی میں اور دم خم آ گیا تھا۔ ''نوکروں پہ راج کرنے والیوں کے بھی کوئی کرن ہوتے ہیں۔''

''اماں! میں اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہوں۔'' ذکیہ کتنی ہی سست اور لاپرواہ ہو۔ ساس سے بدکلامی سے پرہیز کیا کرتی۔

''چل شاباش ببلی! جلدی کر۔ بہت درد ہے۔''

''میں تھکی ہوئی ہوں، سمیرا سے کہو۔''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ اس نے ٹھیکہ لے رکھا ہے صبح شام چکر لگانے کا۔'' دادی نے اپنی لاڈلی پوتی کی سائیڈ لی۔

''اماں! سمیرا اب سیانی ہوگئی ہے۔ اس لئے اسے دکانوں پہ نہیں بھیجتی۔''

''تو ببلی کے سیانے ہونے میں کتنا وقت ہے اور وہ جو سب سے بڑی ہے، جواں جہان..... اسے تین گھنٹے ہو رہے ہیں گھر سے نکلے ہوئے۔ کچھ اس کی بھی پرواہ ہے یا نہیں۔''

''دیناں ساتھ ہی ہوگی، گھر میں جو گوڑے کے ڈھیر لگے ہیں اس سے ہی پتہ چل گیا تھا اس لئے فکر نہیں ہوئی۔''

''ہاں دیناں تو جیسے بڑی اعتبار والی بندی ہے نا، جس کے ساتھ لڑکی کو بھیج کر تجھے فکر ہی نہیں ہو رہی۔ اس کا کوئی بھروسہ ہے بھلا، مجھے تو حمیرا کا اس کے ساتھ لور لور پھرنا پسند نہیں، بھائی کس لئے ہوتے ہیں۔ اچھے گھروں کی لڑکیاں باپ بھائی کے ساتھ باہر جاتی اچھی لگتی ہیں۔ اب اپنی بوتل کے لئے آواز دے نا اسے..... جو بیڑے سے لگا رہتا ہے، چھتیس گھنٹے۔''

''ارے اماں! نہیں منگانی مجھے بوتل۔'' ذکیہ نے ہاتھ جوڑے۔

[redacted] کہ اپنے شہزادے کو تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ مانا کہ اکلوتا ہے لیکن اس کا مطلب

یہ نہیں کہ اسے لاڈ میں برباد کر کے رکھ دیا جائے۔ میرا بھی اکلوتا بیٹا ہے۔ پیار بھی کیا مجھ بیوہ عورت نے اور باپ کی طرح رعب بھی رکھا۔ بگڑا حرام نہیں بنایا ورنہ آج پردیس میں دیہاڑیاں نہ لگا رہا ہوتا۔ بیبیاں منجی توڑ رہا ہوتا تیرے بیٹے کی طرح..... پھر میں دیکھتی یہ عیش و آرام کہاں سے ہوتے۔ لڑکی ہے تو اس کا ناس مار ڈالا ہے تُو نے۔ بجائے گھر داری سکھانے کے اسے بازاروں اور سہیلیوں کے گھروں کا رستہ دکھا دیا ہے۔ وہ بھی کیا کرے، ماں جو کرے گی اس نے وہی دیکھنا اور وہی سیکھنا ہے۔''

''اچھا اماں! بس کرو۔ مان لیا میں نے۔ میں بڑی نکمی ہوں۔ اب بس کرو۔'' پیٹ کے ساتھ ساتھ اب سر میں بھی درد ہونے لگا تھا۔

''نکمی تھی تو نہیں، اب ہوگئی ہے۔'' دادی کا والیم اچانک کم ہوا۔ اسے شاید شادی کے ابتدائی سالوں والی ذکیہ یاد آ گئی تھی۔ تب وہ خاصی گھڑ ہوا کرتی تھی۔ اب غالباً شوہر کی غیر موجودگی اور روپے پیسے کی فراوانی نے لاپرواہ کر دیا تھا۔

''اب بھی وقت ہے، عقل کر، پیسے کا کیا ہے آنی جانی چیز ہے۔ آج ہے تو فائدہ اٹھا۔ جوڑ کے رکھ۔ کھانے پینے، تحفے دینے اور کپڑے لیرے بنانے میں ضائع نہ کر۔ یہ گھر دیکھ، اس محلے کے باقی گھروں سے الگ نظر نہیں آتا۔ وافر کمائی کا کوئی اثر گھر پہ نظر نہیں آتا۔ گھر میں گھر والی کا دل لگے تو اس کو گھر بنانے، سجانے کا شوق بھی ہو۔ یہ تو شکر کر، بانو بے شک تیری نند ہے، لیکن پھر بھی نند پنا نہیں دکھایا۔ نہ تیری لاپرواہیاں دیکھیں نہ تیری بیٹی کے سر سپاٹے، اپنے لائق فائق بیٹے کے لئے مانگ لیا حمیرا کو۔''

''بڑا احسان کیا ہے اماں! مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔'' ضبط کرتے کرتے بھی ذکیہ کی آواز بھرا گئی۔ ببلی سے دیکھا نہ گیا۔ یہ بحث اس کے جانے سے انکار سے ہی شروع ہوئی تھی۔ اسی لئے اس نے اس بحث کو ختم کرنے کا سوچا۔

''لاؤ امی! پیسے دو، میں بوتل لا دوں۔''

اسے دروازے سے نکلتا دیکھ کے دادی ایک بار پھر بڑبڑائے بغیر نہ رہ سکی۔

''ہاں، اب اسے بھی رستہ دکھاؤ باہر کا۔ کوئی کسر نہ رہے۔''

☆======☆======☆

رومیصہ کے ہر انداز سے عجلت جھلک رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا وہ کہیں جانے کے ارادے سے جلدی جلدی کام نمٹا رہی ہے۔

حق نواز نے کچھ دیر تک اسے برق رفتاری سے کی بورڈ پہ انگلیاں چلاتے، سی ڈیز دراز

میں رکھ کے لاک کرتے اور فائلز کیبنٹ میں رکھتے دیکھا۔ اب وہ اپنا سیل فون اور چابیاں وغیرہ اٹھا کے اپنے شولڈر بیگ میں رکھ رہی تھی۔ اس دوران بوکھلاہٹ میں کئی بھی ڈیز ہاتھوں سے پھسل کر نیچے جا گری تھیں۔ جنہیں سمیٹتے ہوئے اس کے سادہ سے چہرے پہ جھنجھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ فائلز رکھتے ہوئے بھی اس نے اپنی عادت کے مطابق ترتیب کا کوئی دھیان نہیں رکھا تھا۔ بلکہ الٹی سیدھی ڈھیر کر دی تھیں۔ حق نواز کے لئے یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ اس وقت فون پہ کسی سے بات کر رہا تھا اور کن انکھیوں سے گاہے بگاہے اس کی عجلت اور گھبراہٹ بھی دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی رومیصہ نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا، حق نواز نے دوسری جانب سے بات کرنے والے کو بات مکمل کرنے کا موقع دیئے بغیر ہی جلدی سے "اللہ حافظ" کہتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"خیریت رومیصہ؟ کس کا فون تھا؟"

وہ یہ تو نوٹ کر ہی چکا تھا کہ اچھی بھلی انہماک سے کام کرتی ہوئی، وہ اچانک آنے والی ایک فون کال سے ڈسٹرب ہوئی تھی اور اس کے بعد ہی اس نے افراتفری میں اپنا کام سمیٹا تھا۔

"گھر سے تھا، سنیعہ کا۔" وہ جواب دے کر تیزی سے مڑی اور پھر کچھ یاد آنے پہ پلٹی۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نمودار ہو گئی۔

"سر سے تو بات کی ہی نہیں اور وہ ابھی میٹنگ میں بزی ہیں۔ حق نواز! تم میرے لئے ایک فیور کرو گے۔ پلیز سر منظور سے کہہ دینا کہ میں گھر جا رہی ہوں۔ ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" حق نواز نے ایک دم ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم شاید بھول رہی ہو کہ تمہاری کھٹارا اور کشاپ میں ہے۔"

"اوہ یس....." اس نے ماتھے پہ ہاتھ مارا۔ "ایک تو یہ گاڑی ہمیشہ ان دنوں دغا دے جاتی ہے، جب اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممی کا بی پی ایک دم شوٹ کر گیا ہے اور ڈاکٹر نے کہا تھا ایسی حالت میں ان پر فالج کے دوسرے اٹیک کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ بہت کیئر کی ضرورت ہے۔ اب پتہ نہیں کتنی دیر ان کی طبیعت خراب رہے۔ میں تو ان کا بی پی ہائی ہونے پہ فوراً ہسپتال لے جاتی ہوں، فوری ٹریٹ منٹ کی وجہ سے پیرالائز ہونے کا خطرہ ٹل جاتا ہے، اگر رات کو خدانخواستہ....."

تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بولے جا رہی تھی۔

"تم اتنا آگے تک کا مت سوچا کرو اور اگر سوچنا ہی پڑے تو کم از کم اچھا سوچو۔ ایسا کرو تم آج میری گاڑی رکھ لینا۔ میری طرح قابلِ اعتبار ہے۔"

"تمہیں پریشانی ہو گی۔"

"اگر تکلفاً کہہ رہی ہو تو لعنت ہے تمہاری سوچ پہ اور واقعتاً میری پریشانی کا خیال ہے تو ڈونٹ وری..... میں تمہاری طرح ان چار پہیوں پہ مکمل انحصار نہیں کرتا۔ میری بائیک کس طرح کام آئے گی اور کل تو یوں بھی آف ڈے ہے۔"

رومیصہ ایک بار پھر گھر کا نمبر ملا کے سنیعہ سے بات کر رہی تھی۔ "او کے، یہ اچھا ہے، تم پہنچو..... میں آ رہی ہوں۔ ہاں حق نواز بھی ساتھ ہے۔ پریشان مت ہونا۔ تمہارے ہاتھ پیر پھولیں گے تو ممی کی طبیعت اور بگڑے گی۔ ان کی ساری فائلز ساتھ رکھ لینا۔"

"رائٹ سے ٹرن لے لینا، ہم گھر نہیں، ہسپتال جا رہے ہیں۔" اس نے سیل فون آف کرتے ہوئے کہا۔

"سامنے والی آنٹی صغرا اپنی کار میں ممی اور سنیعہ کو ہسپتال لے جا رہی ہیں۔ وہ خود بھی ڈاکٹر ہیں۔ اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"یہ بات تمہیں اپنے آپ کو بتانا چاہئے، مجھے نہیں، کبھی سنیعہ کو پریشان نہ ہونے کی تاکید کر رہی ہو، کبھی مجھے فکر نہ کرنے کا کہہ رہی ہو۔ جب کہ ہوائیاں تمہارے اپنے چہرے پہ اڑ رہی ہیں۔"

"کیا کروں؟" اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ آواز میں آنسوؤں کی نمی گھل گئی تھی۔

"چار سال پہلے جب انہیں فالج کا پہلا اٹیک ہوا تھا تب بہت مشکل وقت گزرا تھا۔ میرے فائنل ایئر امز ہو رہے تھے۔ سنیعہ بہت چھوٹی تھی ابھی نائنتھ اسٹینڈرڈ میں پڑھتی تھی۔ میں اکیلی ممی کو سنبھالنے کے قابل نہ تھی اس کے باوجود مجھے انہیں چودہ سالہ بچی کے بھروسے پہ چھوڑ کے نکلنا پڑتا تھا۔ بہت کٹھن دور تھا۔ ایک تو علی کے اچانک غائب ہونے کا صدمہ..... فنانشل کرائسس..... اور پھر ممی کا پیرالائز ہونا۔ کبھی تو دل چاہتا تھا سب چھوڑ چھاڑ کے گھر بیٹھ جاؤں۔ اس اتنی سی بچی کے لئے تقریباً ناممکن ہوتا تھا ممی کی دیکھ بھال کرنا، لیکن میں ایسا کر بھی تو نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ پایا نے چھوڑا تھا وہ ممی کی بیماری اور قرضے چکانے میں ختم ہو گیا۔ ممی کی جاب بھی نہ رہی۔ اب اگر میں بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جاتی تو..... جیسے تیسے پیپرز دیئے۔ رزلٹ کے بعد جاب کی تلاش..... شکر ہے زیادہ خوار نہ ہونا پڑا، لیکن نئی نئی

جاب اور وہ بھی ایسی نفٹ، اس کے ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داریاں اور ممی کی دیکھ بھال۔ ان کو ہسپتال وزٹ کے لئے اور فزیوتھراپی کے لئے لے جانا، یہ سب مجھے مشین بنا گیا۔"

"تمہاری محنت رنگ بھی تو لائی۔ آنٹی پیرالائز ہونے کے ڈیڑھ سال بعد بھی اپنے پیروں پہ چلنے اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے کے قابل تو ہو گئیں، ٹھیک ہے کہ ان کا دایاں بازو اور ٹانگ پرابر موو نہیں کرتے مگر اب انہیں کم از کم کسی پہ ڈیپنڈ تو نہیں ہونا پڑتا۔ یہ بھی بہت بڑی بات ہے ورنہ فالج کے شکار بعض اوقات ایسے خوش قسمت ثابت نہیں ہوا کرتے۔"

"اس بات کا تو میں بھی شکر ادا کرتی ہوں، لیکن ساتھ ہی وہ مشکل دن یاد آتے ہیں تو خوفزدہ بھی ہو جاتی ہوں۔ ان کا بی پی ذرا سا بھی ہائی ہو جائے تو مجھے فکر ہونے لگتی ہے۔ فالج کا دوسرا اٹیک زیادہ خطرناک ہوا کرتا ہے۔"

"ہاں، فکر تو ہوتی ہے، میری امی بھی ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں، لیکن ان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ پرہیز کی قائل نہیں۔ کہیں آنٹی بھی تو بد پرہیزی نہیں کرتیں؟"

"نہیں، ایک تو انہیں ویسے بھی کھانے پینے سے خاص دلچسپی نہیں۔ ضروری خوراک بھی بہت اصرار کے ساتھ کھلانا پڑتی ہے۔ دوسرا سنیعہ خاص دھیان رکھتی ہے کہ کھانے میں نمک، مسالے اور آئل زیادہ نہ ہونے پائے۔ یہ اس کا ڈیپارٹمنٹ ہے لیکن صرف ڈائٹ کنٹرول کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹرز زیادہ ٹینشن لینے سے بھی تو منع کرتے ہیں۔"

اس بار حق نواز کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ بھی نہیں کہ انہیں ٹینشن سے دور رکھا کرو۔ کیسے کہتا جب کہ وہ جانتا تھا۔ جس ماں نے اپنے دس سال کے خوبصورت، صحت مند ذہین بچے کو کھویا ہو اسے قرار کہاں؟

اس نے اسی خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔

☆======☆======☆

رومیصہ نثار کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور متمول گھرانے سے تھا۔ اس کے پاپا ایک کامیاب سرجن تھے، تو ممی ایک ہائی کوالی فائی پروفیسر، تین بہن بھائیوں میں رومیصہ کا پہلا نمبر تھا۔ اس سے سات سال چھوٹی سنیعہ تھی اور سب سے چھوٹا علی، ان کا اکلوتا اور پیارا سا بھائی۔ یہی ان کی چھوٹی سی فیملی تھی اور اسے زیادہ چھوٹی اس لئے لگا کرتی کہ پاپا اور ممی دونوں بے انتہاء مصروف لوگ تھے۔ گھر اور بچوں کے لئے جانے کے باوجود وقت کم ہی نکال پاتے وہ اور سنیعہ تو پھر خوش قسمت تھی کہ ان کا سارا بچپن دادا اور دادی کی پُرشفقت تربیت میں گزرا۔ ڈاکٹر نثار اور مسز نیلوفر نثار بچیوں کو اطمینان سے دادا دادی کے سپرد کر کے اپنے فرائض

نبھاتے۔ اگرچہ دیکھ بھال کے لئے گورنس بھی موجود تھی۔ مگر ڈاکٹر نثار کی والدہ پرانے خیالات کی مالک تھیں۔ انہیں بچوں کا ملازموں کے رحم و کرم پہ چھوڑنا پسند نہ تھا۔ جہاں تک ان سے ممکن ہوتا وہ بچیوں کے سب کام اپنی نگرانی میں کرواتیں۔ حتیٰ کہ ان کے ٹیوٹر اور قاری صاحب گھر آنے پر بھی ان کے ساتھ موجود ہوتیں۔ ان کی نگہداشت پہ ہی بھروسہ کر کے مسز نیلوفر نثار نے دو بچیوں کے بعد ایک بیٹے کی خواہش پر تیسری بار ماں بننے کا حوصلہ کر لیا۔

لیکن علی کے آنے کے بعد دادا، دادی دونوں نے دنیا سے جانے میں زیادہ وقت نہ لگایا۔ علی کو ڈھائی سال کی عمر میں گورنس کے سپرد کر دیا گیا۔ مسز نثار کی تدریسی ذمہ داریاں مزید بڑھ چکی تھیں۔ اب وہ ایک بڑے تعلیمی ادارے کی وائس پرنسپل تھیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی میں ان کی لیکچرر شپ بھی جاری تھی۔ دوسری جانب ڈاکٹر نثار اپنے برسوں پرانے خواب کی تکمیل میں مگن تھے۔ اپنی سالوں کی محنت سے کمائی جانے والی دولت کے ساتھ ساتھ خاندانی جائیداد تک لگا کر وہ ایک بڑا اور جدید ہسپتال بنانا چاہ رہے تھے۔ لہٰذا جو وقت ملتا بھی تو وہ اسی میں صرف ہو جاتا۔ رومیصہ اور سنیعہ اپنی پڑھائی میں مصروف تھیں، کیونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین کی جانب سے اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں تھی لیکن اس سب کے باوجود علی سب کا چہیتا اور لاڈلا تھا۔ علی شروع سے ہی بے انتہا ذہین تھا۔ اسے بہترین سکول میں داخل کرایا گیا۔ اس کے لئے دنیا کی ہر آسائش مہیا کرنے کی کوشش کی جاتی۔

ابھی وہ پانچ سال کا تھا کہ ڈاکٹر نثار دل کے پہلے دورے میں ہی خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس وقت جب ان کا خواب تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ یہ سانحہ پوری فیملی کے لئے کئی لحاظ سے ناقابلِ برداشت تھا۔ ایک تو بچے اس عمر میں باپ کے سائے سے محروم ہو گئے، جب انہیں اس کی اشد ضرورت تھی اور دوسرا یہ کہ ڈاکٹر نثار جاتے جاتے اپنے پیچھے لاکھوں کا قرضہ چھوڑ گئے۔ جو مسز نیلوفر نثار کو یہ بنگلہ، چند پلاٹ جو بچیوں کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے لے کر رکھے گئے تھے۔ اپنے جہیز میں ملنے والا فلیٹ اور قیمتی زیورات تک بیچ کر ادا کرنا پڑا۔ پوش علاقے سے وہ ایک نسبتاً متوسط علاقے کے معقول فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔ گورنس، کک، ڈرائیور..... سب کو فارغ کرنا پڑا۔ اگرچہ مسز نیلوفر نثار کی اپنی آمدنی خاصی تھی لیکن وہ نہ تو بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں کوئی کمپرومائز کرنے پہ تیار تھیں، نہ ہی ان کے طرزِ زندگی میں نمایاں فرق لا کے انہیں احساس محرومی اور احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا چاہتی تھیں۔ اس لئے بچے اب بھی ان ہی اعلیٰ تعلیمی اداروں میں پڑھ رہے تھے۔ جن کی فیس ادا کرنے میں ان کی تنخواہ کا اچھا خاصا حصہ نکل جاتا۔ ایک جزو وقتی ملازمہ بھی تھی۔ اس کے

علاوہ وہ چونکہ دن کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتیں اس لئے بلڈنگ کے گیٹ کیپر کو تنخواہ سے زائد رقم دیتیں تاکہ وہ ان کی غیر موجودگی میں فلیٹ کا دھیان رکھے۔

ابتداء میں انہیں خاصی مشکل پیش آئی۔ عملی زندگی میں وہ عرصے سے تھیں۔ پہلے بھی جاب اور گھر کی ذمہ داریاں دونوں ہی نے اٹھا رکھی تھیں، لیکن تب ذمہ داریاں بانٹنے والا بھی موجود تھا اور وہ یہ کام اپنے شوق اور لگن سے کرتی تھیں۔ اب مجبوراً محنت کرنا پڑ رہی تھی تاکہ گھر اور بچوں کے خرچے چلتے رہیں۔ اب جسمانی تھکان کے ساتھ ساتھ اعصابی اور ذہنی تھکان بھی رہنے لگی تھی۔ امی سب سے بڑی بیٹی رومیصہ بھی سولہ سترہ سال کی تھی اس کے باوجود خود کو بہت عمر رسیدہ محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ جو ہمیشہ بہت تر و تازہ اور ہشاش بشاش رہا کرتیں اب پژمردہ اور نڈھال نظر آنے لگیں۔

رومیصہ عمر کے لحاظ سے سمجھ دار اور معاملہ فہم تھی تو سنیعہ فطرتاً راضی بہ رضا رہنے والی۔ بچیوں نے باپ کی کمی کو محسوس تو کیا لیکن حالات کی تبدیلی کو قبول بھی کر لیا۔ جب کہ ناز و نعم اور آسائشات میں پلنے والا علی چڑچڑا ہوتا گیا۔ وہ اپنی گورنس کو بھی بہت مس کرتا تھا جس سے پچھلے ڈھائی تین سالوں میں وہ خاصا اٹیچ ہو چکا تھا۔ اسے یہ چھوٹا سا فلیٹ بہت برا لگتا تھا وہ اپنے وسیع و عریض بنگلے میں بنے لان میں سائیکل چلانا چاہتا تھا، فٹ بال کھیلنا چاہتا تھا، اس کی ضد کے ہاتھوں مسز نیلوفر نثار نے مجبوراً اسے بلڈنگ کے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت دے دی۔ رفتہ رفتہ بہل ہی گیا۔

مسز نیلوفر کو اس کی پڑھائی میں دلچسپی نہ لینے پہ تشویش تو تھی لیکن وہ جانتی تھیں ابھی اسے اس ماحول سے مانوس ہونے میں وقت لگے گا۔ گیٹ کیپر الفت خان سے انہوں نے خاص طور پہ علی کا خیال رکھنے کو کہہ رکھا تھا تاکہ وہ بلڈنگ سے باہر نہ جانے پائے اور وہ بھی الفت خان سے خاصا مانوس ہو چکا تھا۔ ایک دو سال میں وہ سب بھول بھال گیا۔ یوں بھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ وہ نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہوا تو اس کی ذہانت بھی مزید بڑھ گئی۔ اپنی بڑی بہنوں کی طرح وہ بھی کلاس میں نمایاں پوزیشن لینے لگا حالانکہ کھیل میں اس کی دلچسپی برقرار تھی۔ اسٹڈیز کو واجبی سا وقت دینے کے باوجود وہ اچھے مارکس لے لیتا تھا اس لئے مسز نیلوفر اس کے باہر رہنے پہ زیادہ اعتراض نہیں کرتی تھی اور ویسے بھی وہ ان کے آنے سے پہلے پہلے گھر واپس ضرور آ جاتا تھا لیکن ایک شام جب مسز نیلوفر نثار گھر لوٹیں تو رومیصہ کو پریشانی کے عالم میں بالکونی سے نیچے جھانکتے پایا۔

"ممی! علی اب تک گھر نہیں آیا۔"

"اس کو اب ذرا کھینچ کے رکھنا ہی پڑے گا۔ فقط ہشینڈرڈ میں آ گیا ہے۔ ویسے تو ذہین ہے مگر لاپرواہ بھی ہے۔ اگر اب بھی اس نے اسٹڈیز کو سیریسلی نہیں لیا اور یونہی اپنا ٹائم ویسٹ کرتا رہا تو....."

"ممی! اس کے سارے فرینڈز واپس آ چکے ہیں۔" وہ اپنی گرم شال اتار کے تہہ کرنے کے بعد اپنی سینڈل اتارتے ہوئے کہہ رہی تھیں جب رومیصہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بتائی۔ ان کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے۔ سوالیہ نظروں سے وہ بیٹی کی جانب دیکھنے لگیں۔

"میں نے آس پاس کے سب ہی فلیٹس میں پتہ کروا لیا ہے۔" اس کی بات سنتے ہی انہوں نے دوبارہ سینڈل پہنی اور شال اوڑھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے خود علی کے سب دوستوں کے گھروں میں جا کے پتہ کیا، وہاں سے علم ہوا کہ سبھی تو اپنی فیملی کے ساتھ ویک اینڈ گزارنے اپنی نانو کے ہاں گیا ہوا تھا۔ زوہیب فلو ہونے کی وجہ سے نیچے ہی نہیں اترا جب کہ فیضی اور سرمد جو ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے، ان کے مشقلی ٹیسٹ ہو رہے تھے، وہ بھی آج کھیلنے نہیں آئے۔ ان کے علاوہ دو اور دوست تھے۔ ان دونوں کا کہنا تھا کہ اپنے باقی دوستوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے وہ جلدی بور ہو کے واپس چلے گئے تھے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ علی اور کتنی دیر تک نیچے رہا اور کیا کرتا رہا۔ الفت خان کے بیان کے مطابق اس نے آخری بار علی کو کمپاؤنڈ کے اندر ہی سائیکل چلاتے دیکھا تھا۔ جب وہ عصر کی نماز پڑھ کر واپس آیا تو کمپاؤنڈ خالی تھا۔ وہ یہی سمجھا کہ علی بھی اوپر چلا گیا ہوگا۔

مسز نیلوفر کے ساتھ آس پڑوس کے کئی لوگوں نے ہر ممکنہ جگہ پر علی کی تلاش رات بھر جاری رکھی۔ اگلے دن پولیس میں رپورٹ بھی درج کرائی گئی لیکن علی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اس وقت وہ دس برس کا تھا۔ اس کے جانے کے صرف ڈیڑھ مہینے بعد ہی مسز نیلوفر نثار فالج کے باعث معذور ہو گئیں۔ دو سال رومیصہ نے ان کی بیماری سے لڑتے گزارے۔ اب وہ اس قابل ضرور تھیں کہ چل پھر لیتی تھیں۔ دایاں بازو حرکت نہیں کرتا تھا اور دائیں ٹانگ میں بھی ہلکی سی لنگڑاہٹ آ گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اب معذوری کی زندگی نہیں گزار رہی تھیں اور رومیصہ اسی پہ اللہ کی شکر گزار تھی۔ البتہ بیٹے کی جدائی کے غم سے ماں کو نکالنے میں ناکام تھی جس نے پچھلے چار سال سے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

حمیرا کمرے کے اندر تھی، لیکن باہر سے کٹی ہوئی ہرگز نہ تھی کہ باہر برآمدے میں ذکیہ

کے سامنے اس کا منگیتر آصف نہ صرف اسے صاف نظر آ رہا تھا بلکہ وہ خود بھی اپنی بھرپور تیاریوں کی جھلک اسے دکھانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ذکیہ کی پشت دروازے کی جانب تھی اس لئے وہ بیٹی کی سرگرمی سے لاعلم تھی اور نہ جانے کون سے خاندانی قصے چھیڑے بیٹھی تھی۔ جن کو بے دھیانی سے سنتے ہوئے آصف مسلسل سر ہلائے جا رہا تھا البتہ پھسلتی ہوئی بے باک نظریں بار بار حمیرا پہ جا پڑتی تھیں، جو لال سرخ کریپ کا جوڑا پہنے، دوپٹے کا پلو جان بوجھ کر نیچے گرائے دروازے کے پٹ پہ اپنا سرخ نیل پالش سے سجا ہاتھ رکھے انگلیاں شرارت سے نچا رہی تھی..... مکارے اور آئی لائنر سے بوجھل پلکیں بھی ناز سے پٹ پٹائی جا رہی تھیں۔ ذکیہ گلاس رکھنے کے لئے نیچے جھکی تو آصف نے نظر بچا کے اسے ایک شوخ سا اشارہ بھی کیا جس پہ اس نے شرم و حیا کا مظاہرہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اسی کمرے میں اس کی دونوں چھوٹی بہنیں بیٹھیں اپنا ہوم ورک کر رہی تھیں۔

''باجی کو دیکھنا ذرا..... سری دیوی بنی ہوئی ہے۔'' سمیرا نے ببلی کو ٹہوکا دے کر متوجہ کیا۔ اس کے لبوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ببلی نے بھی اس منظر میں دلچسپی ظاہر کرنا چاہی مگر اسے خاص مزہ نہ آیا۔

''کیا ہے؟'' وہ بار بار کے ٹہوکوں سے بدمزہ ہوئی۔

''دیکھ تو سہی، اپنے آپ کو ہیروئن سمجھ رہی ہے اور ہیرو دیکھ ذرا..... منا لاہوری، زکوٹا جن۔'' وہ ہنسی دباتے ہوئے بولی۔ اگر یہ تبصرہ حمیرا کے کانوں تک پہنچ جاتا تو اس کی پھینٹی لگنا لازمی تھی۔

''زکوٹا جن..... ہاں سچ..... عینک والا جن کا ٹائم ہو گیا ہے، چلو ٹی وی لگائیں۔'' ببلی نے اس ڈرامے کا نام لیا جو آج کل اس کا پسندیدہ تھا۔

''گولی مارٹی وی کو، یہ فلم جو لگی ہے سامنے۔'' پتہ نہیں اسے کیا مزہ آ رہا تھا جو اس کے دانت اندر نہیں جا رہے تھے۔ ببلی اپنی کتابیں سمیٹ کر ٹی وی والے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں پہلے ہی دادی کا قبضہ تھا۔

''ببلی..... او ببلی.....!'' ابھی پہلا وقفہ ہی آیا تھا کہ ذکیہ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔

''جا، بشیرے کے تندور سے روٹیاں پکڑ لا اور صادق کی دکان سے پاؤ بیسن اور انڈے بھی لا دے۔ اب آصف اتنے دنوں بعد آیا ہے تو روٹی کھائے بغیر تو نہ جانے دوں گی۔ شور بے والے کوفتے ہیں، بغیر ابلے انڈوں کے مزہ نہیں آئے گا اور آصف میرے ہاتھ کے پکوڑوں کی بھی فرمائش کر رہا ہے، چل، جلدی سے دوڑ لگا۔''

''امی..... عینک والا جن۔'' اس نے دہائی دی۔

''آگ لگے تیرے عینک والے جن کو، گھر میں ہونے والا جوائی بیٹھا ہے، اسے بہانے پڑے ہوئے ہیں۔ اٹھ جا میں کہہ رہی ہوں۔''

''ذکیہ! فرخ کو بھیج دے۔ کم از کم شام کے وقت تو لڑکی کو نہ بھیجا کر۔'' دادی نے بھی اندر ہی سے آواز دی۔

''فرخ کبھی اس وقت گھر ہوا ہے اماں؟ اور اپنا محلہ ہے۔ ڈر کی کیا بات، اتنی رونق ہوتی ہے باہر، اب میں روٹی ڈالوں یا دکانوں کے پھیرے لگاؤں۔ حمیرا تو آج باہر نکلنے والی نہیں۔ پتہ تو ہے کہ اتنی شرمیلی ہے۔'' ذکیہ کے اٹھتے ہی دروازے کی اوٹ میں کھڑی حمیرا جلدی سے اندر ہو گئی۔ اس ساری بحث کے دوران آصف ڈھیٹ بنا بیٹھا رہا۔ ایک بار بھی خود دکان پہ جانے کی پیشکش نہیں کی اور کیوں کرتا، یہ صرف اس کے ماموں کا گھر نہیں تھا، ہونے والا سسرال تھا۔

برے برے منہ بناتے ہوئے ببلی ہاتھ میں پیسے دبا کے چلی ہی گئی۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وقفے کے دوران وہ یہ کام کر لے تاکہ اس کا ڈرامہ نہ چھوٹ جائے۔

''چاچا! شیر بارہ روٹیاں کڑک۔'' اس نے بنچوں کے بل اچک کے تندور والے کو زور سے آواز دی۔

''چاچا! گھر مہمان آئے ہیں، مجھے پہلے لگا دو..... میں ابھی آ کے لیتی ہوں۔''

یہاں سے وہ اسی طرح بھاگتی ہوئی صادق کی دکان تک گئی۔

''صادق بھائی جان.....'' دکان پہ اسے کوئی نظر نہ آیا تو وہ اندر جھانک کے آواز دینے لگی۔ نیچے فرش پہ دری بچھا کے لیٹا ایک لڑکا رسالہ پڑھ رہا تھا۔

''کیا چاہئے؟'' وہ اٹھ بیٹھا۔ سترہ اٹھارہ سال کا نوعمر لڑکا تھا۔ اس سے پہلے ببلی نے اسے کبھی اس دکان یا محلے میں نہیں دیکھا تھا۔ یہاں یا تو صادق بھائی جان ہوتے یا ان کا چھوٹا بھائی راجا..... کبھی کبھار ان کے بوڑھے ابا ہوتے۔

''پاؤ بیسن اور چھ انڈے۔''

اس نے سامنے رکھے انڈوں کی ریک میں سے چھ انڈے تو فوراً نکال کر ایک لفافے میں ڈالے اور مڑ کے زمین پہ رکھے ڈھیر سارے کنستروں پہ نظر ڈالنے لگا۔

''بیسن..... ہاں..... یہ رہا۔'' اس نے ایک اور لفافے میں بیسن ڈالا۔ تھوڑا سا فرش پہ بھی گر گیا۔ پھر وہ اسے تولنے کے لئے ترازو میں رکھنے لگا تو اسے پاؤ وزن والا باٹ ہی کتنی

دیر نہ ملا۔ ہر بات سے انا ڑی پن جھلک رہا تھا۔

"اوہو..... پاؤ ہی ہوگا۔ اندازہ تو ہو رہا ہے۔ یہ لو بھئی اور لاؤ پیسے۔"

"کیوں..... میں تمہیں کیوں دوں پیسے؟" بلی نے پیسوں والا ہاتھ پیچھے کیا۔

"یہ صادق بھائی جان کی دکان ہے، ان کی چیزیں ہیں، میں کسی اور کو پیسے کیوں دوں؟"

"ارے واہ..... تو سودا بھی پھر اپنے صادق بھائی جان سے لو..... چلو شکل گم کرو....."

اس کے ڈانٹنے پر وہ سہم کر پیچھے ہٹی تو لڑکے کی ہنسی نکل گئی۔

"اوئے بدھو، میں اِدھر کھڑا ہوں تو دکان والوں کا کچھ لگتا ہی ہوں گا۔ صادق بھائی جان میرے کزن ہیں۔ وہ کسی کام سے گھر گئے ہیں۔ یہ سودا چاہئے تو لے جاؤ اور پیسے چپ چاپ اِدھر رکھ جاؤ..... اگر نہیں تو شاباش..... مجھے رسالہ پڑھنے دو۔"

اسے اگلی دکان پہ جا کے مزید وقت ضائع کرنے کے خیال سے کوفت ہوئی۔ اس نے جلدی سے لفافے پکڑے، پیسے رکھے اور بھاگنے کی تیاری کی۔

"یہ لو....." اس نے ایک چیونگم اس کی جانب بڑھائی۔

"یہ کیوں؟" وہ ہچکچا گئی۔

"رکھ لو، میرے پہلے پہلے کسٹمر کے لئے۔ یہ لو پیاری بے بی۔" اس نے زبردستی اسے چیونگم تھمائی اور دوبارہ سے رسالہ کھول لیا۔

روٹیاں لے کر وہ گھر آئی تو ذکیہ کچن میں مصروف تھی۔ دادی ابھی تک ٹی وی کے سامنے اور آصف وہیں جما بیٹھا تھا۔ کچن سے چونکہ لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ صاف نظر آتا تھا اس لئے حمیرا اب تک جھانک نہیں کر رہی تھی۔

آصف بے زاری سے بیٹھا گردن اِدھر اُدھر گھما کے جائزہ لے رہا تھا۔

"اے بلی..... اِدھر آؤ۔" آصف نے اشارہ کیا۔

کمرے سے آتی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ جلدی واپس لوٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اب دوسرا وقفہ آ رہا تھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے آصف کے قریب آئی۔

"اور سناؤ، کون سی کلاس میں پڑھتی ہو۔" ایسی ہی دو چار اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے نظر بچا کے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

"اپنی باجی کو دے دینا۔" سرگوشی کے انداز میں کہا گیا۔ ایک سنسنی سی بلی کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ یہ ڈیوٹی اسے بڑی دلچسپ محسوس ہوئی۔ وہ اس رقعے کو چھپا کے کمرے میں

آئی تو حمیرا نظر نہ آئی البتہ سمیرا کی جاسوس نظروں نے بھانپ لیا۔

"یہ ہاتھ میں کیا ہے؟"

"آصف بھائی جان نے دیا ہے، باجی کے لئے۔" اس نے اسی رازدارانہ انداز میں کہا۔

"دکھاؤ ذرا۔" اس کے ناں، ناں کرتے بھی سمیرا نے رقعہ چھین لیا اور چمکتی آنکھوں کے ساتھ چسکے لے لے کے پڑھنے لگی، کہیں اس کا رنگ گلابی ہو جاتا اور کہیں سرخ۔ البتہ بلی کے سر کے اوپر سے یہ باتیں گزرتی رہیں۔ وہ جمائیاں لیتی رہی۔ اچانک ساتھ والے سٹور سے حمیرا نکلی۔ سمیرا کے چھپاتے چھپاتے بھی اس نے رقعہ اچک لیا۔

"حرام خور! میرا خط پڑھتی ہے۔" اس نے سمیرا کی کمر میں جڑنے کے لئے مکا اٹھایا ہی تھا کہ وہ غچہ دے کر باہر نکل گئی۔ بلی قابو میں آ گئی۔ حمیرا نے اسے ہی دو تھپڑ دے مارے۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ رونے لگی۔ الٹا حمیرا کو مصیبت پڑ گئی کہ دادی یا ماں اِدھر نہ آ جائیں اس کی آواز سن کر اور اس کا خط پکڑا جائے، جس سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس جمعے کو ملنے والے ہیں اور پہلے بھی ملتے رہے ہیں۔ یہ راز کھل جاتا تو اس کا گھر سے باہر نکلنا بند ہو جاتا۔ آصف سے تو کبھی مہینے ڈیڑھ مہینے بعد ملنا ہوتا تھا، لیکن روز کی سیر اور بازاروں میں خریداری..... یہ سب بھی ختم ہو جاتا۔"

"چپ کر پٹاخہ..... چپ کر جا....."

"سمیرا پڑھ رہی تھی۔ میں تو لے کے آئی تھی آصف بھائی جان سے..... امی....." حمیرا نے اس کے منہ پہ سختی سے ہاتھ جما دیا۔

"چپ..... پہلے پھوٹا تھا کہ اس ذلیل سمیرا کی غلطی ہے۔ شاباش اِدھر آ، میں کل تیرے لئے بازار سے اتنا پیارا ہیئر بینڈ لائی تھی اور ہاں میرا ایک کام کرے گی تو کل سکول کے لئے پورے دس روپے دوں گی۔" اس نے بہلا پھسلا کے اسے چپ کرا ہی لیا اور ایک جوابی خط لکھ کے اسے تھمایا۔

"یہ چپکے سے اپنے آصف بھائی جان کو دے دینا اور دیکھو کسی کو پتہ نہ چلے، اس سمیرا کی بچی کو بھی نہیں، تُو تو میری سہیلی ہے نا، کل میرے ساتھ زیتون کے گھر بھی چلنا۔ اس کی چھوٹی بہن سے تیری بھی دوستی ہے۔ دونوں مل کے کھیلنا۔" ڈھیر سارے لالچ اور بہلاوے دے کر اس نے بلی کو منا لیا تھا۔

☆======☆======☆

''آنٹی کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''شکر ہے اللہ کا۔ پہلے سے خاصی بہتر ہے۔ اس روز تمہارے لیکچر کا خاصا اثر ہوا تھا۔ دو دن سے بلڈ پریشر بھی نارمل ہے۔ اگر اسی طرح بیکار کی ٹینشن سے دور رہیں گی تو آئندہ بھی ٹھیک رہیں گی۔ جب تمہارے لیکچر کا اثر ختم ہونے والا ہوگا تو میں بتا دوں گی۔ آ کر ایک ڈوز اور دے جانا۔''

اس کی نظریں مانیٹر پر جمی تھیں، ایک ہاتھ ماؤس کو متحرک رکھے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے بالوں کی اس موٹی سی لٹ کو بار بار کان کے پیچھے اُڑسنے میں مصروف تھی، جو کلپ کی قید سے نکل گئی تھی۔ ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ لئے وہ اس کے سوال کا تفصیلی جواب دے رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح حق نواز کو بے حد اچھی لگ رہی تھی۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ اس نے حق نواز کی جانب دیکھتے ہوئے کوئی بات کی ہو۔ پتا نہیں وہ ایسا ارادتاً کرتی تھی یا غیر ارادی طور پر..... مگر اسے رومیصہ کی ادا بہت بھاتی تھی۔

''فی الحال تو تمہیں، آنٹی اور سنیعہ کو آنا ہوگا ہمارے ہاں۔''

''وہ کیوں؟''

''بھول گئیں۔ شاہ نواز بھائی کی شادی یا پھر باقاعدہ دعوت نامے کی منتظر تھیں۔ خیر..... یہ میں لے آیا ہوں۔ تمہارا کارڈ.....''

اس نے ایک خوبصورت کارڈ اس کی جانب بڑھایا، جسے رومیصہ نے اپنا کام روک کے بغور پڑھا۔

''ویل..... ولیمہ تو ہمارے گھر کے نزدیکی ہال میں ہے۔ یعنی آسانی رہے گی۔ پہنچ جائیں گے بھئی۔''

''کیا مطلب.....؟ صرف ولیمہ اٹینڈ کرو گی۔ مہندی، اُبٹن حتیٰ کہ کل ہونے والی ڈھولکی میں بھی تم انوائٹڈ ہو۔ خبردار جو کوئی گھپلا کیا تو۔''

''دیکھو، میں جھوٹے وعدے نہیں کر سکتی، اس لئے صاف صاف کہہ رہی ہوں کہ صرف ولیمہ پہ آؤں گی اور میرے ساتھ ممی یا سنیعہ ہوں گی یا نہیں، اس کے بارے میں بھی ابھی سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔''

''کیوں، بہت مصروف ہستی ہوگئی ہو جو چھوٹے موٹے لوگوں کی خوشیوں میں شریک ہونا گوارا نہیں؟''

''پلیز حق نواز! یوں عورتوں کی طرح طعنے مت دیا کرو، اچھے نہیں لگتے۔'' وہ ہنس

پڑی۔

''کب اچھا لگتا ہوں یہ بتا دو تا کہ میں آئندہ اسی کیفیت، اسی حالت میں رہا کروں۔''

''جب میرے کہے بنا میری بات سمجھ جاتے ہو تب۔''

''ابھی بھی میں کچھ کچھ سمجھ تو رہا ہوں مگر تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔''

''تم مجھے کام کرنے دو گے یا نہیں؟''

''ضرور کرنے دوں گا مگر یہ جاننے کے بعد کہ تم میرے ہاں آنے سے کتراتی کیوں ہوں جب کہ فوزیہ کی شادی میں تم خوشی خوشی شریک ہوئی تھیں اور تب ہماری دوستی ایسی گہری بھی نہ تھی۔ دو تین ماہ ہوئے تھے جان پہچان کو۔''

''اور تب ہی میں جان گئی تھی حق نواز! کہ تمہاری فیملی مجھے پسند نہیں کرتی۔ نہ صرف میرے ساتھ بلکہ اس آفس کی وہ سب لڑکیاں جن کو تم نے کولیگ ہونے کے ناطے اپنی بہن کی شادی میں انوائٹ کیا تھا۔ سب ہی کے ساتھ ان کا رویہ عجیب سا تھا۔ اس کے بعد ایک آدھ بار، جب بھی میں ان سے ملی، مجھے شدت سے یہ محسوس ہوا کہ انہیں مجھ سے ملنے سے تو کیا، میرے ہونے یا نہ ہونے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں بلکہ انہیں شاید تمہارا مجھ سے زیادہ ملنا جلنا بھی پسند نہیں۔ مجھے ان باتوں سے کوئی خاص پرابلم نہیں، نہ ہی میں اس میں اپنی انسلٹ محسوس کرتی ہوں۔ میں ایک میچور لڑکی ہوں، جانتی ہوں ہر فیملی کی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ ان کے ذہن میں اگر باہر کام کرنے والی خواتین کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں تو یہ ایسی انوکھی بات نہیں۔ میں اسے انا کا مسئلہ بنا کے آنے سے انکار نہیں کر رہی بلکہ میں اس خوشی کے موقع پہ تمہاری امی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی کیونکہ بات صرف اتنی نہیں کہ وہ مجھے ایک ورکنگ ویمن ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتی ہیں بلکہ شاید تمہارے حوالے سے بھی وہ کچھ خدشات رکھتی ہیں۔ ہاں ولیمہ پہ میں آجاؤں گی۔ ہماری دوستی کا بھرم بھی رہ جائے گا اور یہ فنکشن خاصا فارمل سا ہوتا ہے۔ اس لئے زیادہ آمنا سامنا نہیں ہوگا۔'' اس نے اتنی وضاحت سے یہ سب کہا کہ حق نواز کچھ کہہ ہی نہ سکا۔

اس نے واقعی کچھ غلط بھی تو نہیں کہا تھا۔ اس کی امی واقعی دقیانوسی خیالات کی تھیں اور سب سے بڑھ کے اس کا بڑا بھائی شاہ نواز..... جس کی شادی تھی۔ اسی کی ضد کے نتیجے میں فوزیہ جو ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی، میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکی کیونکہ شاہ نواز کالج یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اسی کے کہنے پہ فوزیہ کی شادی محض سترہ سال کی عمر میں کر دی گئی۔ حالانکہ امی پہلے بہلانا چاہتی تھیں اور شاہ نواز کی شادی کے

لئے شرائط بہت سخت تھیں۔ اسے پردے کی پابند اور سیدھی سادی لڑکی چاہئے تھی۔ اب کہیں جا کے اس کی امی سویرا کو ڈھونڈ پائی تھیں جو تھی تو کالج سے گریجویٹ مگر پردے کی سخت پابند تھی۔ بہت کم گو اور معصوم شکل وصورت والی اس لڑکی کا چہرہ ہی اس کے باحیا ہونے کی گواہی دیتا تھا۔ ایسے میں اگر حق نواز نے اشاروں کنایوں میں رومیصہ کے لئے اپنی پسندیدگی ظاہر کردی تھی تو ان کا بھڑکنا فطری تھا۔ وہ دوسری بہو کے طور پر ایسی لڑکی کو کبھی برداشت نہیں کرسکتی تھیں جس کے سر پر باپ کا سایہ تھا نہ بھائی کا ساتھ۔ وہ یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی اور اب مردوں کے ساتھ اخبار کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ بغیر پردے کے سارے شہر میں گاڑی دوڑاتی، خبریں اکٹھی کرتی پھرتی تھی۔ رومیصہ ان کی ناگواری پہچان گئی تھی۔ ابھی تو وہ یہ جانتی تھی کہ اس کی ناگواری کی اصل وجہ حق نواز ہے۔ جس نے ماں کو دبے الفاظ میں یہ بتا دیا تھا کہ وہ رومیصہ کو زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہے۔

فوزیہ کی شادی پہ اس کے اور دوسری کولیگز کے آنے پہ شاہ نواز نے بھی ناک بھوں چڑھائی تھی۔

''بہن کی شادی ہے اور تم نے گرل فرینڈز کا ڈھیر اکٹھا کرلیا ہے۔ وہ لوگ کیا خیال کریں گے کہ کیسا آزاد خیال گھرانہ ہے، ضرور لڑکی بھی.....''

''فار گاڈ سیک شاہ نواز! پتہ نہیں کیسے کیسے فضول خیالات آتے ہیں تمہارے ذہن میں۔''

اسے ان سب کولیگز کا ''گرل فرینڈز'' ٹھہرائے جانا سخت برا محسوس ہوا جن سے اس کا خلوص اور احترام کا رشتہ تھا بلکہ رومیصہ اور اس جیسی کئی کو وہ بے حد سراہتا تھا جو اپنی فیملی کے لئے جدوجہد کررہی تھیں۔ رومیصہ کی مثال سامنے تھی۔ وہ کم عمر تھی اور پُرکشش بھی۔ اس کی طرح کتنے ہی لوگوں نے اس کی ہم سفری کی تمنا کی ہوگی۔ وہ چاہتی تو کسی کا ہاتھ تھام کے ایک خوشحال اور بے فکر زندگی کی شروعات کرسکتی تھی۔ مگر وہ ماں کے علاج، بہن کی اعلیٰ تعلیم اور گھر کے دیگر اخراجات پورے کرنے کے لئے ہی یہ جاب کررہی تھی۔ یہ لٹ جاب جو عام عورتوں کے بس کی بات نہیں پھر کیسے اسے یا کسی اور ایسی لڑکی کو برا قرار دیا جاسکتا ہے جو گھر سے نکل کر باہر کام کرنے پہ مجبور ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے ان میں اکا دکا ایسی ہوں جو شوقیہ جاب کرتی ہوں مگر ان چند کی وجہ سے سب کو ہی غلط نہیں کہا جاسکتا۔ کم از کم وہ تو ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ صرف اپنی کولیگز کا ہی نہیں بلکہ روز بس اسٹاپ پہ نظر آنے والی ہر اس لڑکی کا احترام کرتا تھا جو روزگار کی نیت سے گھر سے باہر قدم نکالتی تھیں۔ اس کے دل میں ان لڑکیوں کے لئے گھر

میں بیٹھنے والی خواتین سے کہیں بڑھ کے احترام تھا۔

یہ بدکردار کیسے ہوسکتی ہیں۔ اگر ہوتیں تو ڈیڑھ دو ہزار کے لئے گلی محلوں کے پرائیویٹ سکولوں میں چھ چھ گھنٹے سر نہ کھپاتیں۔ دسویں، بارہویں منزل کی سیڑھیاں چڑھ کے کسی معمولی سے آفس میں ٹائپسٹ کی نوکری نہ کرتیں۔ آٹھ سو روپے کی خاطر ریلوے سٹیشن کے نزدیک بنے کھوکھا نما پی او میں ٹیلی فون آپریٹر کی سیٹ پہ بیٹھ کے ہر قماش کے بندے کو مسکرا مسکرا کر نہ جھیلتیں اور نہ ہی سیلز گرل بن کے گلی گلی پراڈکٹ بیچنے کی خاطر گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتیں اور بدلے میں خاتونِ خانہ کی بری بھلی سنتیں۔ اگر یہ واقعی بدکردار ہوتیں تو یہ سب کیوں کرتیں۔ کیوں جان توڑ محنت اور ذلت والی زندگی جیتیں۔ وہ بڑی آسانی سے غلط ذرائع سے اس سے کہیں زیادہ رقم کما سکتی تھیں لیکن وہ ایسا نہیں کرتیں۔ محنت اور حلال کی کمائی پہ یقین رکھنے والی ان محنت کش خواتین پہ انگلی اٹھانا اسے پسند نہیں تھا مگر یہ اس کے اپنے خیالات تھے، ان کو وہ نہ اپنے بھائی پہ ٹھونس سکتا تھا، نہ ماں کو قائل کرسکتا تھا۔

''چلو اچھا ہے، نہ آئے رومیصہ! وہ خاصی سمجھدار ہے۔'' اس نے مزید اصرار نہ کیا۔

''تم یقیناً فرخندہ لودھی کے کسی فیچر پہ کام کررہی ہو۔'' اثبات میں جواب ملنے پہ برا سا منہ بنا کے رہ گیا۔

''ایک تو یہ محترمہ تمہارے حواسوں پہ چھا گئی ہے۔ ذرا سوٹ نہیں کرتی تمہیں ایسی تعریف لگاتی، نام نہاد آزادئ نسواں کی حامی سوشل ورکر ٹائپ خواتین سے دوستی۔''

''پہلے تو میں یہ تصحیح کردوں کہ وہ محض آزادی کے بنیادی حقوق کے لئے کام کرتی ہے، خاص طور پہ بچے۔ بچوں کو جس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے وہ.....''

''بس بس، رہنے دو۔ ہونہہ..... بچوں کو نظر انداز۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں سر جھٹکا۔

''میں نے کم از کم اپنے آس پاس بچوں کو نظر انداز ہوتے نہیں دیکھا۔ ہمارے معاشرے میں تو بچوں کو کچھ زیادہ ہی انڈر آبزرویشن رکھا جاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ کیئر..... ضرورت سے زیادہ لاڈ.....''

رومیصہ نے گہری سانس لی۔ ''تمہارا مشاہدہ اس معاملے میں خاصا سطحی ہے۔ اس سلسلے میں پھر کبھی تفصیلی گفتگو کریں گے۔ ابھی تو مجھے اس فیچر کے لئے بہت سا ریسرچ ورک کرنا ہے۔ یہ ان بچوں کے بارے میں ہے جنہیں یتیم خانوں سے ایڈاپٹ کیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک ہی ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں، جنہیں ایک بھری پُری فیملی کا سکھ مل پاتا

ہے، ورنہ بڑے بڑے دعوؤں کے ساتھ گود لئے بچوں کا کیا حال ہوتا ہے، وہی فرخندہ لودھی نے دکھانا چاہا ہے۔ یتیم خانے والے بھی پلٹ کے نہیں پوچھتے۔ میں فرخندہ کے ساتھ مل کے آج کل یہی ریسرچ کر رہی ہوں۔ اس کی این جی او نے کئی اہم یتیم خانوں سے پچھلے کئی سالوں میں گود لئے جانے والے بچوں کے بارے میں معلوم کرایا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان درجنوں بچوں میں سے گنتی کے دو چار ہی اطمینان بخش حال میں ہیں۔ بے اولادی کی وجہ سے جن جوڑوں نے ان یتیم بچوں سے اپنی محرومی دور کرنا چاہی، ان میں سے کئی ایک کے اپنی اولاد ہوگئی اور انہیں اپنی یہ جلد بازی کھٹکنے لگی۔ جگر کا گوشہ بنا کے لے جانے والے وہ لوگ اب ان کو اپنے بچے اٹھانے اور کھلانے والا ملازم بنائے ہوئے ہیں۔ کئی خود تو ذہنی طور پہ تیار ہو کے بچہ ایڈاپٹ کر بیٹھے مگر اپنی فیملی کو اعتماد میں نہ لے سکے۔ ایسا زیادہ تر جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہنے والے جوڑوں کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کے گود لئے بچوں کو ماں باپ تو مل گئے لیکن دادا دادی، نانا نانی، خالہ، پھوپھی بننے پر کوئی تیار نہیں۔ یہ بچے احساسِ کمتری کا شکار ہو چکے ہیں۔ ایک فیملی میں پرورش پانے کے بعد ان میں جو اعتماد ہونا چاہئے تھا، ان کی ذہنی نشوونما جس طرح ہونا چاہئے تھی، وہ بھی مفقود ہے۔ صبح شام انہیں اس گھر میں رہنے والوں کی تحقیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بہت سے کیسز میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچہ گود لینے کی کوئی ٹھوس وجہ نہ ہونے کے باوجود متمول خاندان ایسا کرتے ہیں اور بدلے میں لوگوں کی واہ واہ بھی سمیٹتے ہیں کہ وہ کسی یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھ رہے ہیں جب کہ حقیقتاً وہ گھر میں ''غلاموں'' اور ''کنیزوں'' کا ڈھیر لگا رہے ہوتے ہیں۔''

''تو کیا فرخندہ لودھی کے ریسرچ کرنے اور تمہارے فیچر چھاپنے سے یہ سب رک جائے گا؟''

''تم جو سیاستدانوں کے بخیے ادھیڑتے ہو، کیا ایسا کرنے سے وہ سدھر جائیں گے؟ نہیں..... پھر بھی تم ایسا کرتے ہو، صرف عوام کو باشعور بنانے کے لئے تاکہ وہ اپنا برا بھلا سمجھ سکیں۔ یہ جان پائیں کہ کھوکھلے دعوے کرنے والے اور صحیح معنوں میں قوم کے لئے مخلص سیاست دانوں میں کیا فرق ہے۔ یہی مقصد فرخندہ کا بھی ہے، لیکن تم ٹھہرے سیاسی قسم کے صحافی..... ایوانِ بالا کی ریشہ دوانیوں تک تو تمہاری نظر کی رسائی ہے مگر ایک عام شخص کی عام سی زندگی کے اور بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔

=======☆=======☆

''یہ کیسا کارڈ ہے؟''

رومیصہ نے گھر پہنچتے ہی اپنے بیگ سے شادی کا کارڈ نکال کر مسز نیلوفر شار کو پکڑایا تو وہ پوچھنے لگیں۔ ساتھ ہی دراز سے چشمہ بھی نکال لیا۔

''حق نواز کے بڑے بھائی کی شادی ہے، ساری فیملی کا انوی ٹیشن ہے۔''

''اچھا..... اچھا.....'' وہ سر ہلانے لگیں۔ ساتھ ساتھ کارڈ کا بھی بغور مطالعہ ہو رہا تھا۔

''مہندی تو آج ہی ہے..... میری طبیعت تو ٹھیک نہیں۔ اگر سنیعہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو پوچھ لو اس سے۔''

''میں کہیں نہیں جا رہی۔'' اس نے جوگرز اتارے اور کسلمندی سے ان کے بیڈ پہ ہی آڑی ترچھی لیٹ گئی۔

''کیوں؟ میری فکر مت کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں جانا چاہئے۔ حق نواز کو برا لگے گا۔ وہ ہر ضرورت کے وقت بن بلائے سب سے پہلے پہنچتا ہے۔''

''نہیں برا لگے گا، میں اسے بتا چکی ہوں۔ ویسے بھی میں نے صرف آج جانے سے انکار کیا ہے۔ مہندی وغیرہ کے فنکشن ایک تو بہت رات تک چلتے ہیں، دوسرے فضول کا شور شرابا۔ اتنی تھکن کے بعد کہاں دل چاہتا ہے ممی!''

''لڑکیاں تو ایسے فنکشنز میں جانے کے لئے ساری تھکن بھول جاتی ہیں۔ تم نے ہی کام اور بے دلی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ بیٹا! اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح رہا کرو۔ ضروری نہیں کہ جاب کرنے والی لڑکی مشین ہی بن جائے۔ میں خود شادی سے پہلے سے پریکٹیکل لائف میں ہوں۔ اپنی خالہ کو دیکھو، بینک کی جاب کرتی ہیں، مجھ سے دس سال ہی چھوٹی ہے لیکن اس ٹیپ ٹاپ سے رہتی ہے جیسے تم سے چار پانچ سال بڑی ہو۔ ایک تم ہو کہ اپنا خیال رکھتی ہو نہ اپنی ڈریسنگ کا۔ کہیں آنے جانے کی عادت ڈالو، دوست بناؤ تو تمہیں اوڑھنے پہننے کا شوق بھی ہو۔''

''ہے نا شوق..... بہت ہے۔ اب اس کا کیا کیجئے کہ خاصی بدذوق ہوں۔ ہمیشہ تو آپ میری شاپنگ میں سو سو کیڑے نکالتی ہیں۔ کبھی آپ کو کلرز ڈل لگتے ہیں، کبھی اسٹائل آؤٹ آف ڈیٹ..... بدل ہو کے میں نے تو بننا سنورنا ہی چھوڑ دیا۔'' وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے سارا الزام ان پہ رکھ رہی تھی۔

''بہت خوب..... یوں باتیں بنا کے موضوع نہ بدلو۔ میں کہہ رہی ہوں، اچھا سا سوٹ نکالو، تیار ہو جاؤ اور مہندی کے فنکشن میں ضرور جاؤ۔''

رومیصہ..... میری جان..... خوش رہا کرو تاکہ میں بھی خوش رہوں۔ تمہیں عام لڑکیوں

سے مختلف زندگی گزارتے دیکھ کے مجھے اپنا آپ مجرم لگتا ہے جیسے....."

"پلیز ممی! اس میں گلٹ کی کیا بات ہے۔ اپنی اپنی عادت ہوتی ہے۔ مجھے زیادہ شور شرابا پسند نہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں خوش نہیں ہوں۔ کیا آپ کو اپنی خوشی کا یقین دلانے کے لئے ضروری ہے کہ میں شارٹ شرٹس کے ساتھ دھوتی شلواریں یا پٹیالہ شلواریں پہنوں۔ ہفتے میں دو چار مرتبہ بیوٹی پارلر جاؤں۔ بالوں میں اسٹریکنگ کرواؤں، ڈارک کلر کی لپ اسٹک لگاؤں، کانوں میں کندھوں تک آئے ایئر رنگز پہنوں۔"

"اسٹوپڈ۔" مسز نیلوفر شار کے لبوں پہ مسکراہٹ ریگ گئی۔

"اور رہا مہندی کے فنکشن میں شرکت کا سوال تو ممی..... میں بور ہو جاؤں گی وہاں..... کسی سے خاص علیک سلیک بھی تو نہیں۔"

"تو کرو....." انہوں نے مشورہ دیا۔ "حق نواز کی فیملی سے تمہیں اپنے ٹرمز بڑھانے چاہئیں۔" انہوں نے وہ بات کی جو پہلے بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں کئی بار کہہ چکی تھیں۔

"آپ کو پتہ ہے کہ جن لوگوں سے میرا مزاج نہ ملتا ہو، میں ان سے زیادہ گھلتی ملتی نہیں ہوں۔ حق نواز سے دوستی کا مطلب یہ نہیں کہ اس کی ساری فیملی سے میری فریکوئنسی ملتی ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کے لئے "ایلین" ہوں۔"

"کیا..... حق نواز اور تمہاری دوستی..... صرف دوستی ہے؟" پہلی بار انہوں نے کھل کے یہ سوال کیا جو انہیں اکثر تنگ کرتا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" وہ اٹھ کے بیٹھ گئی اور ان کی سائیڈ ٹیبل پہ پڑا ریکارڈ کا چارٹ اٹھا کے دیکھنے لگی۔

"تم میری بیٹی ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کے باوجود میں حتمی طور پہ تمہارے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی، البتہ حق نواز کے ہر انداز سے مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔"

"پاگل ہے وہ۔" رومیصہ نے سر جھٹکا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میرا اندازہ غلط نہیں۔ پاگل ہی ہوگا جو پتھر سے سر پھوڑ رہا ہے۔" مسز نثار نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

"اس نے کبھی کچھ کہا تم سے؟"

"کئی بار، لیکن اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔" اس نے شانے اچکائے اور مسز نیلوفر اس بار چڑ گئیں۔

"ہاں، اس کے کہنے سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ تم پہ تو ماں کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ بے چارہ کس گنتی میں۔"

"اوہو ممی..... کیوں بیکار کی ٹینشن لے رہی ہیں آپ۔ اب یہ کوئی مسئلہ ہے جس پہ آپ سر کھپا رہی ہیں۔ دو دن سے بی پی نارمل ہے، جو آپ سے برداشت نہیں ہو رہا۔"

"بیکار کی ٹینشن! تم میری بیٹی ہو، تمہاری عمر شادی کی ہے۔ کیا مجھے ٹینشن نہیں لینی چاہئے۔ بے چارہ حق نواز..... اتنا بھلا لڑکا....."

"اچھا بابا..... چلی جاتی ہوں میں اس بے چارے بھلے لڑکے کے بھائی کی مہندی پہ..... آپ کہیں تو لہنگا چولی پہن کے، بالوں میں پراندہ اور کانوں میں جھمکے بھی ڈال لوں؟" اس نے بحث سے جان چھڑانا چاہی۔

"تمہیں اس طرح دیکھنے کا ارمان تو ہے مگر تمہاری اپنی شادی پر۔" انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کے اس کی پیشانی چومی۔

"مگر میں اکیلی جاؤں گی اور اس شرط پہ کہ دیر ہونے پر آپ پریشان نہیں ہوں گی۔ سنیعہ آپ کے پاس گھر رہے گی۔ میں آپ کو رات کے وقت اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں پندرہ پندرہ منٹ بعد فون ضرور کرتی رہوں گی۔ پرامس۔" وہ تیار ہونے اٹھ گئی۔

گھر آنے تک اس کا کوئی ارادہ نہ تھا مہندی میں شرکت کرنے کا لیکن ماں سے گفتگو نے کچھ اس رخ پہ پلٹا کھایا کہ وہ مزید نصیحتوں اور ہدایتوں سے بچنے کے لئے جانے پہ تیار ہوگئی۔

☆======☆======☆

حمیرا اور زیتون خوش گپیاں لگاتی، ہنستی ٹھٹھول کرتی بازار سے واپس آ رہی تھیں۔ آج چونکہ دیناں ساتھ نہیں تھی، اس لئے زیتون، حمیرا کے کہنے پہ اسے گھر تک چھوڑنے آ رہی تھی۔ وہ دونوں آگے آگے تھیں اور ان سے ایک قدم پیچھے بیلی اور نگی تھیں۔ نگی زیتون کی چھوٹی بہن تھی جو بیلی کی تقریباً ہم عمر تھی۔

"حمیرا! یہ جو تیری گلی کے نکڑ پہ دکان ہے، اس پہ کتنا بونگا سا آدمی بیٹھتا ہے۔ اس دن تیرے گھر سے واپسی پہ میں نگی کے لئے ٹافی لینے رکی تو دیکھا تھا..... توبہ، سڑیل..... کو جاؤ" زیتون نے اپنی کوکے والی موٹی سی ناک چڑھائی۔

"دفع کر۔ یہ محلہ ہی کوجے (بدصورت) لوگوں کا ہے۔ ذرا کوئی ڈھنگ کی شکل نہیں، سوائے میرے آصف کے۔" وہ اترائی۔ اس کی پھوپھی بانو بھی اسی محلے میں رہتی تھی، اسی

لئے تو آصف کا روز روز کا آنا جانا تھا۔

''ہائے نہیں باجی!'' بلی نے مڑ کے بہن سے کہا۔

''صادق بھائی جان کے ایک کزن ہیں بڑے اسمارٹ سے، وہ آج کل دکان پہ ہوتے ہیں۔''

''ابھی صبح زیتون کے گھر سے نکلتے ہوئے تو میں نے دیکھا تھا۔ صادق کا بڈھا ابا بیٹھا کھانس رہا تھا۔''

''اچھا..... کل جب میں بیسن لینے آئی تھی، تب تو وہی تھے۔ بڑا ہنس کے بات کی۔ ایک چیونگم بھی دی۔''

''چل حمیرا! ذرا دیکھیں تو سہی، کیا پتہ ہمیں بھی ایک ایک چیونگم مل جائے۔'' زیتون نے آنکھ ماری۔ وہ خاصی دل پھینک تھی۔

''ارے واہ، دیدہ دلیری تو دیکھو۔ اب دن دیہاڑے ڈاکے پڑنے لگے۔'' زیتون نے دکان پہ پہنچتے ہی آنکھیں مٹکا کے کہا۔

''جی، کیا مطلب؟'' اسی دن والے لڑکے نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ تو صادق بھائی صاحب کی دکان ہے، آپ جناب یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

''ڈاکا ڈالنے والے سب کچھ سمیٹ کے چلتے بنتے ہیں مس! جائے وقوعہ پہ بیٹھ کے مطالعہ نہیں فرماتے۔'' اس نے رسالہ لہرا کے دکھایا۔ زیتون کی سمجھ میں اس کی گاڑھی اردو نہ آئی۔ وہ چٹی اَن پڑھ تھی جب کہ حمیرا جو پانچ چھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی، مسکرا دی۔ شکل و صورت سے وہ کوئی حور پری نہ تھی لیکن زیتون کی نسبت بہتر تھی۔ اچھا پہن اوڑھ کے اور بھی اچھی لگتی۔ بساط بھر میک اَپ اور ہار سنگھار زیتون نے بھی کر رکھا تھا لیکن حمیرا کے کانوں کی سونے کی بالیاں، قیمتی ریشمی جوڑا، ہیل والی جوتی اور کلائی پہ بندھی کوہیت سے آئی گھڑی اسے آسودہ خاندان کا ظاہر کر رہی تھی۔ اس چیز نے بھی اس لڑکے کو مجبور کر دیا کہ وہ زیتون کے بجائے دوسری لڑکی میں دلچسپی لے۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں مس؟''

''ہم میں سے کوئی استانی نہیں ہے جو مس مس کر رہے ہو۔'' زیتون نے اپنی سمجھ کا مظاہرہ کیا۔ حمیرا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''بہت خوبصورت ہنسی ہے آپ کی۔''

چھوٹا سا شہر تھا، متوسط لوگوں کا محلہ..... وہ لڑکا اگر کچھ بے باک ہو رہا تھا تو اس کی وجہ

ان شوخ لڑکیوں کی جانب سے ملی ہوئی شہ تھی۔ جب انہیں کوئی تکلف نہیں تھا تو وہ کیوں شرافت کا مظاہرہ کرتا۔ اس کی نظریں بے باکی سے ان بنی سنوری لڑکیوں کے سراپے اور چہروں پہ پھسل رہی تھیں۔

''مسز کہہ لوں؟'' اس سوال پہ حمیرا کی ہنسی اور بھی ''نکھر'' گئی۔

''آپ کی ہنسی کہہ رہی ہے کہ آپ کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں۔''

''زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں، سمجھے۔'' اس نے بڑے ناز سے بھنویں اچکائیں۔

''امید تو رکھ سکتا ہوں۔''

''اس پہ پابندی نہیں۔ میرا کیا جاتا ہے۔''

''میرا تو پانچ منٹ میں ہی بہت کچھ چلا گیا۔''

''لو جی، اِدھر تو ڈائیلاگ شروع ہو گئے۔ اب گانا مت گانے بیٹھ جانا۔'' زیتون کے لہجے سے رشک اور حسد دونوں چھلک رہے تھے۔ حمیرا ہمیشہ اس کو سائیڈ پہ کر دیا کرتی تھی۔ اس کو جلتے دیکھ کر حمیرا کو اور مزہ آیا۔ وہ اس چھیڑ چھاڑ کو طول دینے لگی۔ لڑکے نے دونوں کو ٹھنڈی بوتلیں بھی کھول کے دیں۔ بچیوں کو لالی پاپ اور چپس کے پیکٹ پکڑائے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ گلی کے اندر عورتوں کا آنا جانا اس وقت پھر بھی لگا رہتا تھا۔ چاہے دن کے اور کسی وقت میں کم ہی سہی لیکن گلی کی نکڑ پہ بنی اس دکان جس کے شنر سڑک کی جانب کھلتے تھے۔ گلی سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ سڑک پہ سے کبھی کوئی اکا دکا ویگن، رکشہ یا سائیکل والا گزر جاتا۔

لڑکا خاصا چرب زبان تھا اور پڑھا لکھا بھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ابھی ایف اے کا امتحان دے کر یہاں اپنی خالہ کے ہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہے، اسی لئے اس کا اندازِ گفتگو اور پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ یہاں کے گنوار لڑکوں سے بہت بہتر تھا۔ کچھ اس لئے بھی اور کچھ زیتون کے سامنے شیخی بگھارنے کے لئے، حمیرا مسلسل اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ اس کی تعریفوں پہ شرماتی اور مسکراتی۔ اس کے شوخ جملوں کے بے تکلفانہ جواب دیتی رہی۔

''یہ لڑکے اِدھر ہی آ رہے ہیں۔ چل حمیرا!'' زیتون نے اسے متوجہ کیا۔

''میرے دوست ہیں، ٹھہرا کیوں رہی ہیں۔'' لڑکے کو اپنے یاروں کے سامنے شو مارنے کا موقع ملا تھا، وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتا، اس لئے روک لیا۔ ان پہ رعب جمانا چاہتا تھا کہ ان کے شہر اور ان کے محلے آنے کے دو دن بعد ہی وہ ایک لڑکی پھنسا چکا ہے۔ حمیرا ٹھہرا کے اسی وقت پلٹ جانا چاہتی تھی کیونکہ ان میں سے دو لڑکے اسی کی گلی کے تھے۔

''ابھی جانے دو..... وعدہ رہا کل پھر آؤں گی۔''

"میں انتظار کروں گا، قسم کھاؤ میری کہ ضرور آؤ گی۔" محض بیس منٹ کی ملاقات میں نوبت قسموں وعدوں تک آ گئی تھی۔

"تمہاری قسم۔" اس نے اس فلمی انداز میں کہا کہ وہ لڑکا بے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ بیٹھا۔

"آصف بھائی جان..... باجی! وہ دیکھو۔" بلی کی آواز پہ وہ کرنٹ کھا کے پلٹی۔

آصف اپنی سائیکل پہ سوار ان سے چند گز کے فاصلے پہ تھا۔ اس کی گھورتی نظروں سے وہ اس طرح خوفزدہ ہوئی کہ اور کچھ نہ سوجھا تو جو ہاتھ اس لڑکے نے تھام رکھا تھا، وہی ایک جھٹکے سے کھینچ کے اس کے چہرے پہ زور سے دے مارا۔ مقصد صرف آصف پہ یہ ظاہر کرنا تھا کہ چھیڑ چھاڑ اس لڑکے کی جانب سے ہوئی تھی۔

لڑکا جو نئی نئی محبت کے خمار میں ڈوبا، ایک لڑکی کا ہاتھ تھامے نہ جانے کن جہانوں کی سیر کر رہا تھا، تھپڑ کھا کے پہلے تو ہڑبڑا کے رہ گیا۔ اس نے بے یقینی سے اس لڑکی کو دیکھا جو تقریباً آدھے گھنٹے سے اس کے ساتھ تفریح کر رہی تھی اور اب چہرے پہ غضب ناک تاثرات لئے اسے گالیاں دے رہی تھی۔ دو قدم کے فاصلے پہ کھڑے اس کے دوست اس کی بے عزتی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

آصف بھی سائیکل کھڑی کر کے آگے بڑھا۔ اس کے ارادے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ حمیرا کے اشارہ کرنے پہ زنجون نے اسے آگے جانے سے روکا۔

"جانے دو بھائی جان! ایسے ہی کوئی لفنگا ہے۔ حمیرا نے اچھا سبق سکھایا ہے۔ آپ جاؤ گے تو بات بڑھے گی۔ ایویں بے چاری کی بدنامی ہو گی۔"

"تو کیا میں بے غیرتوں کی طرح چپ چاپ واپس چلا جاؤں۔"

"اسی میں عقل مندی ہے۔" حمیرا نے بھی آہستہ آواز میں کہا۔ "اگر میرا بھائی یا چاچا مامالڑتا تو اور بات تھی۔ تم منگیتر ہو۔ لوگ یہی کہیں گے، اس لڑکی کے پیچھے دو لڑکے مارا ماری کر رہے تھے۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

آصف انہیں لے کر گلی میں گھس گیا۔ دوسری جانب وہ لڑکا ابھی تک گال پہ ہاتھ رکھے سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ آصف وغیرہ کے جاتے ہی اس کے دوست جو لڑائی جھگڑے کا خطرہ محسوس کر کے دور کھڑے تھے لپک کے اس کے پاس آئے۔

"یہ کیا تماشا تھا؟ اوئے تجھے کیا ضرورت تھی اس کا ہاتھ پکڑنے کی۔ اپنے آپ کو سچ مچ کا ہیرو سمجھ بیٹھا تھا۔" یہ تبصرہ اس دوست کا تھا جس نے اسے کسی ترنگ میں ہیرو کا خطاب دیا

تھا اور اب سب ہی اسے ہیرو پکارنے لگے تھے۔ ویسے تو وہ صادق کی خالہ کا بیٹا تھا لیکن صادق اور اس کے چھوٹے بھائی سے اس کی زیادہ دوستی نہ تھی۔ شاید عمر اور مزاج کا فرق آڑے آتا ہو۔ وہ چونکہ دوستانہ فطرت کا تھا، اس لئے آتے ہی اس محلے میں ڈھیر سارے دوست بنا لئے جو اسی کی طرح کے تھے۔

"بڑی فتنہ لڑکی ہے۔" سکتے سے باہر آتے ہی وہ اس لڑکی کو بھلا برا کہنے لگا۔ "میں تو سمجھ رہا تھا یہاں کی لڑکیوں میں اتنی چالاکی نہیں ہو گی لیکن یہ چھوٹے شہر کی عام سی لڑکی تو بہت تیز نکلی۔ پہلے خود فری ہوتی رہی، لفٹ دیتی رہی، ملنے ملانے کے وعدے بھی کر لئے اور جب بھائی کی شکل دیکھی تو تھپڑ مار کے چلتی بنی۔"

"وہ اس کا بھائی نہیں، منگیتر ہے اور بھائی کو بھی کم نہ سمجھنا۔ زیادہ نہ پھینک۔ ملنے کے وعدے..... اوہو....." دوست نے مذاق اُڑایا جو یہاں کا سب سے اوباش لڑکا تھا۔ اصل نام تو نہ جانے کیا تھا، سب "ٹلی" کے نام سے پکارتے تھے۔

"لڑکی سے مار کھا کے اب جھوٹی کہانیاں سنا رہا ہے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مکار لڑکیاں بوتلیں بھی پی گئیں۔ دوبارہ ہاتھ آئی تو چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے منہ پہ ہاتھ پھیر کے قسم کھائی۔

"اچھا چھوڑو، مٹی پاؤ یار! ہیرو..... آج شام کا کیا پروگرام ہے۔" ٹلی نے سگریٹ سلگائی۔

"پہلے تو ایک کش مجھے لگانے دے، میٹر ڈاؤن ہو رہا ہے۔"

"نہ ہیرو! پھر نہ کہنا کہ بتایا نہیں، اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ سادہ سگریٹ نہیں، اس میں پریاں بھری ہیں۔"

"پریاں.....؟ ہیروئن پیتے ہو تم؟"

"اوئیں یار! وہ گندہ نشہ ہے۔ بندہ کسی جوگا نہیں رہتا۔ یہ تو چرس ہے، بڑی ہلکی چیز۔ ذرا سرور ہی سرور..... بالکل شراب کی طرح..... یعنی نشہ تو ہے بے ہوشی نہیں۔ اس کا کش لگانے سے اندر باہر پریاں ناچنے لگتی ہیں۔"

"ہیرو کی آنکھوں کے آگے تو اس وقت ستارے ناچ رہے ہیں۔" ایک یار نے مذاق اُڑایا۔ اس نے غصے کے مارے ٹلی کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لی۔

دھوئیں کے مرغولے بناتا وہ اب تک ذہن میں اس لڑکی کو مزہ چکھانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

☆======☆======☆

آج ان لوگوں نے لڑکی والوں کے ہاں مہندی لے کر جانا تھا۔ تیاریاں عروج پہ تھیں۔

"فوزی! یہ تمہاری نند کیا پہن کے آگئی ہے۔" شاہ نواز نے بہن کو روک کے پوچھا۔

"لہنگا..... وہی جو میں نے پہنا ہے۔" اس نے اپنے لباس کی جانب اشارہ کیا۔ وہ دونوں بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور کچھ عرصہ قبل ہی اس کی شادی ہوئی تھی، اس لئے خوب ارمان نکال رہی تھی۔ ابھی بھی اپنا عروسی میرون بھاری کام والا لہنگا پہنے ہوئے تھی۔

"اور آج تو زیادہ تر لڑکیوں نے لہنگے ہی پہنے ہیں۔" اس نے اپنی چھوٹی سی بچی کی پونیاں بناتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر اس کا حلیہ تو دیکھو، اتنی چھوٹی قمیص اور دوپٹہ بھی نہیں لیا۔"

"بچی ہی تو ہے بھائی جان!" فوزیہ کو برا لگا لیکن وہ ظاہر کئے بغیر بولی۔ شادی سے پہلے وہ بھائی کی بے جا روک ٹوک کا شکار تھی لیکن اب سسرال میں ماحول دوستانہ اور کھلا ڈلا تھا۔ اب اسے اپنے بھائی کی بے جا تنقید چبھتی تھی۔ اپنی بارہ تیرہ سالہ نند کے بارے میں ان کا تبصرہ اسے اچھا نہ لگا۔

"بچی ہے تو کیا بے لگام چھوڑ دیا جاتا ہے۔" وہ تیوری چڑھا کے پوچھنے لگا۔

"پتہ نہیں امی نے کیا سوچ کے تمہارا رشتہ یہاں طے کر دیا۔ عجیب آزاد خیال اور بگڑے ہوئے لوگ ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ ان کی صحبت میں تم بھی بگڑ نہ جاؤ۔ برقع تو چھوڑ دیا ہے، بال بھی کٹوا لئے ہیں، اب دیکھو اور کیا ہونا باقی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس بچی کو اس ماحول سے ابھی سے بچا کے رکھنا۔ اس کی تربیت پہ برا اثر پڑے گا۔"

"پلیز بھائی جان!" وہ گھبرا گئی۔ اس کا سارا سسرال یہاں موجود تھا۔ شوہر بھی کہیں آس پاس تھا۔ اگر کسی کے کانوں میں بھنک پڑ جاتی تو اس کے لئے صورتِ حال خطرناک ہو سکتی تھی۔

"تمہارے چہرے پہ بارہ کیوں بجے ہیں۔" حق نواز کیمرہ لینے اندر آیا تو فوزیہ کو آف موڈ کے ساتھ بیٹھا دیکھ کے پوچھا۔

"ہمارے بہنوئی صاحب سے جھڑپ ہو گئی ہے کیا؟"

"شکر ہے ان کا دماغ نہیں پھرا ہوا جو شادی والے گھر میں ایسی حرکتیں کرتے پھریں۔" حق نواز بھی اس سے بڑا تھا لیکن شاہ نواز کی نسبت وہ اس سے بے تکلف تھی اور دل کی باتیں بھی کہہ لیا کرتی۔

"قسمت تو اس بے چاری کی خراب ہو گی جو کل اس گھر میں دلہن بن کے آئے گی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو، امی نے سنا تو فوراً شگونی کا فتویٰ صادر کر دیں گی۔"

"بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ ہر بات میں اعتراض، ہر چیز میں خرابی ڈھونڈ لیتے ہیں بھائی جان! چلو اپنی بہن کی حد تک تو ٹھیک ہے، اب کسی غیر پہ اپنے اعتراضات ٹھونسنے کی کیا تک ہے۔ زیبا اپنی بہن کے بارے میں بہت حساس ہیں۔ انہوں نے ان کے خیالات سن لئے تو بہت مائنڈ کریں گے۔ ان کے نزدیک تو ان کی بہن اب تک بچی ہے۔ بھائی جان کی طرح نہیں، جنہوں نے مجھے بچپن میں بھی کبھی دوست کے گھر جانے دیا نہ خود کہیں تفریح کے لئے لے کر گئے۔ ایسے حالات میں، میں ان کی ہونے والی بیوی پہ ترس نہ کھاؤں تو اور کیا کروں۔ کیا بنے گا بے چاری کا۔"

"فکر مت کرو، میرا مشاہدہ کہتا ہے کہ ایسے مرد ٹھیک ٹھاک قسم کے زن مرید ثابت ہوتے ہیں اور یہ جو تم اپنی بھابی کے لئے اتنی ہمدردی دکھا رہی ہو، تب جل کر دہائیاں دے رہی ہو گی۔"

"جی نہیں، میں اس قسم کی نند ثابت نہیں ہوں گی۔"

"تم لوگ اس وقت کون سی باتیں چھیڑے بیٹھے ہو۔" ان کی امی تیزی سے اندر داخل ہوئیں۔ عجلت ان کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔

"مہندی لے کر نکلنا نہیں ہے کیا؟ شاہ نواز ویگن میں سب لڑکیوں اور عورتوں کو بٹھا رہا ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جانا۔ جلدی کرو۔"

"ویگن..... وہی سیاہ شیشوں والی بڑی سی ویگن جو بھائی جان کے دوست کی ہے؟" فوزیہ نے کھڑے ہو کر دوپٹہ سنبھالا۔ "ان کا بس چلے تو فوج کی بکتر بند گاڑیوں میں ہم عورتوں کو لے جائیں تاکہ کسی کی نظر نہ پڑے۔"

شاہ نواز اگرچہ اس وقت ساتھ نہیں جا رہا تھا مگر کچھ دیر بعد اپنے والد اور تایا کے ساتھ وہیں پہنچنے والا تھا کیونکہ مہندی کی رسم ادا ہونے کے بعد نکاح کیا جانا تھا۔ یہ ان کے ہاں کا رواج تھا۔ شادی سے کچھ روز قبل یا پھر مہندی والی رات کو ہی نکاح کا فرض ادا کر دیا جاتا تھا۔

"ہیلو....." گاڑی میں بیٹھتے ہوئے حق نواز نے سیل فون پہ چہکتے رومیصہ کے نام کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کانوں سے لگایا۔ وہ یوں کم ہی فون کیا کرتی تھی، اس لئے اس کا پہلا خیال اس کی ممی کی جانب ہی گیا کہ کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔

''رسم شروع ہوگئی ہے کیا؟'' دوسری جانب سے بالکل خلافِ توقع سوال کیا گیا۔

''ابھی کہاں، ابھی تو روانگی ہو رہی ہے۔''

''وہاں کا جوائیڈر لیس کارڈ لیس درج ہے، مہندی وہیں ہو رہی ہے یا کسی ہال میں؟''

''وہیں۔'' اس نے ماں کی موجودگی کی وجہ سے مختصر جواب دیا۔ البتہ لبوں پہ آتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں یکا یک پیدا ہوتی چمک نے ان کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ان کی ناگواری بھی ظاہر کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہی ہوں لیکن زیادہ دیر رکوں گی نہیں۔ سنیعہ کو ممی کے پاس چھوڑا ہے اور رات کو زیادہ دیر ہوگئی تو اکیلے ڈرائیو کر کے جانا مشکل ہوگا۔''

''او کے۔'' اس سے زیادہ وہ کچھ کہہ نہ سکا، ورنہ اسے اکیلے آنے سے روکنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا رومیصہ بہت بااعتماد ہے، اس کے گھر کا راستہ بھی خاصا بارونق ہے۔ رات کے آخری پہر تک وہاں ٹریفک رواں دواں رہتی ہے اور یہ بھی کہ اپنے پیشہ وارانہ فرائض ادا کرنے کے لئے بسا اوقات وہ اس سے بھی زیادہ رات تک اکیلی ڈرائیو کرتی ہے لیکن یہاں اس کا اکیلا آنا اس کی امی کو مزید معترض ہونے کا موقع فراہم کر سکتا تھا۔

''کس کا فون تھا؟'' وہ جانتا تھا کہ امی یہ سوال ضرور کریں گی، اس لئے جواب بھی پہلے سے تیار تھا۔

''ایک دوست کا۔'' یہ جواب کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

''کون سی دوست کا؟'' انہوں نے لفظ ''کون سی'' کو خاصا چبا چبا کر اور معنی خیز بناتے ہوئے کہا۔ حق نواز گڑبڑا کے رہ گیا۔ کوئی جواب نہ دیتے ہوئے اس نے ڈیک میں لگے گیت کا والیم تیز کر دیا۔

☆======☆======☆

چھوڑ کے گھر سنسان سہاگن
لوٹ چلی مہمان سہاگن
دہلیزوں کے کھیل نرالے
ہر بابل کے دیکھے بھالے
سو سو وہم گمان سہاگن
لوٹ چلی مہمان سہاگن

''سویرا! انکل جی آئے ہیں۔'' بینش کی آواز پہ وہ کسی گہرے خیال سے چونکی۔

وہی کمرہ تھا..... وہی کھڑکی..... اور وہی وہ.....

اس کا سادہ سا کمرہ جو کم سامان ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کشادہ محسوس ہوا کرتا تھا، آج کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ مہندی کے سجے تھال، مٹھائی کے ٹوکرے، ہار گجرے..... ان سب کو مہمان بچوں سے بچانے کے لئے سب سے محفوظ کمرہ یہی تھا، اس لئے ان کا ڈھیر بیڈ، صوفے اور کارپٹ پہ پڑا ہوا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پہ سر سے ذرا کھسکتا ہوا سنہرے گوٹے سے سجا سبز اور پیلا چنری کا دوپٹہ اور آگے تک کھینچ لیا۔ بینش نے حیرت سے اسے آدھے چہرے تک آنچل پھیلاتے اور قدرے ذرا سا رخ موڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے گھر کا ماحول بہت دوستانہ تھا۔ وہ اور اس کی بہنیں اپنی ماما سے زیادہ پاپا سے قریب رہی تھیں لیکن سویرا سے چار سالہ دوستی کے دوران اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے ابو سے کتراتی تھی۔ اس کا سامنا جب بھی سویرا کے ابو سے ہوا، اس نے انہیں بہت مشفق اور نرم خو پایا پھر پتہ نہیں کیا وجہ تھی جو وہ ان کا سامنا ہونے پر گھبرا جاتی تھی۔ بینش نے اس کے ابو کو بھی کبھی اپنی بیٹی سے رسمی یا ضرورت کے چند فقرے کہنے کے علاوہ کوئی دوسری بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ آج شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے اس کے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ کم از کم بینش کی موجودگی میں تو پہلی بار۔

سویرا سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھ مسل رہی تھی۔

''انکل جی! آپ کو سویرا سے کوئی بات کرنی ہے تو میں باہر چلی جاتی ہوں۔'' بینش نے انہیں کافی دیر تک بیٹی کے سامنے یوں چپ چاپ بیٹھے دیکھا تو بول پڑی۔

''نہیں۔'' ان کے ہونٹوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کے معدوم ہوگئی۔ انہوں نے نظریں اٹھا کے سویرا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ان کا ہاتھ کپکپاتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے سر پہ ٹھہر گیا۔ اس کا سر کچھ اور بھی جھک گیا۔ گود میں دھرے ہاتھوں پہ آنسوؤں کے چند قطرے گرے تھے۔

''تمہیں اللہ کی امان میں دیا۔'' کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ان کے جانے کے بعد سویرا نے اپنا سر دوبارہ کھڑکی سے ٹکا دیا۔

''انکل جی بہت اداس لگ رہے تھے۔ تمہارے جانے کا خیال تنگ کر رہا ہوگا۔''

بینش کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گالوں پہ بہتے آنسو انگلیوں سے صاف کر کے دوبارہ نیچے دیکھنے لگی۔ بینش دوبارہ سے پہناوٹی کے کپڑوں کی پیکنگ کرنے لگی۔ وہ پچھلے دو دن سے سویرا کو اس کیفیت میں دیکھ رہی تھی۔

لاکھ جتن کر دیکھے پورے
رہ جانے تھے رہے ادھورے
اماں کے ارمان، سہاگن
لوٹ چلی مہمان سہاگن

''اس کے ابا آئے تھے یہاں؟''
سویرا کی امی نے اندر داخل ہوتے ہوئے بینش سے پوچھا۔
''جی، سویرا سے ملنے آئے تھے۔''
بینش کی بات پہ انہوں نے غور سے اپنی بیٹی کا چہرہ پڑھنا چاہا جو ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

''بینش! یہ سرخ دوپٹہ اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا، کہیں کسی کو اِدھر اُدھر تھما کے بھول نہ جانا، تمہاری ذمہ داری ہے۔ مہندی کی رسم کے بعد کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے جیسے ہی لڑکا یہاں پہنچے گا، نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ اس وقت اس پیلے جوڑے پہ یہی سرخ دوپٹہ اوڑھایا جائے گا۔ یہ بڑا برکتوں والا دوپٹہ ہے، میں اس پہ بڑے پیر جی سے دم کروا کے لائی تھی، ان شاء اللہ نکاح بھی ساتھ خیریت سے ہوگا اور آگے بھی کوئی بڑی بلا آس پاس نہ پھٹکے گی۔''

''بہت بھاری دوپٹہ ہے آنٹی! میں ایسا کرتی ہوں الماری میں رکھ دیتی ہوں۔''
''چلو، ایسا کرلو۔ ویسے بھی نکاح کے وقت اسے یہیں لایا جائے گا۔ بس یہ یاد رہے کہ نکاح کے وقت یہ سر پہ ہو۔'' وہ جاتے جاتے تاکید کر گئیں۔ بینش مڑ کے الماری میں وہ سرخ جھلملاتا دوپٹہ رکھ رہی تھی، اس لئے سویرا کے ہونٹوں پہ آئی وہ عجیب سی مسکراہٹ نہ دیکھ سکی۔
ایسی مسکراہٹ جس میں طنز کے ساتھ ساتھ ایک ہمدردی بھی تھی۔

مہمانوں کو گھر جانا ہے
اک دن چھوڑ کے در جانا ہے
رب کے پاس اماں سہاگن
لوٹ چلی مہمان سہاگن

وہ ایک بار پھر نیچے لان میں دیکھ رہی تھی، جہاں اس کے خاندان کے تقریباً سب ہی لوگ جمع تھے۔ بڑے کرسیوں پہ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لڑکیاں زرق برق ملبوسات میں اٹھلاتی۔ گانوں اور ڈانس کی پریکٹس کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ بچے

یہاں سے وہاں بھاگتے نظر آرہے تھے۔
کوئی وقت جاتا تھا، جب لڑکے والے یہاں پہنچ جاتے اور اس کے بعد کچھ گھنٹوں بعد..... وہ اسے سونپ دی جائے گی جس کی امانت تھی۔
''امانت.....؟ کیا واقعی امانت کو امانت کی طرح سونپا جا رہا ہے؟'' اس نے افسردگی سے سوچا۔

اس کی نظر گیٹ کے نزدیک کھڑے اپنے باپ کے چہرے کی جانب گئی، جہاں ایکا ایکی مسرت چھلکنے لگی تھی۔ انہوں نے دور کھڑی، کسی سے بات کرتی بیگم کو آواز دے کر اس طرف بلایا۔ شاید لڑکے والے آگئے ہوں گے۔
اتنے شور اور فاصلے کی وجہ سے سویرا ان کی آواز تو نہ سن سکی تھی مگر اسے اندازہ تھا کہ یقیناً ان کی آواز جوشِ جذبات سے کپکپا رہی ہوگی۔

''کتنے سالوں بعد میں آج ابو جی کو خوش دیکھ رہی ہوں۔ اللہ میاں جی.....! اگر ان کی یہ خوشی میری خوشیوں سے وابستہ ہے تو میری دعا ہے اللہ کہ میں ہمیشہ خوش رہوں۔'' پہلی بار اس نے اپنی آئندہ زندگی کے حوالے سے ایک خوش آئندہ دعا مانگی۔
پنکھے لگے دل کو اچانک سکون سا آگیا۔ وہ کھڑکی کے نزدیک سے اٹھ گئی اور پردہ گرا دیا۔

☆======☆======☆

''سمدھیانہ تو بہت اچھا ملا ہے عظمت بی بی! بس دعا کرو کہ لڑکی بعد میں بھی اتنی اچھی ثابت ہو، جتنی اب لگ رہی ہے۔ میں نے تو اپنی جانب سے بہت چھان پھٹک کے دلہن ڈھونڈی ہے۔ پڑھی لکھی بھی ہے اور پردہ، نماز روزے کی پابند بھی۔ خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔ آج کل کی لڑکیوں والی تیز طراری نظر نہیں آتی۔'' حق نواز کی امی تسنیم بیگم اپنی کسی عزیزہ سے بات کر رہی تھیں جو شکل وصورت سے ہی خاصی جہاندیدہ لگ رہی تھیں۔ ان کی بات سن کر بڑے مدبرانہ انداز میں مسکرائیں۔

''نظر نہیں آتی یا ہے نہیں؟ بہت فرق ہے دونوں باتوں میں تسنیم! اور یہ بات تو میں پہلے بھی کہتی تھی۔ اب بھی کہتی ہوں کہ لوگوں کو پرکھنے میں تم بالکل کوری ہو۔ جہاں اتنا وقت لگایا بہو کو ڈھونڈنے میں، وہاں کچھ عرصہ اور ٹھہر جاتی۔ میں عمرہ کر کے لوٹ ہی آتی پھر دیکھ بھال کے جانچ پرکھ کے بات طے کرتے۔ پہلے تو کوئی بات تم نے میرے مشورے کے بغیر نہیں کی تھی۔ فوزیہ کے معاملے میں بھی مجھے آگے آگے رکھا اور اب.....'' ان کے انداز میں

گلہ تھا۔

"بس مجھے ڈر تھا کہ اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ یوں بھی عظمت بی بی! اب تسنیم ایسی بیوقوف بھی نہیں رہی۔ تمہاری صحبت کا اثر ہے۔" انہوں نے اِترا کر گردن ہلائی۔

"آؤ تمہیں اپنے سدھیانے سے ملواتی ہوں۔ بہت سیدھے سادے شریف لوگ ہیں، پیسہ بھی ہے لیکن نہ اکڑ ہے نہ نخرہ۔ باپ نے بھی نظر ملا کے بات نہیں کی۔ اتنا انکسار ہے اس شخص میں۔ وہ دیکھو بھائی فضل کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا ہے، سفید لباس میں۔"

"ہاں دیکھنے میں تو بھلا آدمی لگ رہا ہے۔ بھائی کوئی نہیں ہے لڑکی کا؟"

"نہیں، بس یہ تین بہنیں ہی ہیں۔ وہ بڑی والی ہے۔ اس کا میاں تمہارے بیٹے کے ساتھ بیٹھا ہے۔ بہت کھاتے پیتے لوگ ہیں۔"

"میاں تو اس کا عمر میں خاصا بڑا لگ رہا ہے اور یہ خود تیس پینتیس سے زیادہ کی نہیں۔ بڑی والی کے لئے یہ بڈھا کیوں ڈھونڈا ان لوگوں نے؟" عظمت بی بی کی جانب سے یہ پہلا اعتراض آیا جس کا فوری جواب تسنیم بیگم سے بن نہ پڑا۔ یہ سوال کئی بار ان کے ذہن میں بھی کلبلایا مگر وہ دبا گئیں، یہ سوچ کر کہ وہ لوگ برا نہ مان جائیں۔

"وہ دوسری والی ہے جس نے بچہ گود میں اٹھا رکھا ہے اور وہ جو اس طرف کھڑی مووی والے کو ہدایات دے رہی ہے، وہ لڑکی کی ماں ہے۔ بڑی ہنس مکھ عورت ہے۔"

"دور دور سے ہی تعارف کراؤ گی۔ بھئی ملواؤ تو سہی۔ ہم بھی تو دیکھیں، کیا سیانا پن دکھایا ہے تسنیم بیگم نے اس بار۔" ان کے تیور سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں اپنی اس عزیزہ کی فہم وفراست پہ خاص بھروسہ نہ تھا۔

"بہن! یہ عظمت بی بی..... میری چچازاد، میری سہیلی، میری بہن..... بہت سے رشتے ہیں ان سے میرے۔" انہوں نے نزدیک جا کے سویرا کی امی سے ان کا تعارف کرایا۔

"اور یہ ذکیہ بہن ہیں، ہماری ہونے والی بہن سویرا کی والدہ۔"

"ذکیہ.....!" عظمت بی بی جوان کی صورت نزدیک سے دیکھ کر ہی ٹھٹک گئی تھیں، نام سن کے چونک گئیں اور بغور ان کا چہرہ دیکھنے لگیں جیسے کچھ یاد کر رہی ہوں۔

☆======☆======☆

"اس دن تو سمجھو، آصف بھائی جان کے ہاتھوں تیرا قتل ہی ہو جانا تھا۔"

زیتون کچھ دنوں بعد ملی تو وہی بات یاد کر کے اسے ڈرانے لگی۔

"ہاں، اس دن تو شامت آتے آتے رہ گئی۔ وہ تو میرا دماغ کام کر گیا۔ مجھ پہ ذرا

شک نہیں گیا آصف کا۔ الٹا میری دھاک بیٹھ گئی کہ کیا لڑکی ہے، چھیڑنے والے کو مزہ چکھا دیا۔"

"ہاں ایسے معاملوں میں دماغ تو خوب چلتا ہے تمہارا۔ ویسے اس دن ہوا کیا تھا، اتنی شوخی کیوں ہو رہی تھی اس لڑکے کے ساتھ؟"

"پتہ نہیں کیا ہوا تھا وہ لڑکا بھی تو....." حمیرا کے لبوں پہ اس کی لچھے دار باتیں یاد کر کے مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ زیتون کے تن بدن میں اس مسکراہٹ نے آگ لگا دی۔ اسے ایسے بہت سے واقعات یاد آنے لگے۔ جب حمیرا نے اس کی اچھی بھلی شروع ہوئی لَو اسٹوری میں اپنی انٹری دے کر کہانی کا رخ اپنی جانب موڑ لیا تھا۔ حالانکہ اس کی منگنی اچھی بھلی اپنے پھوپھی زاد آصف سے طے ہوئی تھی جسے وہ پسند بھی کرتی تھی۔ ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے آگے وہ کبھی نہ بڑھتی تھی مگر زیتون کا کام ضرور خراب کر جاتی۔

"لگتا ہے تیرا دل اس لڑکے پہ آ گیا ہے۔ اس ہائی عمر والے لڑکے پہ..... سوہنا بھی رنج کے ہے۔ آصف بھائی جان تو اس کے آگے کچھ بھی نہیں۔"

"ایویں کچھ نہیں۔" حمیرا برا مان گئی۔ "کہاں آصف، کہاں یہ لوٹرا۔ وہ تو میں ایسے ہی دل لگی کر رہی تھی، ورنہ جو آصف میرے لئے ہیں، وہ کوئی اور نہیں۔ زندگی تو مجھے ان کے ساتھ ہی گزارنی ہے۔ کسی فضول سی بات کے پیچھے میں ان کو خفا نہیں کر سکتی۔"

"اچھا..... میں تو آئی تھی تجھے لینے..... ابھی آتے ہوئے میں نے اس دکان میں اسی لڑکے کو دیکھا تھا جسے سارے ہیرو، ہیرو کہتے ہیں۔ میری منت کر کے کہہ رہا تھا کہ ایک بار تجھے اس دکان پہ لے آؤں۔"

"نہ بابا....." حمیرا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "میری توبہ..... میری طرف سے صاف جواب ہے۔ دفع دور ایسی دل لگی اور ہنسی مذاق جس کی وجہ سے زندگی عذاب میں پڑ جائے، اس دن کی غلطی کے بعد اب مجھے عقل آ گئی ہے۔"

"ہونہہ، نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے اٹھی۔ صحن میں وہی معمول کی بحث جاری تھی۔ دادی کو کھانسی ہو رہی تھی اور ذکیہ، بیلی پہ چلا رہی تھی۔

"ڈھیٹ ہڈی، اٹھ جا، دادی کو میٹھی گولیاں لا دے۔ کھانسی کا شربت ختم ہوا پڑا ہے، یہاں سے تو ملنے کا نہیں۔ میرے سر میں مہندی تھپی ہے، سر دھو کے بازار نکلوں گی تو دوا لاؤں گی۔ تب تک بے چاری میٹھی گولیاں ہی چوس لے گی، ورنہ کھانس کھانس کے اس کا انجر پنجر ہل جائے گا۔"

"امی! میرا جی نہیں کر رہا گرمی میں نکلنے کو، اتنی دھوپ ہے۔ دوپہر کے بعد....."

"دوپہر کے بعد تو میں بھی دوا لے آؤں گی۔"

"اری ذکیہ! فرح سے کہہ دے۔" دادی نے کھانستے ہوئے کہا۔

"وہ سور ہا ہے اماں! اور یہ بڈ حرام ویسے تو اندر باہر کے سو چکر لگا لیتی ہے، جب میں کسی کام کا بولوں تو اسے موت آتی ہے۔ جاتی ہے یا اٹھاؤں چپل۔"

زیتون نے جلے دل کے ساتھ یہ منظر دیکھا اور بغیر کسی سے مخاطب ہوئے وہاں سے نکل گئی۔ اس کا رخ سیدھا صادق کی دکان کی جانب تھا۔

"وہ تو نہیں آرہی، نہ ہی ایسے آنے والی ہے۔ بہت تیز لڑکی ہے۔" ہیرو کے سامنے کھڑی وہ جلے دل کے ساتھ پھپھولے اڑا رہی تھی۔ اس کا دوست ٹلی بھی پاس کھڑا تھا۔

"وہ تمہارے ساتھ مذاق نہیں کر رہی تھی بلکہ مذاق اڑا رہی تھی۔ توبہ توبہ..... اتنے بڑے بول بک رہی تھی کہ میرا تو دل کانپ گیا۔ بڑا ہی نخرہ ہے اس میں۔ اگر ذرا شکل اچھی ہوتی تب پتہ نہیں کیا حال ہوتا۔ کہہ رہی تھی، اس دو ٹکے کے دکان دار کو کہنا، اپنی اوقات میں رہے۔ اس جیسے تو ہم گھر پہ ملازم بھی نہ رکھیں۔ نہ منہ نہ متھا، جن پہاڑوں تھا۔"

"خود بڑی حور پری ہے۔" ہیرو کا تو غم و غصے سے برا حال تھا، البتہ اس کے دوست ٹلی نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ نزدیک ہی اس کی چھوٹی سی دکان تھی، جہاں اس نے سنوکر ٹیبل اور دو چار اور گیمز رکھے ہوئے تھے۔ اب تو ایک وی سی آر بھی رکھ لیا تھا۔ فلموں کے شوقین اسی منی سینما گھر میں ٹکٹ خرید کے اپنا چسکہ پورا کیا کرتے۔ محلے کے چند سرکردہ افراد نے ایک آدھ بار اس منی سینما گھر کے خلاف آواز بھی اٹھائی جو یہاں کے کچے ذہنوں کو مخرب الاخلاق فلمیں دکھا کر گمراہ کر رہا تھا مگر ٹلی ہمیشہ صاف بچ نکلتا۔ بدکردار اور بدزبان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک کائیاں شخص بھی تھا۔ اب بھی اس کی باتیں جلتی پہ تیل کا کام کر رہی تھیں۔

"اچھا ہیرو ہے تُو یار! ذرا سی لونڈیا کھڑے کھڑے دس لوگوں کے سامنے بھرے بازار میں تجھے تھپڑ مار کے چلی گئی جب کہ غلطی بھی تیری نہیں تھی۔ تُو کوئی اس کے پیچھے گیا تھا چھیڑنے۔ ذرا اکڑ دیکھو۔ ٹکے ٹکے کی بات سنا گئی، یاد نہیں؟"

اس دن کا تھپڑا اسے اب تک نہیں بھولا تھا۔ ٹلی اور زیتون کی لگائی بجھائی..... وہ پوری طرح سے بھر گیا۔

"مجھے معمولی دکاندار کہا ہے اس نے؟ میں تو صادق بھائی کی بیماری کا خیال کر کے یہاں گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ جاتا ہوں، ورنہ میں اور دکانداری..... آج تو آیا ہی صرف اس کی خاطر

تھا اور اس کی یہ ہمت..... لڑکی ہے، اس لئے لحاظ کر رہا ہوں۔"

"ضرورت کیا ہے لحاظ کرنے کی، بے عزتی، بے عزتی ہے۔ چاہے کوئی بھی کرے۔ لڑکی کرے تب تو دوہری بے عزتی ہے۔ بدلہ لینا ہی مرد کی شان ہے۔" ٹلی نے اکسایا۔

"چل چھوڑ، تُو اس وقت آؤٹ ہو رہا ہے۔ دفع کر اس دکان کو۔ شوگر اور میری دکان پہ آ..... کیا گرما گرم فلم ہے اور کیا غضب کور سگریٹ ہیں۔ سواد آجائے گا۔" اس کے کہنے پہ وہ دکان بند کرنے لگا۔

"وہ دیکھ، اسی پٹاخے کی چھوٹی بہن بھلجوی۔" ٹلی نے ٹہوکا دے کر اسے متوجہ کیا۔ سامنے سنسان گلی میں سے بلی بے زاری شکل بنائے آرہی تھی۔

"اور چھ سات سالوں بعد اس نے پتہ نہیں کتنے فساد ڈالنے ہیں۔ بڑی والی سے دو ہاتھ آگے ہی ہوگی۔" اس نے زہر خند لہجے میں کہتے ہوئے سر جھٹکا اور شٹر کو تالا لگانے لگا۔

"دکان بند ہوگئی ہے؟ میں نے گولیاں لینی تھیں۔" وہ نزدیک آکے مایوسی سے بولی۔ تب دونوں دو دکانیں چھوڑ کے تیسری دکان تک جا چکے تھے جو ٹلی کی تھی۔ یہاں دوپہر کے وقت اکثر دکانیں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے بند ہو جایا کرتیں۔

"کون سی گولیاں، کچی یا پکی؟" ٹلی نے اپنے پیلے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔

"میٹھی۔"

"وہاں تو ختم ہو چکی ہیں۔ آؤ میں یہاں سے دے دیتا ہوں۔" اس نے اپنے ساتھ کھڑے دوست کو آنکھ ماری جو نہ سمجھنے کے عالم میں کھڑا اکر کٹوا سے دیکھ رہا تھا۔ بلی نے چند سیکنڈ رک کے سوچا۔ گھر واپس جاتی تو امی پچھلی گلی والے کھوکھے تک بھیج دیتی۔ ایک اور چکر..... اس سے بچنے کی خاطر وہ ٹلی کے ساتھ اس کی دکان میں چلی گئی۔

☆======☆======☆

"ذکیہ! کہیں تم بور یوالہ کے رہنے والے تو نہیں ہو؟" چند منٹ تک تو عظمت بی بی چپ چاپ کھڑی انہیں دیکھتی رہیں جیسے اپنی یادداشت کھنگال رہی ہوں پھر پورے وثوق سے سوال کیا تھا۔ ذکیہ کا رنگ فق ہو گیا۔

"نن..... نہیں..... ہم تو اِدھر ہی..... لاہور سے ہی ہیں۔" دائیں بائیں دیکھتی وہ بڑی بے چارگی سے کہہ رہی تھیں۔ اس بات پہ عظمت بی بی کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا۔

"نہیں، آج سے آٹھ دس سال پہلے تم لوگ بور یوالہ میں رہتے تھے۔"

"نہیں عظمت بی بی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" تنسیم بیگم نے مداخلت کی۔

''ان کے میاں عابد چودھری تو اِدھر کے بڑے مشہور کپڑے کے تاجر ہیں۔ شاہ عالم مارکیٹ میں ہول سیل کی دکانیں ہیں۔''

''عابد چودھری..... یہاں یہی نام تھا..... یہ تو وہی ہیں۔ پہلے یہ بوریوالہ میں رہتے تھے اور یہ عابد چودھری کویت میں ہوتا تھا۔''

''ہاں یہ تو بتایا تھا بہن نے ایک بار کہ ان کے میاں نے دس بارہ سال کویت میں لگائے ہیں۔'' تسنیم بیگم بھی چونکیں۔ ان کے خیال میں عظمت بی بی جن کی یادداشت قابلِ رشک ہے، اگر ان کی بات درست ہے تو سویرا کی امی کیوں مکر رہی ہیں۔

''ہاں اور پھر وہاں سے سب کام دھندہ چھوڑ کے یہاں بھاگے بھاگے کیوں آئے، یہ نہیں بتایا؟'' وہ چمک کے بولیں۔

''یہ وہی ذکیہ ہیں جن کو میں جانتی تھی۔ یا تو یہ مجھے بھول چکی ہیں یا بھول جانے کی اداکاری کر رہی ہیں۔ بہرحال اگر بھول رہی ہیں تو ذکیہ صاحبہ میں یاد دلا دوں کہ بوریوالہ میں جس محلے میں آپ رہا کرتی تھیں، وہیں میرے بھائی بھابی کا گھر بھی تھا۔ ان کے آپ لوگوں سے اچھے مراسم تھے کیونکہ اس محلے کے چند متمول گھرانوں میں سے ایک آپ کا گھرانہ تھا۔ آپ کے شوہر کویت میں اچھا خاصا کما رہے تھے۔'' ان کی آواز اتنی بلند اور انداز اس قدر جارحانہ تھا کہ آس پاس اپنی سرگرمیوں میں مشغول سب ہی لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ کئی خواتین تو جمع ہو چکی تھیں تاکہ اصل صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے۔

''آپ کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوا کرتا تھا، ایک بوڑھی ساس تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

ذکیہ گرنے کے سے انداز میں نزدیکی کرسی پہ بیٹھ گئیں۔ ان کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ ان کی منجھلی بیٹی اور ایک قریبی عزیزہ ان کو سہارا دینے قریب چلی آئیں۔ ان کے شوہر کو کسی نے اس جانب متوجہ کیا تو وہ بھی سُست قدم اٹھاتے اس طرف بڑھنے لگے۔

''اب شاید میں بھی یاد آ جاؤں۔ میں، عظمت بی بی، اپنے بھائی منظور اور بھابی زلیخا کے پاس انہی دنوں رہنے کے لئے آئی ہوئی تھی۔'' ''ان ہی'' دونوں پہ وہ بہت زور دے کر بولیں۔ ذکیہ نے اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں۔

''میرا بیٹا پیدا ہونے والا تھا، دو ڈھائی مہینے تک وہاں رکی تھی میں، اس لئے آپ..... آپ کے ساتھ ہونے والا حادثہ..... آپ کا وہاں سے جانا اور پھر آپ کے جانے کے بعد کے بھی تمام حالات و واقعات مجھے خوب اچھی طرح یاد ہیں۔''

''کیسے واقعات، کیا ہوا تھا؟ کیوں چھوڑا انہوں نے اپنا پرانا شہر؟'' اب تو تسنیم بیگم بھی متجسس تھیں۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ؟'' حق نواز کو بہت عجیب سا محسوس ہوا۔ یوں مجمع لگا کر یہ سب ڈسکس کرنا۔ اگرچہ ہونے والی بھابی کے والدین کے تاثرات اور دیگر رشتے داروں کی دبی دبی سرگوشیاں ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ لوگ واقعی کچھ چھپانا چاہ رہے ہیں۔ اصل بات وہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ چھپائی جانے والی بات سنگین بھی ہو سکتی ہے لیکن دوسری طرف اسے سامنے بیٹھی خاتون کی دگرگوں حالت پہ ترس آ رہا تھا جس کی بیٹی کے لئے وہ کل بارات لانے والے تھے۔ اب ان پژمردہ چہروں میں امید کی ایک رمق نظر نہ آ رہی تھی۔

''ہو سکتا ہے عظمت آنٹی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ یہ بھی تو دیکھیں کہ وہ جن خاتون کا ذکر کر رہی ہیں، ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا بتا رہی ہیں جب کہ ذکیہ آنٹی کا تو کوئی بیٹا ہی نہیں۔'' اس نے بات سنبھالنا چاہی۔

''اب نہیں ہو گا پہلے تو تھا اور ان سے پوچھیں کہ کہاں گیا ان کا وہ قاتل بیٹا۔''

''بہن جی.....'' سویرا کے ابو آگے بڑھے اور سر جھکا کے اپنے جڑے ہوئے ہاتھ ان کے آگے کر دیئے۔

''قاتل بیٹا..... واقعی؟'' ہر جانب چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اب سب ہی عظمت بی بی سے تفصیل سے جاننے کے خواہش مند تھے اور وہ بڑی شان سے گردن اٹھائے اپنے سامنے دو مجبور و بے بس انسانوں کی بے چارگی کا مزہ لے رہی تھیں جن کی اس وقت شدت سے یہ چاہ ہو گی کہ اس عورت کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے یا کھلنے سے پہلے وہ دونوں زمین میں سما جائیں۔

اس ہجوم سے ذرا فاصلے پہ کھڑی رومیصہ نے یہ منظر بڑے تاسف سے دیکھا۔

''اگر انہوں نے اپنے بیٹے کی کسی مجرمانہ حرکت کو چھپا کر اپنی بیٹی کا گھر بسانا چاہا ہے تو ایسا کیا برا کیا ہے۔ بیٹے کی غلط حرکت کی سزا، بے قصور بیٹی کو نہ ملے، یہی سوچا ہو گا انہوں نے اور اگر یہ خاتون یہ راز جانتی ہی ہیں تو یوں مجمع لگا کر انکشاف کرنے سے انہیں کیا ملے گا۔ پتہ نہیں ہمارے معاشرے میں ایک فرد کے گناہ کی سزا اس کے سارے خاندان کو کیوں دی جاتی ہے۔'' وہ چپ چاپ سوچ رہی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی جن پہ بندھے ہاتھوں کی التجاء اثر نہ کرے، ان سخت دلوں کو وہ کیسے اس بے رحمانہ حرکت سے باز رکھ سکتی تھی۔

''ان کے صاحبزادے نے پندرہ سال کی عمر میں قتل کیا تھا، اپنے ہی ایک محلے دار لڑکے کا۔ اب پتہ نہیں وہ ابھی تک جیل میں سڑ رہا ہے یا مر کھپ گیا ہے اور ان کی وہ لڑکی جس کی وجہ سے قتل ہوا ہے، وہ بھی پتہ نہیں..... ارے.....'' وہ بات کرتے کرتے اچھل پڑیں۔

''دیکھیں جی، ہاں ہمارے چھوٹے بھائی سے غلطی ہوئی۔ ہم نے مانا'' سویرا کی بڑی بہن آگے بڑھی۔

''آپ کو یہاں رشتہ نہیں کرنا، بے شک واپس چلے جائیں۔ یوں تماشہ بنانے کی ضرورت نہیں۔'' اس کے تیور خاصے بگڑے ہوئے تھے۔

''اے لڑکی! تماشا تو تم ہم شریف لوگوں کا بنانے چلی تھی۔ وہ تو بھلے وقت میں مجھے یاد آ گیا کہ تین لڑکیوں میں وہ سب سے چھوٹی والی ہی تھی اور یہ لڑکی جسے میری بہن انجانے میں بہو بنانے چلی تھی، وہ بھی سب سے چھوٹی والی ہے۔ میں تو سب کو خبردار کر کے جاؤں گی۔ کہیں تم ہمارے بعد کسی اور کو بیوقوف بنا ڈالو'' وہ مڑ کے سب کو اعلان کرنے والے انداز میں مخاطب کرنے لگیں۔

''ان کے بیٹے نے جس لڑکے کو قتل کیا تھا، وہ اصل میں تھا ہی مارے جانے کے قابل۔ ذلیل نے ایک چھوٹی سی نو دس سال کی بچی سے زیادتی کی تھی اور وہ بچی ان ہی کی تھی۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی۔''

بالآخر انہوں نے دھماکہ کر ہی ڈالا۔

عظمت بی بی نے گویا سب کے سروں پہ بم پھوڑ دیا تھا۔

لیکن نہیں..... بم پھٹنے کے بعد تو دھماکہ ہوتا ہے۔

کہرام مچ جاتا ہے..... ہر جانب بھگدڑ مچ جاتی ہے جب کہ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

اس کے برعکس یہاں موجود تمام نفوس کو جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کے پتھر کا کر دیا تھا۔

ہر شخص..... ہر منظر..... ہر چیز..... سب کچھ ساکت تھا۔ بس ایک چیز تھی جس کی آواز بہت تیز تھی۔

یہ دل تھا..... سویرا کا دل..... جو یوں دھڑک رہا تھا گویا پسلیاں توڑ کر ابھی باہر آ جائے گا۔ ہر جانب ایک گہری خاموشی ہونے کے باوجود وہ واحد تھی جس کے اردگرد قیامت کا شور تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں..... دھڑ دھڑ..... دھک دھک..... ہر قسم کا شور بپا تھا..... کہیں دور سے بہت مانوس سے بَین بھی سنائی دے رہے تھے۔

یہ کس کے بَین تھے.....؟ کون دہائیاں دے دے کر رو رہا تھا؟

اس نے ذہن پہ زور ڈالتے ہوئے سوچا اور وہیں کھڑے کھڑے سب پہ نظر دوڑائی۔

وہ نیچے کی طرف آتی سیڑھیوں پہ کھڑی تھی۔ ابھی اس نے دو ہی زینے طے کیے تھے۔ اس کے سر پہ گوٹے کے کام سے بوجھل سبز چادر کا سایہ تھا جس کے چاروں کونے، اس کی بہن سمیرا، دوست بینش اور کزنز زرداء، مریم اور روشی نے تھام رکھے تھے۔ وہ چاروں بھی گم صم پتھر بنی کھڑی تھیں۔

گھٹنوں کے بل نیچے زمین پہ، سر جھکائے بیٹھا وہ شخص جس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے گیلی ہو رہی تھی، وہ اس کا باپ تھا۔

یہ بَین اس کے بھی نہیں تھے۔ وہ بَین کرتا ضرور تھا، سالوں سے کر رہا تھا مگر یہ بَین سنائی نہیں دیئے جانے والے تھے۔ اس کی ایک نگاہ ہی سو کے بَین پہ بھاری ہوتی تھی۔ وہ ایک نگاہ جو وہ سویرا پہ ڈالنے کے بعد اوپر آسمان کی جانب کرتا تھا۔

اس کی بہن حمیرا زرد چہرہ لئے اپنے عمر رسیدہ مگر نازک مزاج شوہر کی جانب سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یہ بَین اس کے بھی نہیں تھے۔ ہاں اندر ہی اندر وہ بَین ڈالنے کی تیاری ضرور کر رہی ہوگی..... جو کچھ ابھی ہوا تھا، اس کے بعد جو کچھ ہوگا، وہ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

اس کی ماں..... ہاں یہ عورت جس کے ہاتھ ابھی تک عظمت بی بی کے آگے بندھے ہوئے ہیں۔ اس بات سے بے نیاز کہ جس کو بات کہنے سے روکنے کے لئے وہ یہ ہاتھ جوڑ رہی ہے، وہ بات کب کی کہی جا چکی۔ وہ تو اپنے سامنے کھڑی اس مہمان عورت کی سفاکی پہ یوں حیرت زدہ ہوئی کہ اپنے بندھے ہاتھ نیچے کرنا بھی بھول گئی۔ البتہ اس کی آنکھوں کو اپنا آپ نیچا کرنا خوب یاد رہا۔

''ہاں شاید یہ بَین اس کے ہیں، میری ماں کے۔'' اسے یاد آ ہی گیا۔

''لیکن یہ بَین..... ابھی تو میری ماں خاموش ہے، اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو کے اپنی رنگت تک کھو رہے ہیں پھر یہ بَین..... یہ کب۔''

اس نے ذہن پہ زور ڈالا تو سینہ پیٹ پیٹ کر، بال نوچ نوچ کر بَین ڈالتی ماں ہے کے ساتھ اور بہت کچھ یاد آ گیا۔ وہ سب کچھ جو وہ کبھی یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆======☆======☆

''ذکیہ! گھنٹہ ہونے والا ہے، یہ بلی اب تک نہیں لوٹی۔ مجھے تو فکر ہو رہی ہے۔'' دادی

نے کوئی پچھتی بار کہا تو ذکیہ تنک آ گئی۔

"اوہو اماں! کھیلنے لگ گئی ہوگی۔ ہے تو بچی نا۔ آپ تب تک یہ شہد چوس لو، آرام آجائے گا کھانسی کو۔"

"مرن جوگی! میں اپنی دوادارو کو نہیں رو رہی۔" وہ بگڑ گئیں۔

"لڑکی اب تک گھر نہیں لوٹی، اس کی فکر کر رہی ہوں۔ نو کیسی ماں ہے، آرام سے مٹھے پہ پسری ہوئی ہے اور اتنی دوپہر کو کون باہر کھیل رہا ہوگا؟"

"کسی سہیلی کے گھر گھس گئی ہوگی۔" وہاں بے فکری کا وہی عالم تھا۔ اب تو نیکے کے نیچے سے باریک کنگھی بھی نکال لی گئی تھی، سر سے جوئیں نکالنے کے لئے۔

"اب اٹھ ہی گئی ہے تو کنگھی رکھ ہاتھ سے اور آنڈی گوانڈی (آس پاس) جھاتی مار۔ کدھر ہے نمانی۔"

ساس کے مسلسل واویلے سے وہ تنگ آ کے اٹھی اور چپل گھسیٹتی گلی میں نکل گئی۔

دائیں بائیں کے دو تین گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے پہ بھی اسے بلی نہ ملی تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ حالانکہ فطرتاً وہ خاصی لاپرواہ عورت تھی۔ اسے گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں دیر تک سونے کی عادت تھی اور سمیرا، بلی دونوں سونے کی چور..... ان کی کھٹ پٹ اور شور شرابے سے اس کی نیند خراب نہ ہو اس لئے وہ بخوشی انہیں سہیلیوں کے گھر جا کے کھیلنے کی اجازت دے دیا کرتی تھی اور ایسا بھی پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ بلی بغیر بتائے گھر سے نکلی ہو یا اتنی دیر تک باہر رہی ہو۔

بظاہر کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا مگر کوئی احساس تھا جو معمول سے ہٹ کر اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس کے دل کو کسی انہونی کا ڈر سا لگ رہا تھا۔ ابھی یہ ڈر، یہ واہمہ..... کھل کے اس کے سامنے واضح نہ ہو رہا تھا۔ صرف ایک بے چینی اور اضطراب کی صورت اسے گھیر رہا تھا۔

"ایک تو یہ اماں..... نہ خود آرام سے بیٹھتی ہے نہ کسی دوسرے کو چین لینے دیتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے وہم لگا دیا ہے۔" کچھ اور نہ سوجھا تو جلے پیر کی بلی کی طرح ساری گلی میں بیٹی کو ڈھونڈتے ہوئے وہ ساس کو کوسنے لگی۔

"وے صادقا، بلی تیری ہٹی (دکان) پہ آئی تھی..... کچھ پتا ہے پھر کس طرف گئی تھی؟"

گلی کا موڑ مڑنے سے پہلے ہی اسے صادق اس طرف آتا دکھائی دیا تو وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔

"میری دکان..... خالہ میں نے آج تو دکان کھولی ہی نہیں۔ منڈی گیا ہوا تھا۔ ابا کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ میرا ماسی کا لڑکا ہی دو تین دن سے بیٹھ رہا تھا لیکن آج وہ بھی واپس اپنے شہر چلا گیا ہے۔ اسی کو لاری اڈے چھوڑ کے آ رہا ہوں۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی دوچار کی۔ شاید تپ چڑھ گئی ہو۔ گرمی بھی تو ادھر کڑاکے....."

"ہائے ہائے..... فیر میری بلی کدھر گئی۔" اس کا طویل بیان سننے کے دوران ہی وہ دو ہتڑ سینے پہ مار کے رونے لگی۔

"آلے دوالے (ادھر اُدھر) کدھر بھی نہیں ہے۔ کسی سہیلی کے گھر نہیں گئی۔ کسی نے اسے گلی میں آتے جاتے، کھیلتے نہیں دیکھا۔ تیری دکان بھی بند تھی تو وہ گئی کدھر؟"

آس پاس کے کواڑ اس کی فریادوں پہ کھلنے لگے۔ عموماً اس وقت مرد گھر نہیں ہوتے لیکن جو بھی چند ایک تھے، آس پاس کی گلیوں میں سے اسے ڈھونڈنے نکل گئے۔

عورتیں اکٹھی ہو کے ذکیہ کو دلاسہ دینے لگیں۔ کچھ بچے بھاگ کر اس کے گھر بلی کے نہ ملنے کی اطلاع دینے دوڑ گئے تو چند ایک سیانے لڑکے سائیکل لے کر دوسرے محلے کی دکانوں پہ پتہ کرنے چلے گئے کہ شاید بلی وہاں میٹھی گولیاں لینے گئی ہو۔

"اگر وہ دور گئی بھی ہوتی تو کوئی سانگلہ تو نہیں ٹپ (طے) گئی ہوگی، ادھر یوریوالہ میں..... اسی محلے کی کسی دکان پہ گئی ہوتی اور پھر بھی ڈیڑھ گھنٹہ تو نہیں لگتا واپس آنے میں ہائے میری بلی..... راہ بھول کے کہیں ہور نکل گئی..... یا پھر کوئی مرجانا چک (اٹھا) کے لے گیا۔"

مسجد میں اعلان ہونے لگا۔

دادی بھی ہانپتی کانپتی گھر سے نکل آئی اور ذکیہ کے رونے پیٹنے میں اس سے بڑھ کے اس کا ساتھ دینے لگی۔ ادھر بلی کی پھوپھی بانو اور آصف بھی فون پہ خبر ملتے ہی دوڑے چلے آئے۔ ایک گھنٹہ مزید گزر گیا۔ جتنے لوگ اسے ڈھونڈنے نکلے تھے۔ ایک ایک کر کے منہ لٹکائے واپس لوٹنے لگے۔ محلے کی عورتیں اپنے بچوں کو ڈراوے دینے لگیں۔

"دیکھا..... اور نکلو دوپہروں کو باہر۔"

یہاں ہفتے دس دن میں ایک آدھ واقعہ ایسا ہو جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی بچہ کھو جاتا پھر مسجد میں اعلان ہوتا اور سب ہمسائے مل کے ڈھونڈ رہے ہوتے لیکن آج کے واقعہ میں سنگینی اس لئے زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ ایک تو وہ بچے کم عمر ہوتے تھے، کوئی دو ڈھائی سال کا، کوئی چار پانچ سال کا..... حد سے حد کوئی چھ سال کا۔ زیادہ تر تین سال تک کی عمر کے بچے ہوتے۔ دنیا گھومنے کے شوق میں دو تین گلیاں پرے نکل جاتے اور پھر راستہ بھول جاتے۔ روتے ہوئے

بچے کو کوئی نہ کوئی اپنے پاس بٹھا کر مسجد میں اعلان کروا دیتا۔ لواحقین آ کے لے جاتے۔ یعنی ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈرامہ ختم۔

اب بات دوسری تھی، بلی نو سال کی تھی۔ سیانی بچی تھی۔ دن میں کئی بار گھر سے کسی نہ کسی کام سے نکلتی تھی۔ راستہ بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس محلے کے علاوہ آس پاس کا علاقہ بھی چھان لیا گیا تھا۔ اسے غائب ہوئے تیسرا گھنٹہ شروع ہو چکا تھا، اس لئے ہر جانب خوف و ہراس کا عالم تھا۔

''ہائے، کوئی فرخ کو بلا کر لائے۔ بے خبر کہیں گیند بلا کھیل رہا ہوگا۔ اسے بتاؤ تیری بہن نہیں مل رہی۔ ہائے کوئی بلی کے ابا کو خبر کر دے..... ہائے۔'' ذکیہ تڑپ رہی تھی۔

کچھ دیر تک فرخ بھی آ گیا۔ اسے پتہ چلا کہ دوپہر سے بلی لاپتہ ہے اور اب مغرب کا وقت ہو چلا ہے تو وہ بھی گھبرا کر ماں سے اُلجھنے لگا۔

''کیوں بھیجتی ہو اسے دوپہر کو دکانوں پہ؟''

''تو تُو بیٹھ جایا کر گھر پہ..... سودا لانے کو..... یا اپنے باپ کو بلا بھیج کر کام دھندہ چھوڑ کے یہاں آ جائے پھیرے لگانے کے لئے۔ بیٹا بڑا مصروف جو ہے..... ہونہہ..... بڑا غیرت والا بن رہا ہے اب۔'' ماں کی لعنت ملامت پہ وہ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر، نتھنے پھلا کے مڑنے لگا۔

اس کا غصہ ایسا ہی طوفانی ہوتا تھا، پھر کسی کا لحاظ نہیں کرتا تھا وہ۔

''چاچا..... چاچا..... ماسی ذکیہ.....''

ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکا دوڑتا ہوا اس جانب آیا تو فرخ ٹھٹکا۔ اس لڑکے کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

کوئی بہت جانی پہچانی چیز۔

''ماسی..... یہ..... یہ چپل بلی کی ہے؟'' پھولی سانسوں کے ساتھ وہ ہاتھ میں پکڑی چپل اونچی کر کے دکھانے لگا۔

ذکیہ کے اندر پھر سے زندگی جاگ اٹھی۔ وہ جو ہاتھ پیر چھوڑے گلی کے بیچوں بیچ بیٹھی تھی، فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہاں ہاں، میری بلی کی ہے، کدھر ہے میری بچی؟''

''کہاں سے ملی ہے یہ چپل؟'' کئی مرد آگے بڑھے۔

''یہ ٹلی کی دکان کے آگے پڑی ہوئی تھی۔''

''ٹلی کی دکان..... وہ تو بند ہے۔''

''ہاں مگر میں ظہر کی نماز پڑھ کے لوٹ رہا تھا تو میں نے اس کی دکان کھلی دیکھی تھی۔''

کسی اور نے گواہی دی جس پر سب اس جانب بھاگے۔ آگے آگے غیض و غضب سے بھرا فرخ تھا۔ ذکیہ کو عورتوں نے بہت مشکل سے پکڑ کے جانے سے روکا تھا۔

دکان کا شٹر بند تھا۔ پتھر مار کے تالا توڑا گیا۔ شٹر اٹھاتے ہی زمین پہ سیاہ کانچ کے ٹکڑے نظر آئے۔ بڑے پیر جی کی درگاہ سے لے کر ذکیہ نے پچھلے مہینے ہی جو کالے کڑے بلی کی کلائی میں چڑھائے تھے، یہ اسی کے ٹکڑے تھے۔

''بلی.....'' فرخ ہاتھ میں کڑے کا ٹکڑا لے کر دھاڑا۔

اس کی آواز اس نیم تاریک خالی دکان میں گونج کے رہ گئی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ کسی نے بلب روشن کیا۔ زمین پہ بچھی دری جس پہ محلے کے بچے اور لڑکے بیٹھ کے فلمیں دیکھتے تھے، بے ترتیب تھی۔ وی سی آر اور ٹی وی کی تاریں اُتری ہوئی تھیں مگر وی سی آر کے اوپر دو تین فلمیں رکھی تھیں۔

''بلی یہاں ہے۔'' ایک شخص نے دو قدم آگے بڑھ کے سنوکر ٹیبل کے دوسری جانب جھانک کے کہا تھا۔

مگر اس کی آواز پھٹی پھٹی سی تھی۔ بے پناہ درد میں ڈوبی ہوئی۔ وہ وہیں پتھرایا ہوا کھڑا رہا۔ اس طرف آتے فرخ کو اس نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کے آگے آنے سے روکنے کی کوشش کی۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ فرخ، بلی کو دیکھے لیکن وہ اس شخص کو دھکا دے کر آگے بڑھ گیا۔

سامنے زمین پہ اوندھی گری..... وہ بلی ہی تھی کہ مری نہیں تھی، صرف بے ہوش تھی۔

وہ تو لاش نہیں تھی مگر اس پہ ایک نظر ڈالتے ہی اس کا پندرہ سالہ بھائی کھڑے کھڑے ایک لاش میں تبدیل ہو گیا۔

☆======☆======☆

ان کے محلے میں یہ پہلا واقعہ تھا۔

جہاں ہر گھر میں افسوس اور غم کا اظہار ہو رہا تھا، وہاں خوف بھی پھیل گیا تھا۔ اگلے کئی دن تک لوگوں نے اپنی بچیوں کو گھر سے باہر تو کیا صحن میں بھی قدم نہ رکھنے دیا۔ البتہ خود وہ جوق در جوق عابد چودھری کے گھر جا رہے تھے۔

جانے کی ایک نہیں، تین وجوہات تھیں۔

ان چار دنوں میں اس گھرانے پہ کیا کیا کچھ نہ گزر چکا تھا۔ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی نو

سال کی معصوم بلی کسی درندے کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد نازک حالت میں ہسپتال میں داخل تھی۔

ان کا جواں سال بیٹا.....فرخ.....جس نے ابھی جوانی کی پہلی بہار بھی ڈھنگ سے نہ دیکھی تھی، اپنی بہن کو اس اُدھڑی حالت میں دیکھنے کے بعد اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا اور چیخیں مارتا، وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ایک آدھ نے اس کے پیچھے لپکنا چاہا تھا مگر بلی کی حالت زیادہ توجہ طلب تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی سخت ضرورت تھی۔ وہ سب فرخ کو اس کے حال پہ چھوڑتے ہوئے ایک گروہ کی صورت میں بلی کو ہسپتال لے گئے۔ دوسری طرف غم و غصے سے بے قابو ہوتا فرخ سید حاطلی کے گھر پہنچ چکا تھا۔ طلی کو یہ سن گن تو مل چکی تھی کہ شام سے بلی کی ڈھنڈیا مچی ہے مگر یہ علم اب تک نہیں تھا کہ محلے والے اس تک پہنچ چکے ہیں۔ اس کے منی سینما گھر سے اسے نیم مردہ حالت میں اٹھالائے ہیں۔ اپنے تئیں تو وہ اور اس کا دوست اسے مُردہ سمجھ کے چھوڑ بھاگے تھے کہ رات کے کسی پہر خاموشی سے اس کی لاش ٹھکانے لگا دیں گے۔ اب جو اس نے پورے علاقے کے لوگوں کو بلی کی تلاش میں سرگرداں دیکھا تو بدحواس ہو کر بھاگنے کی تیاری پکڑی مگر اس سے پہلے کہ وہ گھر سے نکل پاتا، فرخ نے اسے جالیا اور وحشیانہ طریقے سے اس کا سر پتھر کے ستون سے ٹکرا ٹکرا کر اسے قتل کر ڈالا۔

ضعیف دادی جو پہلے ہی پوتی کے ساتھ گزرنے والے سانحے اور خاندان کی ہونے والی بدنامی پہ صدمے سے نڈھال تھی، اس غم کو برداشت نہ کر پائی اور اگلے ہی دن ہر درد ہر تکلیف سے نجات پا گئی۔

ذکیہ اور اس کے رشتے دار جو پچھلے تین دن سے اس شش و پنج میں گرفتار تھے کہ عابد چودھری کو کویت سے کیا کہہ کر بلوائیں، کیا یہ کہ۔

تمہاری کمسن بیٹی کسی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

یا اس بات کی کہ تمہارا اکلوتا بیٹا قتل کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے ہے اور اپنا دماغی توازن تقریباً کھو بیٹھا ہے۔

اب ان کی مشکل آسان ہو گئی۔ وہ عابد چودھری کو اس کی ماں کی وفات کی خبر دے کر واپس آنے پہ مجبور کر سکتے تھے۔

عابد چودھری ایک شریف النفس، سیدھا سادا محنتی انسان تھا۔ اپنی ماں سے بے حد عقیدت رکھنے والا بیٹا.....ایک شفیق باپ.....اور ایک نرم مزاج شوہر جس نے چٹی اَن پڑھ، قدرے اجڈ اور بیوقوف سی بیوی کے ساتھ بھی صبر کے ساتھ نباہ کر لیا۔ حالانکہ وہ ایک سلجھے

ہوئے مزاج کا مناسب حد تک تعلیم یافتہ انسان تھا اور اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا تھا مگر افسوس تعلیم تو ایک طرف، روزگار کے چکر میں وہ ان کی تربیت تک حسبِ خواہش نہ کر سکا۔ پچھلے کئی سالوں سے اس کے کویت میں مقیم ہونے سے اس کے کنبے پہ کئی اچھے برے اثرات مرتب ہوئے تھے۔

اچھے تو یہ کہ خوشحالی آ گئی تھی۔ اگرچہ بہت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ اپنی بیوی کے پھوہڑ پن اور شاہ خرچی سے واقف ہونے کی وجہ سے وہ اسے بس اتنا ہی خرچہ بھیجتا تھا جس سے وہ گھر کو کھلے ہاتھ سے چلا سکے۔ باقی کی بچت اور مستقبل کے لئے سرمایہ کاری وہ خود کر رہا تھا اور اس میں خاصا کامیاب بھی تھا۔

بُرے اثرات یہ تھے کہ حصولِ رزق کے لئے بیرونِ ملک مقیم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو اپنے سامنے پروان چڑھتے نہ دیکھ سکا، نہ ہی انہیں اپنے خوابوں کے مطابق پال سکا۔ اعلیٰ تعلیم تو ایک طرف، اس کی اولاد گزارے لائق تعلیم بھی حاصل نہ کر سکی۔ بڑی بیٹی کو تو ذکیہ نے شوہر کے جانے کے کچھ ہی عرصہ بعد سکول سے اٹھا لیا۔ فرخ بھی سکول کی تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ چھوٹی دونوں بچیاں ذہین تھیں اور ابتدائی جماعتوں میں تھیں لیکن گھر میں کوئی ان کے اس شوق کی حوصلہ افزائی کرنے والا نہیں تھا، اس لئے اسے ان دونوں سے بھی خاص امیدیں نہ تھیں۔

ان دنوں دن رات کی انتھک محنت وہ اس نیت سے ہی کر رہا تھا کہ اب کی بار وہ پاکستان جائے تو پھر واپس آنا نہ پڑے۔ وہیں کاروبار جمائے اور باقی کی زندگی بیوی بچوں کے ساتھ چین وسکون سے بسر کرے۔ اسی خواب کی تکمیل کے لئے وہ اپنے خون پسینے کی کمائی جمع کر رہا تھا۔ ماں کی وفات کی اچانک خبر اس کے لئے دھچکے کا باعث تھی۔ اس کا دل پردیس سے اور بھی اچاٹ ہو گیا جس کی وجہ سے وہ ماں کے آخری دنوں میں اس کی خدمت کر کے جنت کا طلب گار بھی نہ بن سکا۔ ایک احساس یہ بھی تھا کہ اب اس کی بیوی اور کم بچے بغیر کسی بزرگ کے سائے کے اکیلے ہیں، اس سوچ کے زیرِ اثر اس نے اپنا کام سمیٹا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاکستان آ گیا۔

یہاں آ کے اسے علم ہوا کہ اس کا یہ فیصلہ بروقت نہیں تھا۔ قیامت تو آ چکی تھی اور ستم یہ کہ آ کے گزری بھی نہیں۔ یہ قیامت اس کے خاندان پہ ٹھہر چکی تھی اور نہ جانے اسے کتنے عرصے تک اس خاندان پہ مسلط رہنا تھا۔

☆======☆======☆

وہ یہ سب ہرگز..... ہرگز یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر وہ سب اسے یاد آ رہا تھا..... ایک ایک کر کے سب کچھ۔

وہ بَین ڈالتی عورت۔

ہوش میں آتے ہی وہ یہ بَین سنتی..... سوجی ہوئی آنکھیں بمشکل کھول کے کسی مانوس مہربان چہرے کو تلاش کرنا چاہتی مگر اس کے اردگرد کئی انجان چہرے ہوتے۔

متجسس، سوالیہ، ترحم بھرے، ہر طرح کے چہرے۔ ڈاکٹر کا..... نرس کا..... پریس والے کا..... یا پھر کسی محلے دار یا عزیز کا۔

مگر ماں کا چہرہ نظر نہ آتا..... اس کے صرف بَین سنائی دیتے۔ وہ یہ بَین حیرت سے سنتی جو جانے پہچانے لگتے۔ ذہن پہ بہت زور دینے کے بعد اسے یاد آتا، اس بَین میں جو درد ہے، وہی کرب اس کی چیخ میں بھی تھا۔

کس چیخ میں؟

یہ یاد کرنے کے لئے اسے اپنے ذہن پہ زیادہ زور نہ ڈالنا پڑتا۔ اسے یاد آ جاتا کہ یہ چیخیں اس کی اپنی تھیں۔

اور اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر وہ چیخیں مارنے لگتی۔ بے قابو ہو کے اپنے ہاتھ بیر نرسوں سے چھڑانے لگتی۔

''چھوڑ دو مجھے..... امی..... امی..... مجھے چھوڑو..... دادی..... نہیں..... چھوڑو..... اللہ میاں جی.....''

آخری نام اللہ کا تھا جو ان شیطانوں کو ناگوار گزرا۔ پھر کپڑا ٹھونس کے اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔

ہسپتال کے بیڈ پہ تڑپتے تڑپتے اسے اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے پورا منہ کھول کے سانس لینے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایسا کر نہ سکی تھی۔

اور آج..... آج کتنے سالوں بعد پھر اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ منہ کھولنا چاہتی تھی..... کچھ کہنا چاہتی تھی..... اس بندھے ہاتھوں والی عورت کو جو اس کی ماں تھی اور اس جھکے سر والے شخص کو جو اس کا باپ تھا۔ انہیں چیخ چیخ کے پکارنا چاہتی تھی مگر آج پھر اس کی آواز بند تھی۔

وہی گھٹن..... وہی درد..... وہی بے بسی..... وہی بَین..... وہی اجنبی متجسس چہروں کا جمگھٹا۔

سویرا کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لہرا کے گرنے لگی اور اس کے گرد کھڑی پانچوں لڑکیوں میں سے صرف ایک کے ہاتھ اسے سنبھالنے کے لئے آگے بڑھے تھے۔

یہ ہاتھ اس کی عزیز از جان دوست بینش کا نہیں تھا جو اس سے دوستی اور خلوص کا دم بھرتی تھی۔ وہ نگاہیں چرائے..... اپنے ہاتھ سمیٹے دو قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

یہ ہاتھ اس کی کزنز رواء، مریم اور روشی کے بھی نہیں تھے جن کے ساتھ اس کا لڑکپن گزرا تھا۔

یہ ہاتھ اس کی بہن سمیرا کے تھے جو اس کے نیم بے ہوش وجود کو بانہوں میں بھرے بلک بلک کے رو رہی تھی۔ وہ سارے آنسو بہا رہی تھی جو آج سے گیارہ سال پہلے نہیں بہا پائی تھی۔ تب ہی آنسو خوف سے اس کے اندر ہی منجمد ہو گئے تھے۔ وہ خود اتنی کم عمر تھی کہ اپنی بہن کے ساتھ پیش آنے والے سانحے کی سنگینی سے واقف نہ تھی۔ ہاں مگر پے در پے ٹوٹنے والی مصیبتوں نے اس کا سارا لاابالی پن رخصت کر دیا تھا۔ آج اس کے اندر کی برف پگھل رہی تھی۔

آج وہ اپنے وہ آنسو بھی بہا رہی تھی جو گیارہ سال پہلے اس نے اپنے اندر اتار لئے تھے۔

☆======☆======☆

عابد چودھری اور زکیہ تو کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہے تھے، البتہ سویرا کے ماموں اور خالو وغیرہ آگے بڑھ کے لڑکے والوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''دیکھیں، آپ اس طرح واپس مت جائیے۔ ان سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ آپ سے یہ بات چھپائی مگر.....''

''تو کیا اشتہار لگواتے، عجیب بات کر رہے ہیں صاحب آپ۔'' لڑکے والوں کی جانب سے کوئی بگڑ کر بولا۔

''بتا بھی دیتے تو کیا ہو جاتا۔ آنکھوں دیکھی مکھی کون نگلتا ہے۔'' کوئی اور بولا۔

''نہیں، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ واقعی چودھری صاحب کو یہ باتیں پہلے کر لینی چاہئے تھیں۔'' تنمیم بیگم نے کہا۔

''تو سب کچھ جان کر تم اپنے بیٹے کا رشتہ یہاں کر لیتیں؟'' ان کے شوہر رب نواز نے ناگواری سے پوچھا۔

''نہیں، تب بھی ہماری جانب سے انکار ہی ہوتا لیکن کم از کم عزت تو رہ جاتی ان کی بھی

اور ہماری بھی، کم از کم یہ تماشا تو نہ لگتا۔ قاضی صاحب بھی نکاح کے لئے آچکے ہیں اور انہیں واپس لوٹنا پڑ رہا ہے۔"

انہوں نے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑے اپنے بیٹے شاہ نواز کو دیکھا جو اپنے تایا اور نکاح خواں کے ہمراہ ابھی ابھی آیا تھا اور ماتھے پہ بل لئے کسی عزیز سے ساری تفصیل سن رہا تھا۔ وہ ماں ہونے کے ناطے یہ جانتی تھیں کہ اب ان کے بیٹے کا ردِعمل کیا ہوگا۔

"چلیں ابو جان..... واپس چلیں، بلکہ مجھے حیرت اس بات پہ ہے کہ آپ اب تک یہاں کھڑے کیوں ہیں؟"

شاہ نواز غصے سے آگے بڑھا۔ حق نواز نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو اس نے پلٹ کر اسے ٹوک دیا۔

"تم بیچ میں مت بولنا۔"

شاید اسے اندازہ تھا کہ حق نواز کیا کہنے والا ہے اور حق نواز..... جو اس ساری صورتِ حال پہ حیران تو واقعی اتنا ہی تھا جتنا کہ باقی سب..... البتہ دوسروں کی طرح طیش میں آنے کے بجائے وہ اندر ہی اندر شرمندگی محسوس کر رہا تھا کہ یہ لوگ پہلے ہی اس دکھ کی وجہ سے ٹوٹے ہوئے ہیں، دنیا کی نظروں میں گرے ہوئے ہیں، ان بے چارے لوگوں کو آج ان کی وجہ سے ایک اور غم کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"بھائی صاحب! آپ بھی بہن بیٹی والے ہیں۔ یوں اس طرح واپس مت جائیں۔ اس میں بچی بے چاری کا کیا قصور ہے، وہ تو معصوم اور پاک ہے۔"

سویرا کے ماموں نے آخری کوشش کے طور پہ ان سے التجا کی۔

"بے شک آپ کی بچی بے قصور ہوگی مگر ہمارا کیا قصور ہے جو ہم مفت کی بدنامی مول لیں اور ہمارے بیٹے کا کیا قصور ہے جو اس کے حصے میں بیوی کی بجائے نری ذلت آئے۔"

رب نواز صاحب نے اپنے ہمراہ آئے لوگوں کو روانگی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور بھائی صاحب! برا مت مانیں۔" تنسیم بیگم نے بھی چلتے چلتے کہنا اپنا فرض جانا۔ "اپنی بچی کو معصوم اور بے قصور آپ بے شک کہہ لیں لیکن پاک تو نہ کہیں۔ یہ تو آنکھوں میں دھول جھونکنے والی بات ہوئی۔ ایسی ہی بات ہوتی تو خاندان والے جو ہمدرد بنے ہمیں نصیحتیں کر رہے ہیں وہ خود نہ بیاہ کے لے گئے ہوتے۔"

سب ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ بغیر کچھ کہے، بغیر پلٹ کے دیکھے۔

لڑکے والوں کی جانب سے آنے والے مہمانوں میں سے صرف رومیصہ اب تک

وہیں موجود تھی۔ اسے قدم آگے بڑھانا دوبھر لگ رہا تھا تو واپس جانا ایک سفاکانہ عمل تھا۔

"مگر میں یہاں کھڑے کھڑے کر بھی کیا سکتی ہوں۔" بے بسی سے اس نے سوچا اور زندگی میں پہلی بار اس لڑکی کو اپنے "لڑکی" ہونے پہ افسوس ہوا وہ جو ہمیشہ خود کو صنفِ نازک میں شمار کیے جانے پہ فخر محسوس کرتی تھی۔

"کاش میں لڑکا ہوتی..... تب ان بے درد لوگوں کے ساتھ واپس جانے کے بجائے میں فخر سے آگے بڑھ کے خود کو پیش کر سکتی تھی۔ ان بجھتی آنکھوں میں زندگی کی رمق واپس لا سکتی تھی مگر کاش..... کاش میں....."

"مجھے..... مجھے بہت افسوس ہے۔"

اس نے فی الحال وہ کیا جو وہ کر سکتی تھی۔ وہ سویرا کی والدہ ذکیہ کے سامنے کھڑی سچے دل سے اظہارِ افسوس کر رہی تھی۔

جواباً وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اٹھ گئیں۔ رومیصہ نے ان کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں، وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی بے ہوش بیٹی کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

☆======☆======☆

سویرا اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے کچھ دیر قبل اسے سہیلیوں اور بہنوں کے جھرمٹ میں بڑے چاؤ کے ساتھ باہر لے جایا گیا تھا۔ دس منٹ پہلے وہ اپنی ماں اور بہن کے سہارے خود کو گھسیٹتی ہوئی اس کمرے میں لائی تھی۔ وہ اس کو بیڈ پہ لٹا کے، اس کے یخ بستہ ہاتھ پیر سہلانے کے بعد ابھی ابھی باہر نکلی تھیں۔

"میں..... ذرا تمہارے ابا کو دیکھوں۔" ذکیہ نے نیچی نظروں اور دھیمی آواز کے ساتھ وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا تھا۔ انہیں فرش پہ اپنی بے تاثر آنکھیں گاڑے بیٹھی، اپنی بیٹی کی خاموشی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"میں دودھ گرم کر کے لاتی ہوں تمہارے لئے۔" سمیرا نے بھی اٹھتے ہوئے کہا اور ایک پل کے لئے رک کے اس کے سفید پڑتے چہرے کی جانب دیکھا بھی..... کہ شاید وہ کچھ کہے اور کچھ نہیں تو دودھ لانے سے منع ہی کر دے مگر وہاں تو سکتے کا سا عالم تھا۔ سمیرا کو اپنی ماں کی طرح سویرا کی خاموشی سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ اسے یہ سکتہ غنیمت لگ رہا تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد اس کے ساکت وجود میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھا کے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا پھر سر گھما کے چاروں طرف پھیلے اس سامان کو..... رنگین چمک دار کاغذوں میں لپٹے تحائف، موی کاغذوں میں ملفوف وہ قیمتی

ملبوسات جو اس کے جہیز کے تھے اور جو اس کے سسرال والوں کو دینے کی غرض بینش نے سارا دن بیٹھ کے خوبصورتی سے پیک کیئے تھے۔ مٹھائیوں کے بڑے بڑے ٹوکرے..... مہندی کے سجے سجائے تھال..... قالین پہ ایک جانب لڑھکی ڈھولکی، اس کے نزدیک رکھی کون مہندی اور مہندی کے ڈیزائنوں والی کتاب جو بینش اپنے گھر سے لائی تھی۔

اچانک کمرے کا دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا۔ سر جھکائے سختی سے لب بھینچے بینش اندر داخل ہوئی۔ سویرا کے لب کپکپانے لگے۔ وہ اس کے گلے لگ کے رونے کو بے چین ہوگئی۔

''تم مجھ سے جتنا بھاگتی ہو، میں اتنا ہی تمہارے نزدیک آتی ہوں۔ یک طرفہ محبت کا تو سنا تھا، مگر مجھے لگتا ہے کہ میں تمہاری یک طرفہ دوستی میں مبتلا ہوگئی ہوں۔''

پہلے پہل وہ اکثر کہا کرتی تھی، جب سویرا اس کی مخلصانہ پیش قدمی کا جواب ویسے نہیں دے پاتی تھی، جیسے دینا چاہئے تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ بینش سے دوستی کر کے آخر کرے گی کیا..... اور آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایک دوست زندگی میں کتنا ضروری ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے..... اپنے دکھ درد بانٹنے کے لئے۔

اس نے اپنی گود میں بے حس و حرکت پڑے بازوؤں کو دیکھا..... وہ انہیں پھیلانا چاہتی تھی۔ بینش کے گلے لگ کے، اس کے کاندھے پہ سر رکھ کے روتے ہوئے اپنے سارے دکھ سنانا چاہتی تھی۔ مگر اس کے بازو بے جان ہی رہے۔ بینش کی لاتعلقی نے ان میں اٹھنے کی سکت ہی نہ پیدا ہونے دی۔ وہ جس طرح خاموشی سے اندر آئی تھی اب اتنی ہی خاموشی سے کمرے سے اپنا سامان اکٹھا کر رہی تھی۔ واش روم میں لٹکا وہ سوٹ اتار کے لائی جو اس نے رات کو پہنا تھا۔ بیڈ کے نیچے سے کھینچ کر اپنا بیگ نکالا، اس کی زپ کھول کر یہ سوٹ رکھا، دیوار پہ ہینگر کر کے لٹکے اس سوٹ کو اتارنے سے وہ کل شادی پہ پہننے کا ارادہ رکھتی تھی، ڈریسنگ سے اپنی جیولری اٹھائی اور اس نے ایک بار بھی بیڈ پہ بیٹھی اپنی سہیلی کو دیکھنا گوارا نہ کیا لیکن یہ بات سویرا کو صاف محسوس ہو رہی تھی کہ بینش کی لاتعلقی میں ایک جبر تھا، ایسا جبر جو وہ خود پہ کر رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ بیگ کی زپ بند کر رہی تھی جب بینش کی ماما نے اندر جھانکا، اس کی فیملی ساری تقریبات میں مدعو تھی اور آج ایک گھنٹہ قبل ہی وہ لوگ آئے تھے۔ اس سارے ڈرامے کے ہونے سے چند منٹ پہلے۔

''جلدی کرو بینش، نیچے تمہارے پاپا کا پارہ ہائی ہو رہا ہے۔'' انہوں نے ہلکی سی آواز میں اسے جھڑکا اور ساتھ ہی ایک تیز نظر سویرا کے گٹھری بنے وجود پہ ڈالی۔

''بس ممی!'' بینش کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور آنسوؤں کی نمی بھی۔

''آج کل کے بچے سوچ سمجھے بغیر، کسی کو پرکھے یا اس کی فیملی کا آگا پیچھا جانے بنا دوستیاں تو کر لیتے ہیں، بھگتنا ان کے ماں باپ کو پڑتا ہے۔ اب دیکھو تمہاری وجہ سے تمہارے پاپا کی کتنی باتیں سننا پڑتی ہیں مجھے۔'' بینش کا بازو پکڑ کر باہر کی طرف دھکیلتے ہوئے انہوں نے خاص طور پر اسے سنایا۔

''تم بھی چلی گئی بینش..... ! میرے متعفن ماضی کی بدبو سے گھبرا کے تم بھی بھاگ گئیں۔'' اس کے چہرے پہ آنسو پھیلتے چلے گئے۔

''میں ایک بار پھر اکیلی ہوگئی ہوں اور بھی اکیلی ہوتی جاؤں گی، جیسے آج سے گیارہ سال پہلے ہوگئی تھی۔ سب نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا تھا..... سوائے امی کے۔ میری ماں کے، مگر امی کا میرے پاس آنا مجھے اور تکلیف دیتا تھا۔ وہ مجھے دیکھتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ روتی جاتی تھیں اور میرا ڈوکھتا ہوا جسم چومتی جاتی تھیں..... چومتی جاتی تھیں اور میرے پاؤں پکڑ پکڑ کے معافیاں مانگتی جاتی تھیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے ساتھ جو بھی ہوا، اس میں امی بے چاری کا کیا قصور جو وہ مجھ سے رو رو کے معافی مانگتی ہیں اور جب سمجھ میں آیا کہ ان کی کیا غلطی تھی تب تک ان کے آنسو میرے دل کو دھو کے اپنے لئے معافی لکھ چکے تھے۔ ویسے بھی ان سے ناراض رہ کے میں کیا کر لیتی جو میری خوفناک راتوں کی واحد پناہ گاہ تھیں۔ جن کی آغوش میں چھپ کر مجھے ان تینوں درندوں کے مکروہ چہرے نظر آنا بند ہو جاتے تھے۔ وہ ماں جو کتنے ہی سال تک اکیلی میرے آنسو پونچھتی اور اپنے بہاتی رہی۔ حالانکہ جتنی اذیت میں نے اٹھائی تھی، اس سے کئی گنا زیادہ تکلیف امی ان دنوں اٹھا رہی تھیں۔

دادی کی موت..... حمیرا باجی کی منگنی کا ٹوٹنا..... ابو کی ان سے طویل ناراضی اور سب سے بڑھ کے بھائی کی سزا..... ویسے بھی ان دنوں خوف اور دہشت کے علاوہ کسی دوسرے احساس نے مجھے اب تک نہ چھوا تھا۔ میں صرف بدن کی تکلیف پہ چلائی تھی۔ میری ماں تو میری ہر اس تکلیف پہ ماتم کر رہی تھی جو میں نے آنے والے سالوں میں بھگتنا تھی۔

ان سے میں کیا ناراض ہوتی۔ ان کے سوا تب میرا تھا ہی کون..... اور شاید اب بھی کوئی نہیں، وہ سب جو میری شادی کی تاریخ مقرر ہوتے ہی مجھے کوئی نئی سویرا عابد سمجھتے ہوئے میرے پاس رفتہ رفتہ لوٹنا شروع ہوئے تھے وہ سب واپس پلٹ جائیں گے۔ یہ جان کر کہ..... میں تو وہی بھلی ہوں۔ وہی بھلی جو..... اور جسے دیکھ کر لوگ توبہ توبہ کر اٹھے تھے۔ اس دن سے لے کر آج تک میں ایک عبرت حاصل کرنے والی چیز سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں

کر پائی۔ یا پھر میرے وہ اپنے جو مجھے دیکھ کر اور بھی اذیت کا شکار ہو جاتے تھے اور اسی لئے انہوں نے میرے پاس آنا تک چھوڑ دیا تھا۔ جیسے ابو.....''

اسے اپنے باپ کا کل رات اپنے کمرے میں آنا یاد آیا۔ وہ کتنا خوش ہوئی تھی انہیں اپنے سامنے دیکھ کر۔ عرصہ ہوا انہوں نے اسے مخاطب کرنا، اس کے سامنے آنا ترک کر دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ دوسرے لوگوں کی طرح عابد چودھری بھی اپنی بیٹی کے وجود سے گھن کھانے لگے تھے۔ انہیں آج بھی اپنی اس سب سے چھوٹی بیٹی سے اتنی ہی محبت تھی۔ ہاں مگر وہ اس کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگے تھے۔ اس کا سہما ہوا چہرہ دیکھ کے، اس کے بدن کے نیل دیکھ کے ان کا شرم سے ڈوب مرنے کو دل چاہتا تھا اور کسی پہ بس نہ چلتا تو وہ ذکیہ سے لڑنے بیٹھ جاتے۔ حالانکہ کئی سال انہوں نے آپس میں ذرا نہ بننے کے باوجود بڑے صبر و تحمل سے گزار دیئے تھے، لیکن یہ غلطی معاف کرنے پہ وہ تیار نہ تھے۔

''بیٹی کی ماں بننا آسان بات نہیں ذکیہ! بیٹی کی ماں ہونے کے ناطے تمہارا فرض تھا کہ تم اسے اپنے پروں میں چھپا کے رکھتیں تاکہ کسی کی نظر بھی اس پہ نہ پڑے..... نہ کہ تم اسے سارا سارا دن گھر سے باہر نکالے رکھو۔ ہر اچھی بری جگہ اسے تنہا بھیجو۔ ہر ایرے غیرے کی دکان سے سودا لانے بھیجو، تمہیں ایسا کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تھا ذکیہ؟''

''مجھے کیا پتہ تھا، کیا پتا تھا مجھ نصیب جلی کو۔ پتہ ہوتا تو کیا میں اپنی بچی کو جان بوجھ کے باہر نکالتی.....؟ میرا تو خیال تھا کہ وہ بچی ہے۔ کوئی بات نہیں اگر چلی جائے۔ جب بڑی ہو گی تو.....''

''بچی ہے، اسی لئے تو ہمیں خیال رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ بچے اپنا خیال رکھنے اور بھلا برا سوچنے کے قابل نہیں ہوتے۔ اسی لئے ان پہ خود نظر رکھنا ہوتی ہے۔ ایک باشعور ہوتی لڑکی تو خود بھی کسی حد تک برے بھلے میں تمیز کر سکتی ہے۔ یہ اندازہ لگا سکتی ہے کہ خطرہ کہاں ہے اور نقصان کہاں۔ زیادہ تحفظ کی ضرورت تو انہی معصوم اور کچے ذہنوں کی بچیوں کو ہوتی ہے جو ہر بہلانے پھسلانے والے کو ''انکل'' جان کے اس کے پیچھے چل پڑتی ہیں، ذکیہ! تمہاری عاقبت نااندیشی نے آج یہ دن دکھایا ہے کہ میری معصوم نو سال کی بچی اپنی ذات پہ کبھی نہ مٹنے والا داغ لئے، گھر کے پچھلے کونے میں مجرموں کی طرح منہ چھپائے بیٹھی ہے۔ آدھی رات کو نیند میں ڈر کے مارے جب وہ چیختی ہے تو..... تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارا گلا دبا دوں۔ جب میرا بچہ میرا بیٹا جس نے میرا بازو بننا تھا، اسے میں سلاخوں کے پیچھے دیکھتا ہوں تو میرا دل چاہتا ہے اپنا سر ان سلاخوں سے ٹکرا ٹکرا کے خود کو ختم کر لوں۔''

آنسو بے اختیار ان کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔

''آج کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی جب لوگ میرے گھر آتے ہیں، کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بلی کو دیکھتے ہیں، مجھ سے ہمدردی جتاتے ہیں، تو اپنے سب بچوں کو لے کر یہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے سوچ لیا ہے، ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ یہاں رہے تو اس چھوٹے شہر میں یہ واقعہ کبھی پرانا نہیں ہو گا۔ بلی کبھی بھی رات کو ڈراؤنے خواب دیکھنا نہیں چھوڑے گی۔ ہم لاہور چلے جاتے ہیں، یا کسی بھی اور بڑے شہر میں جہاں لاکھوں لوگوں کے ہجوم میں ہمارا وجود کم ہو جائے۔ کوئی ہمیں پہچان نہ سکے۔''

انہوں نے یہ شہر چھوڑنے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔

☆=======☆=======☆

عابد چودھری کا بھائی تو کوئی تھا نہیں..... باپ عرصہ ہوا گزر چکے تھے۔ اب ماں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایک بہن تھی بانو..... جس نے بلی کے ساتھ ہونے والے حادثے پہ بھائی کی ڈھارس بندھانے کی بجائے حمیرا کی اپنے بیٹے کے ساتھ منگنی توڑ کے اس کی اور بھی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ عابد چودھری نے بہن سے اسی وقت قطع تعلق کر لیا۔ سو اب اس شہر میں اس کے لئے کچھ نہیں تھا۔

دوسری طرف ذکیہ کو بھی شوہر کا یہ فیصلہ درست لگا۔

پھر وہ لاہور چلے آئے۔ عابد چودھری نے سالوں محنت کر کے جمع کئے ہوئے سرمائے سے کاروبار شروع کیا جو جلد ہی جم گیا۔ خوشحالی پہلے سے چار گنا بڑھ گئی تھی۔

سمیرا اور سویرا کو اچھے سکولوں میں داخل کرایا گیا۔ ذکیہ بھی اس حادثے کے بعد خاصی بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک سلجھی ہوئی اور ذمہ دار خاتونِ خانہ کے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ گھر کا ماحول اس تلخ تجربے کے بعد یکسر بدل چکا تھا۔ عابد صاحب تو تھے ہی نمازی پرہیزگار..... ذکیہ کی تہجد بھی باقاعدہ اور سجدہ طویل ہونے لگا۔ بیٹیاں باپردہ ہو گئیں۔ سمیرا نے تو ماں کے کہنے پہ..... اور سویرا نے نجات کا باعث سمجھتے ہوئے پردے کو اپنا لیا۔

پرانے محلے میں ہر نظر اسے اپنا جسم چیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کی نظروں سے ڈرنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ اس نئے شہر میں آنے کے بعد انجان لوگوں سے بھی وہ گھبرانے لگی تھی۔ چھپنے لگی تھی۔ بارہ سال کی ہی عمر میں ماں نے چادر اوڑھا کے سکول بھیجا تو اسے لگا جیسے اس کے گرد ایک حصار قائم ہو گیا ہو اور اس نے اس تحفظ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

اور پھر سترھویں سال تک آتے آتے وہ اس بات سے باخبر ہو چکی تھی کہ وہ کیا کھو چکی

ہے۔اس میں اور اس کی دوسری ہم عمر لڑکیوں میں کیا فرق ہے۔محض نو برس کی عمر میں وہ نہ صرف اپنے بچپن کی معصومیت بلکہ لڑکپن کا الہڑ پن اور بے فکری.....اور جوانی کی اُمنگ.....سب کچھ گنوا چکی ہے۔وہ اس عمر میں ان تلخ حقیقتوں سے زبردستی رُوشناس کرادی گئی تھی جب دوسری لڑکیاں گڈی گڈے کا بیاہ رچا رہی ہوتی تھیں۔اسے اپنا آپ دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم تر.....بہت نیچ محسوس ہوتا تھا،اسی لئے وہ کسی کے قریب بھی نہ آسکی تھی۔سوائے بینش کے۔

☆=======☆=======☆

''اور اب تم بھی جا رہی ہو؟''

سویرا نے اسے الوداع کہہ کے آنکھیں موند لیں۔وہ جانتی تھی اب اس کمرے میں پہلے کی طرح سوائے اس کی امی کے اور کوئی نہیں آئے گا۔مگر اگلے ہی پل ایک آہٹ نے اسے آنکھیں کھولنے پہ مجبور کردیا اور اس کی آنکھیں ضرورت سے زیادہ ہی پھیل گئیں،اس پار اندر آنے والے عابد چودھری تھے۔

وہ اندر ہی اندر لرز گئی۔

''ابو.....!'' اس کے لب آہستگی سے ہلے،مگر آواز اندر ہی دم توڑ گئی۔عابد چودھری دروازے کے پاس کھڑے جیسے سوچ رہے تھے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔

سویرا اپنے باپ کی خاموشی کی عادی ہوگئی تھی۔اگرچہ یہ خاموشی.....یہ گریز.....اسے کبھی کبھار بری طرح کھٹکتا تھا لیکن وہ اس پہ حیرت زدہ ہونا چھوڑ چکی تھی۔یہ کوئی نئی بات نہیں رہی تھی،مگر آج اسے اپنے باپ کے رویئے میں کچھ غیر معمولی پن نظر آرہا تھا۔اسے خوف محسوس ہونے لگا۔زندگی میں پہلی بار وہ اپنے باپ سے ڈرنے لگی۔

بچپن میں اس نے ماں اور دادی سے سنا تھا کہ وہ اپنے ابو کی بہت لاڈلی بیٹی ہے۔مگر ہوش سنبھالنے کے بعد جب اس نے انہیں واپس پاکستان میں اپنے پاس پایا تو ہمیشہ اپنے آپ سے دور اور لاتعلق۔اسے یاد نہیں تھا کہ اس کے باپ نے کبھی اسے گود میں لیا ہو یا سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرے کہ اس کی کوئی فرمائش سنی ہو۔ایک باپ ہونے کے ناطے انہوں نے اپنے سارے فرائض پورے کئے۔اسے ہر آسائش،ہر سہولت مہیا کی۔اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کئے۔اس کے دینی رجحان کو دیکھتے ہوئے اسے قرآن حفظ کرایا۔اب ایک اچھے گھر میں بیاہ رہے تھے،پوری شان و شوکت کے ساتھ۔اس سے یہ اندازہ تو ہوتا تھا کہ انہیں سویرا سے نفرت بہرحال نہیں تھی۔یہ ڈھارس بہت تھی اس کے دل کے لئے۔

اور آج وہ یہ دلاسہ بھی خود کو نہیں دے پا رہی تھی۔

''تو کیا ہوا اگر وہ مجھ سے نفرت محسوس کرنے لگیں گے۔'' اس نے حقیقت پسندی سے سوچا۔''ٹھیک ہی تو ہے۔میں نے ان کو دیا ہی کیا ہے،سوائے ذلت اور بدنامی کے۔ان کی عمر بھر کی نمازوں کے نشان محراب کی صورت ان کی پیشانی پہ اس قدر واضح نہیں تھے جتنے کہ میری ذات کے حوالے سے ملنے والے تفکرات کے عکس.....انہیں مجھ سے تنگ آنا ہی تھا۔اگر وہ مجھے زہر دے کر مارنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں تو غلط نہیں۔''

''ابو جی!'' نہ جانے کتنے عرصے بعد اس نے انہیں مخاطب کیا۔یہ ہمت وہ بہت مشکل سے مجتمع کر پائی تھی۔اس پکار پہ بھی عابد چودھری نے نظر اٹھا کے سامنے نہ دیکھا۔

''ابو جی! آپ میرے سامنے مت آیا کریں۔حیران مت ہوں ابو جی.....! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔جتنا مشکل آپ کے لئے میرا سامنا کرنا ہے،اتنا ہی تکلیف دہ میرے لئے آپ کو یوں دیکھنا ہے۔باپ بیٹی کے سامنے سر اٹھا کے آئے تو اچھا لگتا ہے۔میں جانتی ہوں آپ کبھی میرے سامنے سر یا نظریں اٹھا کے نہیں آسکتے۔میں جانتی ہوں،میں ان بیٹیوں میں سے نہیں جن کو دیکھ کر باپ کا سینہ فخر سے چوڑا اور آنکھیں غرور سے چمک اٹھتی ہیں۔میں جانتی ہوں مجھے دیکھ کر کبھی بھی آپ کو فخر کا احساس نہیں ہوسکتا۔میں.....میں بدنصیب،اس دنیا میں آپ کا سر جھکانے آئی ہوں۔آپ مت آیا کیجئے میرے سامنے.....کم از کم آپ کو اس طرح سر تو نہیں جھکانا پڑے گا۔حرام موت مر کے گناہ گار بھی نہیں ہونا چاہتی ورنہ میں خود ہمیشہ کے لئے آپ سے دور ہو جاتی۔

''بلی!'' عابد چودھری تڑپ کر آگے بڑھے۔

''ابو جی.....کوئی بیٹی اپنے باپ کی شرمسار نظریں،ڈھلکے ہوئے شانے اور جھکا ہوا سر نہیں دیکھ سکتی۔مجھے بتایئے ابو جی! خودکشی کے علاوہ کوئی اور راستہ بتایئے جس سے میں آپ کی ذلت کا سامان نہ پیدا کرسکوں۔مجھے بتایئے ابو جی۔'' وہ بلک اٹھی۔

''بلی.....! میری بچی۔کس نے کہا ہے کہ ٹوٹ اس دنیا میں میرے لئے ذلت لے کر آئی ہے،اِدھر دیکھ.....میرا سینہ فخر سے چوڑا نہیں تو کیا ہوا،تیری محبت سے بھرا ہوا تو ہے۔میری نظریں تجھے سامنے پا کے جھک ضرور جاتی ہیں۔مگر اس احساس سے کہ میں باپ ہو کے تیرے لئے کچھ نہ کرسکا۔اپنی مجبوری،اپنی بے بسی مجھے شرمسار رکھتی ہے۔تُو نے کیا کیا ہے بھلا.....''

انہوں نے اپنی بیٹی کی شفاف پیشانی چوم لی،جس سے ایٹن کی مہک پھوٹ رہی تھی۔

☆======☆======☆

"تم کیا سمجھتی ہو، میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟"

حق نواز نے رومیصہ کو ناراضی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور کیا تمہارا خیال ہے کہ صرف میرے سمجھانے بجھانے پہ حق نواز بھائی بارات لے جانے پہ تیار ہو جائیں گے؟ ایسا وہ کبھی نہیں کریں گے۔ میں جانتا ہوں انہیں۔"

"میں انہیں نہیں جانتی۔" رومیصہ نے شانے اچکائے۔ "میں صرف تمہیں جانتی ہوں اور جتنا بھی جانتی ہوں اس کے بعد مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ تم بھی اپنے گھر والوں کا ساتھ دو گے۔"

"میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا، تم بات کو سمجھ کیوں نہیں رہیں۔" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"میں ان کا ساتھ نہیں دے رہا..... لیکن میں انہیں اپنا ہم خیال بھی نہیں بنا سکتا۔ وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ بڑے بھائی ہیں میرے، زبردستی کیسے میں ان کا نکاح پڑھوا دوں اس لڑکی کے ساتھ اور پھر انہیں امی ابو کی حمایت بھی حاصل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ امی ابو اس بات پر متفق ہیں کہ لڑکی بے چاری بے قصور ہے اور نادانستگی میں ان کی وجہ سے اس کے اور اس کے والدین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ عظمت خالہ یہی بات اکیلے میں جا کے آرام سے بتا دیتیں تو معاملہ عزت سے نمٹ جاتا۔"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں حق نواز! اس لڑکی میں نے ایک ہی جھلک دیکھی ہے۔ مگر اس کا چہرہ بھول نہیں پا رہی۔ میں اس کی ہم صنف ہونے کے ناطے اس کی اذیت کو بخوبی محسوس کر سکتی ہوں۔ بہت غلط ہوا۔ اس کے ساتھ بھی..... اور اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی۔ پرسوں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ کسی بھی طرح اس سے کم نہیں کہلایا جا سکتا جو گیارہ سال پہلے ہوا تھا۔ وہ دوبارہ مجروح ہوئی ہے حق نواز۔"

رومیصہ کے لہجے میں درد ہی درد تھا۔

"مگر اب کیا، کیا جا سکتا ہے۔"

"اچھی نہیں لگتیں تمہارے منہ سے ایسی تھکی ہوئی باتیں۔" اس نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔

"عجیب بے حس انسان ہو تم۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ تم لوگوں کی کم ظرفی کی وجہ سے ایک لڑکی کی پوری زندگی تباہ ہو گئی۔ جو بات چار لوگ جانتے تھے وہ تمہاری ایک رشتے دار خاتون نے چار سو لوگوں کے درمیان بتا دی اور یہ چار سو لوگ اب تک چار ہزار افراد تک

یہ اطلاع مع نمک مرچ کے بیان کر چکے ہوں گے۔ ذرا سوچو، اس کا قصور ہی کیا ہے۔ وہ کوئی بدکردار، بدچلن آوارہ لڑکی نہیں ہے، جس کے بارے میں کوئی انکشاف تمہارے بھائی کو مشتعل کر گیا ہو۔ ایسا ہوتا تو وہ اسے ٹھکرانے میں حق بجانب ہوتے۔ وہ ایک سیدھی سادی، شریف اور مظلوم لڑکی ہے۔ تمہارے بھائی اسے اپنا کر نہ صرف ایک مثال قائم کر سکتے تھے، بلکہ ثواب بھی کما سکتے تھے۔"

"کر سکتے تھے نا..... اب تو نہیں کر سکتے..... نہ ہی کریں گے۔ مجھے اس لڑکی کی معصومیت اور پاک دامنی پر ہرگز ہرگز کوئی شبہ نہیں۔ مجھے اس کے ساتھ ہونے والے حادثے پہ جتنا افسوس ہے اس سے زیادہ اپنے بھائی اور والدین کے بدصورت رویئے پہ شرمندگی ہے۔ میں بھی چاہتا تھا کہ شاہ نواز بھائی اپنے دل کو وسیع کر لیتے..... اس لڑکی کو عزت دے کر اپنا لیتے۔ کسی کی دعائیں ہی ملتیں ہمارے پورے خاندان کو، مگر اب..... اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا نا، میں انہیں مجبور تو نہیں کر سکتا۔"

"مجبور نہیں کر سکتے، مگر کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہتے ہو نا؟" رومیصہ نے اپنی سوالیہ نظریں اس پہ گاڑ دیں۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ حق نواز صاحب کہ یہ دعائیں آپ بھی لے سکتے ہیں، اس غریب کا گھر بسا کے۔ اسے معاشرے میں عزت دے کر۔ آپ بھی ثواب سمیٹ سکتے ہیں۔ بلکہ اپنی فیملی کی جانب سے ہونے والی اس کی تذلیل کا ازالہ بھی کر سکتے ہو۔ سینکڑوں افراد کی موجودگی میں اسے بے عزت کر دینے کی تلافی بھی کر سکتے ہو۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو رومیصہ.....!" وہ اس کا مقصد بھانپتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"کبھی تو سوچ سمجھ کے بات کیا کرو۔"

"سوچ بھی لیں گے، میں کون سا تمہیں کھڑے کھڑے سر پہ سہرا باندھنے کو کہہ رہی ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جیسے تم اپنے بھائی کو زبردستی مجبور نہیں کر سکتے، میں بھی تم پہ دباؤ نہیں ڈال سکتی، ہاں مجھے تم سے یہ امید ضرور ہے کہ تم ان کی طرح شقی القلب نہیں ہو، نہ ہی کم ظرف..... اس لئے مشورہ دے رہی ہوں کہ..... تم اس لڑکی سے شادی کر لو۔"

☆======☆======☆

"میں.....؟ میں شادی کر لوں؟"

حق نواز حیرت سے اس کے الفاظ دہرا رہا تھا۔

''اور وہ بھی سویرا سے؟''

''کیوں، کیا برائی ہے سویرا میں..... سوائے اس کے کہ وہ ایک تلخ حادثے سے گزر چکی ہے لیکن یہ نہ تو اس کی برائی ہے، نہ خامی، نہ ہی یہ اس کا قصور ہے۔''

''میں اس وقت یہ بحث نہیں کر رہا کہ اس میں کیا اچھائیاں ہیں اور کیا برائیاں۔ تم کوئی بھی حسینہ عالم بھی میرے سامنے لے آؤ گی تب بھی میرا سوال یہی ہوگا کہ کیوں؟ کیوں کروں میں اس سے شادی؟''

''بتا تو چکی ہوں کہ ازالے اور تلافی کی یہی ایک.....''

''کیسی تلافی رومیصہ.....! اور کیا گناہ سرزد ہوا ہے مجھ سے جس کا ازالہ مجھ پہ فرض ہوگیا ہے۔ مانا کہ میری فیملی نے اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ مگر میرا اس میں قطعی کوئی رول نہیں۔ نہ ہی میں اپنی ذات کے حوالے سے کوئی ندامت محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں مجھے یہ مشورہ دینے سے پہلے اتنا تو سوچنا چاہئے تھا کہ..... کہ کہیں.....''

جو بات وہ کہنے جا رہا تھا، اسے کہنے کی خواہش عرصے سے تھی۔ مگر فی الحال نہ تو موقع محل تھا اور نہ ہی اس کا موڈ ایسا تھا کہ وہ یہ بات اچھے ڈھنگ یا الفاظ میں کہہ پاتا۔ اس لئے کہتے کہتے رک گیا۔

''کہ تم..... حق نواز..... اعلیٰ تعلیم یافتہ..... ہینڈسم، اچھے خاندان کے چشم و چراغ..... مشہور صحافی اور سویرا جیسی لڑکی سے شادی کرو گے۔ جس کی رسوائی پورے شہر میں پھیل چکی ہے۔ جس کی شادی ہوتے ہوتے ٹوٹ گئی ہے اور کسی زمانے میں جس کے ساتھ گزرنے والے سانحے کی خبریں اخباروں کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ واقعی ایسا کہنے سے پہلے مجھے سوچنا چاہئے تھا۔''

رومیصہ نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''شٹ اَپ رومیصہ! جان بوجھ کے انجان مت بنو۔ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں اس لڑکی سے شادی کیوں کروں، جب کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

وہ یہ بات اتنے غصے سے اسے گھورتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ باوجود بے حد سنجیدہ ماحول کے، رومیصہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''تم اسے مذاق سمجھ رہی ہو؟''

''نہیں، جو بات تم آج کہہ رہے ہو میں پہلے سے جانتی ہوں۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے

ہوئے کہا۔ ''اور مجھے حیرت اس بات پہ نہیں کہ تم نے یہ مجھ سے آج کہا، بلکہ حیرت اس بات پہ ہے کہ اتنی دیر سے کیوں کہا؟''

''یعنی تمہیں انتظار تھا؟'' وہ خوش فہم ہوا۔

''ہاں انتظار تو تھا کہ..... دیکھو کب بلی تھیلے سے باہر آتی ہے۔ تمہارے جیسا انسان اتنے صبر اور برداشت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس پہ بھی مجھے حیرت ہے۔ نہیں، ہے نہیں، تھی۔''

اس نے خود ہی اپنے فقرے کی تصحیح کی۔ ایک انتہائی سنجیدہ مسئلہ چھیڑ کے اسے ڈسٹرب کر دینے کے بعد وہ خود اب ہلکے پھلکے موڈ میں تھی یا شاید دانستہ ایسا کر رہی تھی تاکہ اس کے مشورے کا حق نواز پر جو اثر ہوا ہے اس کے تلخ اثرات ذرا کم ہو جائیں۔ تو وہ دوبارہ اسے اس جانب ٹھنڈے دماغ سے سوچنے پہ مائل کرے۔ مگر وہ رومیصہ کے اس طرح بات پلٹنے پہ ایسا تپا کہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

''حق نواز، حق نواز..... میری بات تو سنو.....''

رومیصہ نے آواز دی مگر اس نے پلٹ کے نہ دیکھا۔

''میں تمہیں دوسرے سے الگ سمجھتی تھی حق نواز! اس لئے یہ مشورہ دے بیٹھی۔ مجھے یہ یقین کبھی نہیں تھا کہ تم میری بات مان بھی لو گے۔ صرف یہ امید تھی کہ کم از کم دھیان سے سنو گے تو سہی لیکن تمہارا اس پہ بھڑکنا..... ظاہر کرتا ہے کہ تم عام مردوں سے الگ نہیں۔''

☆=======☆=======☆

''لعنت ہے تم پہ حق نواز..... چپ رہ کے بات گنوائی، لب کھولے تو ذات.....''

حق نواز نے ایک بار پھر اسٹیئرنگ پہ مکا مارتے ہوئے خود پہ غصہ نکالا۔

''جب اتنا عرصہ دل کی بات دل میں رکھ کے عزت سے گزارا کر لیا تو اب اُگل کے ذلیل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو اب بھی نہ کہتا اگر وہ یہ بے تکی تجویز میرے سامنے نہ رکھتی۔ مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے..... جیسے وہ ہر بار میری حوصلہ شکنی کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالتی ہے اور اس بار سویرا سے شادی کا مشورہ، اس پہ یہ ناراضی الگ جتائی جا رہی ہے کہ میں بھڑکا کیوں؟ کیا وہ اتنی ہی نادان ہے جو میرے بھڑکنے کی اصل وجہ نہ جان سکے۔ میں اتنا کم ظرف نہیں کہ سویرا کے ساتھ شادی سے صرف اس کی بدنامی اور اپنی جگ ہنسائی کے خوف سے انکار کروں۔ مگر اتنا اعلیٰ ظرف بھی نہیں کہ ہمدردی اور خدا ترسی کے نام پہ اپنے دل کی اس اولین تمنا کو دبا لوں۔ کاش تم مجھے سمجھ پاؤ رومیصہ! کاش تم میرے جذبات اور میری محبت کو بھی سمجھ پاؤ۔''

☆======☆======☆

''بس خوش ہو گئے آپ، پڑ گئی کلیجے میں ٹھنڈک۔''

حمیرا نے آتے ہی اپنا بیگ ایک کونے میں پھینکا اور چلا چلا کے ماں پہ برسنے لگی۔

''کتنا کہا تھا میں نے کہ یہ ضد چھوڑ دیں۔ کیا کریں گی اس کی شادی کروا کے۔ مگر آپ نے ضرور گڑے مُردے اکھاڑنے تھے۔ میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ یہ سب ہوگا۔ کتنا وقت لگا تھا یہاں آ کر نئے سرے سے زندگی شروع کرنے میں اور آپ دونوں کی بیکار کی ضد نے ساری بنی بنائی عزت ایک بار پھر مٹی میں ملا دی۔''

وہ ماں، باپ کو الزام دیتی۔ اب صوفے پہ بیٹھ کے دونوں ہاتھوں میں سر گرائے اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ سویرا اسی کمرے میں کمبل میں سمٹی سمیرا کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے چپکے سے یہاں سے نکلنا چاہا مگر سمیرا نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے روک لیا۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھ کے رہ گئی۔ اسی بے بسی کے ساتھ جس بے بسی سے اب ذکیہ اور عابد چودھری اپنی سب سے بڑی بیٹی حمیرا کو اونچی آواز میں روتے اور ناراض ہوتے دیکھ رہے تھے۔

''آپ کو بھی سب پتا تھا، سب جانتے تھے کہ ایسا ضرور ہوگا پھر بھی باز نہیں آئے اپنی کرنے سے۔ اسی لئے تو چپ چاپ بیٹھے میری بربادی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ اتنی توفیق نہیں ہو رہی ہے کسی کو کہ مجھ سے پوچھنے کی زحمت ہی کر لیں کہ مجھ پہ آخر گزری کیا؟ کس کا ماتم کر رہی ہوں میں؟ شام کے وقت اکیلی اِدھر کیا کرنے آئی ہوں.....؟ میرے بچے اور میاں ساتھ کیوں نہیں ہیں؟''

''تم پوچھنے کا موقع دو تو میں پوچھوں۔'' ذکیہ نے ہمت کر کے کہنے کی کوشش کی۔ ''ہوا کیا ہے؟''

''کیا ہونا ہے..... وہی ہوا ہے جو نصیبوں میں لکھا گیا ہے۔ لوگ برا کر کے پاتے ہیں، میں تو پتہ نہیں کس کے برا کرنے کا عذاب سہہ رہی ہوں۔ آخر میں نے کیا کیا تھا جو میری پوری زندگی برباد ہو گئی، صرف اور صرف اس بدذات کی وجہ سے۔'' اس نے روتے ہوئے سویرا کی جانب اشارہ کیا۔

سویرا نے ایک بار پھر منظر سے غائب ہونے کی کوشش کی۔ مگر سمیرا کی گرفت اس کے ہاتھ پہ اب بھی مضبوط تھی۔

''یہ کھا گئی ہے سارے خاندان کی خوشیاں..... یہ ڈائن، یہ پگھل پیری..... اچھا ہوتا اگر امی اسے پیدا ہوتے ہی مار ڈالتیں۔''

''چپ کر جاؤ حمیرا.....'' عابد چودھری نے پہلی بار زبان کھولی مگر ان کی آواز میں گرج نہ تھی۔ حمیرا اس کمزوری تنبیہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے مسلسل زہر اُگلتی رہی۔

''یا کم از کم تب تو اسے زہر دے دیتا یا گلا گھونٹ دیتا تھا، جب اس نے ہمارے نصیبوں میں کالک ملی تھی۔ ناسور کی طرح اسے پالتے رہے آپ دونوں۔ اس کی وجہ سے ہم سب کو کیا کیا نہ دیکھنا پڑا پھر بھی یہ سب کی لاڈو بنی رہی اور تو اور اس بدذات کا گھر بسانے کی کوشش میں آپ نے میرا بسا بسایا گھر اجاڑ ڈالا۔''

وہ یوں تڑپ کے آگے بڑھی جیسے سویرا پہ پل پڑے گی۔ ذکیہ نے اٹھ کے اس کا بازو تھام کے اسے کمبل میں دبکی سویرا کی جانب جانے سے روکا تھا۔

سویرا کانپتے ہوئے سمیرا کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کے آنسو سمیرا کی پشت کو بھگو رہے تھے۔

''ہوش کر حمیرا۔'' ذکیہ نے اسے جھنجھوڑا۔

''اب بھی میں ہی ہوش کروں؟'' وہ پاگلوں کی طرح اپنا چہرہ پیٹنے لگی۔

''میرا گھر اجڑ رہا ہے، میرے میاں نے مجھے ایک ہزار طعنے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔ میرے بچے..... اب میں اپنی اولاد کی شکل تک دیکھنے کو ترسوں گی۔ وہ اپنی اولاد کا تعلق اس گھر سے رکھنا ہی نہیں چاہتا، جس پہ بدنامی کے اتنے سائے ہیں، ایک بار پہلے اس کی وجہ سے میرے بچپن کی منگنی ٹوٹی۔ جو میری شادی کی عمر تھی وہ اس کی وجہ سے منہ چھپاتے چھپاتے گزر گئی۔ تیس سال کی عمر میں خاوند نصیب ہوا تو عمر سے دگنا، میں نے آپ لوگوں کی عزت رکھنے کی خاطر اس بوڑھے کے ساتھ بھی صبر کے ساتھ نباہ کیا۔ اپنے سسرال والوں کا ہر ظلم بھی سہا، لیکن مجھے اپنی اتنی قربانیوں کا کیا صلہ ملا؟ اس منحوس کی وجہ سے میرے پانچ سال کی گھر بستی، میرے بچے سب کچھ میرے ہاتھوں سے چلا گیا۔ میں ایک بار پھر خالی ہاتھ ہو گئی ہوں۔ اب تو میں اسے بالکل بھی نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔''

بولتے بولتے اس نے ایک دم خود کو ماں کی گرفت سے آزاد کرایا اور سویرا پہ پل پڑی۔

یہ حملہ اتنا اچانک تھا اور شدید تھا کہ بالکل قریب بیٹھی سمیرا بھی اسے ان وحشیانہ دھموکوں سے فوراً نہ بچا سکی۔

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے باجی!'' سمیرا نے حمیرا کی گرفت سے اس کے بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اس بے چاری کا کیا قصور ہے اس میں۔ وہ تو خود سالوں سے.....'' کہتے کہتے اس

نے پلٹ کے باپ کی جانب دیکھا جیسے ابھی ابھی ان کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ عابد چودھری نڈھال قدموں سے اپنے شکستہ و شرمندہ وجود کو گھسیٹتے باہر لے گئے۔

کمرے کے ہولناک سکوت میں حمیرا کی بپھری وحشیانہ سانسوں اور سویرا کی دبی دبی سسکیوں کی آواز اُبھر رہی تھی۔ سمیرا نے ایک بار پھر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ سویرا نے روئی روئی سرخ آنکھیں اٹھا کے ذکیہ کی جانب دیکھا۔ وہ نظریں چرا گئیں۔ جہاں ایک جانب اُسے گلے سے لگا کر تسلی دینے کو دل چاہ رہا تھا وہیں دوسری جانب حمیرا کی ناراضی سے بھی خوفزدہ تھیں کہ کہیں بڑی بیٹی مزید نہ بپھر جائے۔

اس کے برعکس سمیرا نے کبھی اس معاملے میں غیر جانب داری سے کام نہ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے حمیرا کے عتاب کے سامنے ڈھال بنتی آئی تھی۔ جب آصف کی ماں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتے ہوئے ان کی پہنائی ہوئی انگوٹھی ذکیہ کی گود میں پھینکی تھی اور بے دردی کے ساتھ بھتیجی کی انگلی سے منگنی کی انگوٹھی یہ کہتے ہوئے نوچی تھی کہ۔

''میرا لڑکا ہی رہ گیا ہے بدنامی کی گٹھڑی اٹھانے کو۔ رشتے داری الگ چیز، کوکھ کے جنے سے آگے کچھ نہیں ہوتا اماں! جیسے تمہیں آج اپنے بیٹے کی بربادی کا غم ستا رہا ہے، ایسے ہی میں بھی اپنے بیٹے کو رونا نہیں چاہتی۔ یار دوست نکے نکے کی باتیں سنائیں گے اسے۔ سالا ہے تو وہ قاتل..... نہ اماں! میرا بیٹا اتنا فالتو نہیں جو تم اپنی آوارہ پوتیوں پہ قربان کرتی پھرو۔''

''خدا کا خوف کرو بانو! مانا کہ تیری کوئی لڑکی نہیں مگر یہ بھی تیرے ہی بھائی کی بچیاں ہیں۔ یوں منہ بھر کے انہیں آوارہ کہنے سے پہلے کچھ تو سوچ۔''

دادی تو صدمے کے مارے قوتِ گویائی ہی کھو بیٹھی تھی، البتہ ذکیہ نند پہ الٹ پڑی۔ سویرا اب تک ہسپتال میں تھی اور سمیرا فی الحال صورتِ حال کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی کم سنی اس معاملے کو کھل کے واضح نہ ہونے دے رہی تھی ہاں مگر بھائی کے ہاتھوں ایک لڑکے کا قتل ہو جانا، محلے داروں کی چہ مگوئیوں، ماں اور دادی کا ماتم اور اب پھوپھی کا آ کر منگنی توڑنا اسے بتا رہا تھا کہ اس کی چھوٹی سی بہن بلی کے ساتھ کچھ بہت غلط، بہت سنگین ہو چکا ہے۔ وہ ٹکر ٹکر پھوپھی کا پتھریلا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے ذکیہ! تُو خود ننگی ننگی لور لور پھرنے والی عورت۔ تیری بیٹیاں کون سا دودھ کی دھلی ہوں گی۔ اس شہر، اس محلے میں بہتری بچیاں اِدھر اُدھر آتی جاتی ہیں۔ سودا سلفہ بھی لاتی ہیں اور کسی کی بچی پہ تو کبھی کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ آخر تیری بلی میں کیا نظر آیا۔''

''دفع ہو جا بانو..... دفع ہو جا یہاں سے اپنی کالی زبان اور گندا دماغ لے کر۔'' بالآخر

بوڑھی دادی چلا اٹھی تھی اور وہ شاید اس کی آخری چیخ تھی۔

ماں کی تدفین کے لئے آئے عابد چودھری کو جب ساری صورتِ حال کا پتہ چلا تب گھر میں ایک الگ ہی قیامت اٹھی تھی۔ جسے اس نے کبھی کسی سے دبتے نہ دیکھا تھا، وہ بالکل گم صم ہو گئی تھیں۔ سر جھکائے، چپ چاپ آنسو بہاتے وہ ہر الزام سنتی رہی تھیں اور وہ..... وہ جس کی وجہ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا تھا۔ اس پہ توجہ دینے کا وقت کسی کے پاس نہیں تھا۔ ایسے میں صرف سمیرا ہی تو تھی جو اس کے ساتھ لپٹ کر سوتی تھی تاکہ وہ راتوں کو چیخیں نہ مارے۔ وہی تھی جو اس کے منہ میں نوالے بنا بنا کے ڈالتی تھی، ورنہ اس حیران پریشان خوف زدہ سی بچی کو نہ کھانے کا ہوش تھا، نہ پہننے اوڑھنے کا۔ حالانکہ سمیرا کی اپنی عمر کیا تھی، محض گیارہ بارہ سال۔ ہاں مگر وہ اپنے سے ڈھائی سال چھوٹی بہن سے بے حد محبت کرتی تھی۔ یہ محبت، حمیرا کے سنگدلانہ رویئے کے ردِعمل کے طور پر بھی زیادہ اُبھر کے سامنے آئی تھی کہ اپنے بچپن کی منگنی ٹوٹ جانے کی ذمہ دار وہ بلی کو ہی ٹھہراتی تھی اور وقتاً فوقتاً اس بات کی بھڑاس اس پہ نکالتی رہتی تھی۔

لاہور شفٹ ہونے کے بعد نسبتاً بہتر ماحول میسر آنے اور اچھے سکول میں داخل ہونے کے بعد سمیرا کی عادات میں مزید تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ محض بلی کا خیال رکھنا ہی کافی نہیں سمجھتی تھی بلکہ اسے زندگی کی طرف لانے کی اپنی عمر اور سمجھ کے مطابق کوشش بھی کرنے لگی تھی لیکن حمیرا کو اس کا یوں بلی کو دوبارہ زندگی کی طرف لانا بالکل پسند نہ آیا تھا۔

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تیرا اس کے ساتھ بیٹھنا۔ یہ تجھے بھی خراب کر دے گی۔'' اس نے سمیرا کو کھینچ کر اٹھانا چاہا۔

''اگر تم نے دوبارہ بلی کے بارے میں ایسا کہا نا باجی! تو میں امی کو جا کے بتا دوں گی۔ وہ بے چاری تمہیں کیا کہتی ہے۔ تمہیں اچھی نہیں لگتی تو نہ سہی، مت بات کرو اس سے۔ مجھے روکنے کی ضرورت نہیں۔''

یہ جھڑپ آئے دن کا معمول تھی۔ یہاں تک کہ سویرا، سمیرا کے ساتھ سکول جانے لگی۔ نیا ماحول..... نئے لوگ..... نئے دوست..... بلی آہستہ آہستہ کہیں بہت پیچھے رہ گئی۔ اب صرف سویرا عابد تھی جو اگر چہ بہت زیادہ بااعتماد، بہت زیادہ مضبوط شخصیت نہ تھی لیکن اتنی سہمی ہوئی، اتنی کانپتی ہوئی بھی نہ تھی جتنی وہ نو دس سال کی بلی۔ اس بات نے سمیرا کو بھی بہت حوصلہ دیا۔ اس کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی تھی کہ سویرا اس کے سہارے کے بغیر بھی جینا سیکھ لے اور رفتہ رفتہ یہ ہو رہا تھا، یہاں تک کہ اس کی شادی کا ذکر ہونے لگا۔ اس موقع پر وہ ایک بار پھر گھبرائی گھبرائی نظر آنے لگی۔ یہاں بھی سمیرا نے اس کی مدد کی۔

''تمہیں ایک نارمل زندگی جینے کا حق ہے، تم کسی سے کم نہیں بلکہ میں تو کہتی ہوں تم مجھ سے اور باجی سے بھی لاکھ درجے بہتر ہو۔ نہ صرف شکل وصورت کے لحاظ سے بلکہ کردار وسیرت، تعلیم وذہانت اور سلیقہ اور گھر ہستی کے لحاظ سے بھی۔ الحمدللہ تمہیں دین کی بھی سمجھ ہے اور دنیا کا بھی شعور ہے۔ تم پنج وقتہ نمازی ہو۔ قرآن کی روح کو سمجھتی ہو۔ مجھ سے زیادہ بہتر اس بات کو جانتی ہوگی کہ اللہ کسی کو بھی اس کے جائز حق سے محروم نہیں رکھتا۔ زندگی کی خوشیوں پہ تمہارا بھی حق ہے۔ انہیں بے جھجک وصول کرو اور اپنے دل میں کسی قسم کے وسوسوں کو جگہ مت دو۔''

لیکن سویرا اس ہدایت پہ مکمل طور پہ عمل نہ کرسکی۔ اس نے ماں باپ کی مرضی کے آگے سر ضرور جھکا دیا تھا لیکن وہ ان وسوسوں کو دل سے دور نہ کرسکی جو منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑے تھے اور وقت نے ان بدترین اندیشوں کو سچ کر دکھایا۔ ایک بار پھر اس کی زندگی ناقابل برداشت ذلت کی زد میں تھی۔ ایک بار پھر اس کی ماں کا سر جھکا ہوا تھا۔ ایک بار پھر باپ اندھیرے کمرے میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی بہن اس پہ اپنے اجڑنے کا الزام عائد کررہی تھی اور اس بار سمیرا سوائے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچنے کے اور کچھ نہ کرسکی تھی۔

پہلے کی طرح تسلی کے دو بول..... حوصلے کی کوئی کنک..... امید کی کوئی کرن اس کے پاس نہ تھی۔

☆======☆======☆

''کھانا لگاؤں بیٹا!'' حق نواز گھر آیا تو تسنیم بیگم نے پوچھا اور پھر اس کے انکار کے بعد گہری سانس بھر کے رہ گئیں۔

''پتا نہیں سب کی بھوک کو کیا ہوگیا ہے۔ فوزیہ بھی صبح بغیر ناشتے کے اپنے گھر لوٹی ہے۔ تمہارے ابا ہیں تو علاوہ دو کپ چائے کے اور کچھ معدے میں نہیں اُترا۔ شاہ نواز بھی کھانے سے منع کررہا ہے۔ لو دیکھو، چار بج رہے ہیں دوپہر کے اور ابھی تک ہمارے گھر میں کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ میں پوچھتی ہوں ایسی بھی کیا آفت ٹوٹ پڑی۔'' وہ کچھ ناراض ناراض سی بولیں۔

''ٹھیک ہے اچھی بھلی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ کیا مجھے افسوس نہیں اس بات کا میں ماں ہوں، میرے ارمان بھی تو پورے ہونے سے رہ گئے لیکن کیا اب اس کا ماتم عمر بھر منایا جائے گا۔ مرد ذات ہے، آج نہیں تو نہ سہی۔ کل دوجی جگہ رشتہ ہوجائے گا، اسی دھوم دھام سے بارات نکال لے جائیں۔ اب چھوڑو بھی اس بات کا پیچھا۔''

''ہاں وہ تو مرد ذات ہے، آج نہیں تو کل دوجی جگہ رشتہ ہوجائے گا اور دھوم دھام سے بارات بھی جائے گی مگر تسنیم بیگم! رہ رہ کے اس بچی کا دھیان آتا ہے جس کی اگلے دن بارات آنی تھی مگر.....'' رب نواز نے دکھی لہجے میں کہا۔

''ہاں ابا جی! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ ہم لوگوں پہ اس واقعہ کے اتنے دیرپا اور بدترین اثرات نہیں ہوسکتے۔ اس کے باوجود ہم اسے بھلا نہیں پارہے۔ ہمارے گھر کے ماحول سے افسردگی اور دلوں سے رنج نہیں جارہا تو اس گھر میں اس وقت کیا ماحول ہوگا۔ وہ لڑکی..... اس کے ماں باپ..... اس کے بہن بھائی.....''

''تو یہ سب کرنے سے پہلے انہیں سوچنا چاہئے تھا۔ ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم کیوں مجرم بنیں اپنی نظروں میں؟'' تسنیم بیگم نے حق نواز کی بات کاٹ دی۔

''قصور تو ان لوگوں کا بھی نہیں تھا امی! عظمت خالہ نے بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا تماشہ کھڑا کردیا۔''

''تم تو چپ رہو۔ زیادہ انقلابی بننے کی ضرورت نہیں۔ قصور کیسے نہیں ہے ان کا۔ اگر اللہ نے ان کا پردہ رکھ لیا تھا تو کیا ضرورت تھی ایک بار پھر اپنا اشتہار لگوانے کی۔ ''داغی'' لڑکی کی شادی کرنا تو دھوکا دینا ہوتا ہے۔ عظمت بی بی نے ہمیں دھوکا کھانے سے بچایا ہے، کچھ غلط نہیں کیا۔''

''شاہ نواز! تم کیوں خاموش ہو، کچھ بولو گے نہیں۔'' حق نواز نے یہ ساری گفتگو ایک گہری چپ کے ساتھ سنتے ہوئے اپنے بھائی سے پوچھا۔

''کیا تمہارے خیال میں عظمت خالہ کا طرز عمل درست تھا؟''

''پتا نہیں..... شاید..... نہیں۔ انہیں اکیلے میں ہمیں یہ بات بتا دینی چاہئے تھی۔''

''تب..... تب تم کیا کرتے؟'' حق نواز نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہم لوگ اتنا تماشا کھڑا نہ ہونے دیتے اور خاموشی سے واپس آجاتے۔ دنیا کے سامنے بہانا بنایا جاسکتا تھا، ان کی بھی عزت رہ جاتی، ہماری بھی۔''

اس جواب پہ حق نواز کا سارا اشتیاق دھرا کا دھرا رہ گیا۔

''یہی تو میں کہہ رہا تھا۔'' رب نواز نے تائید کی۔ ''دل پہ اس بات کا تو بوجھ ہے کہ ایک مظلوم بچی کا عیب ہماری وجہ سے ساری دنیا پہ کھل گیا۔ یہ عورتیں ہوتی ہی جلد باز ہیں۔''

''بس..... بس یہی ایک بوجھ ہے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں باری باری دونوں کے متاسف چہرے دیکھے۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نہ تو اس لڑکی کو بقول امی کے ''داغی'' مانتا ہوں، نہ ہی مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ اس کے ساتھ گزرنے والا حادثہ اس کا عیب ہے اور مجھے آپ دونوں کی اس نرم دلی، اس ہمدردی اور خدا ترسی نے بھی رتی بھر متاثر نہیں کیا۔ اگر آپ دونوں کے دل پہ کوئی بوجھ ہے بھی تو اصل میں آپ اس بوجھ کو سمجھ نہیں پارہے۔ یہ بوجھ تاسف میں سر ہلا کے اور اس لڑکی اور اس کے گھر والوں سے ہمدردی جتا کے یا عظمت خالہ کے سر پہ سارا الزام ڈال کے ہلکا نہیں ہوسکتا۔ اس بوجھ کو ہٹانے کے لئے آپ کو حقیقی معنوں میں کوئی جرأت مندانہ قدم اٹھانا ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔'' شاہ نواز کھڑا ہوگیا۔ اس کے انداز سے اضطراب ہویدا تھا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ایسی باتیں میں فلموں اور ناولوں تک میں پڑھنا پسند نہیں کرتا، اس لئے مجھ سے یہ امید مت رکھنا۔''

''وہ لوگ اور ہوتے ہیں میرے بھائی! جن سے کوئی امیدیں رکھتا ہے۔'' شاہ نواز کے کورے جواب پر وہ تلخ ہوگیا۔

''چلو چھوڑو یہ باتیں، بلاوجہ بھائی بھائی کیوں الجھتے ہو۔'' تسنیم بیگم اپنے چھوٹے بیٹے کی مزاج آشنا تھیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کے اتار چڑھاؤ میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کر کے ٹھٹک گئیں اور موضوع بدلنا چاہا۔

''اُلجھن ہی تو ختم کررہا ہوں، اباجی! میں اس لڑکی سے شادی کرنے پہ تیار ہوں۔'' وہ خود نہیں جانتا تھا کہ اس نے یہ فیصلہ کب اور کیسے کیا یا پھر کرنے سے پہلے ہی سنا ڈالا۔ جتنا باقی سب اس اچانک دھماکے پر حیران تھے، اتنا ہی ششدر وہ بھی تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل وہ اسی مسئلے پہ تو رومیصہ سے ناراض ہوکے آیا تھا۔ راستے بھر دل ہی دل میں اس سے گلے شکوے کرتا رہا تھا کہ کیا سوچ کے اس نے یہ تجویز اس کے سامنے رکھی اور اب وہ خود ہی.....

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے حق نواز!'' شاہ نواز باہر نکلتے نکلتے پلٹا تھا۔

''بیٹا! بات سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔'' رب نواز جو کچھ دیر قبل ندامت کا اظہار کررہے تھے، اب ان کے چہرے سے ناگواری واضح تھی۔

یہ وہ بھی جانتا تھا کہ وہ یہ بات بغیر سوچے سمجھے کہہ گیا ہے مگر عجب واقعہ تو یہ تھا کہ بہت سی سوچی سمجھی باتوں کے برعکس یہ بات کہہ دینے کے بعد وہ خود کو بہت مطمئن محسوس کررہا تھا۔ پچھلے دو تین دنوں سے ایک بے نام سی خلش نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اب وہ خلش کہیں نہیں تھی۔

''جب سے یہ اس اخبار کی نوکری کرنے لگا ہے، ایسی ہی الٹی سیدھی بکواس کرتا رہتا ہے۔ آپ تو جی سب سے پہلے اس کی یہ نوکری ختم کرائیں اور میں اتارتی ہوں اس کے سر سے یہ شادی والا بھوت۔'' وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بڑبڑیں۔

''میں اس کی ساری چال سمجھ گئی ہوں۔ اصل میں تو یہ شادی کرنا چاہتا ہے اپنے ساتھ دفتر میں نوکری کرنے والی اس مرد مار عورت سے جس کی کبھی تصویریں اخبار میں چھپی ہوتی ہیں تو کبھی ٹی وی پہ مردوں کے درمیان بیٹھ کر تقریریں کررہی ہوتی ہے۔ اسے پتہ ہے نا وہاں میں نے مرے کے بھی ہاں نہیں کرنی، اس لئے دوسرا پتہ پھینک رہا ہے۔ ایسی جگہ شادی کرنے کی دھمکی دے رہا ہے کہ میں مجبور ہوکے خود کہہ دوں کہ نہ بیٹا! یہاں کا نام نہ لینا، اس سے اچھا ہے میں تمہاری شادی تمہاری پسند کی جگہ پہ کرادیتی ہوں مگر اس غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں ان بیوقوف ماؤں میں سے نہیں ہوں جو ایسی چالوں میں آکر بلیک میل ہوجاتی ہوں گی۔''

''میرے خدا.....'' وہ ماں کو اتنی دور کی کوڑی لانے پہ حیران رہ گیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''ایسی ہی بات ہے۔ کان کھول کر سن لو، نہ میں تمہاری شادی اس حرافہ سے ہونے دوں گی جو مردوں کے بھی کان کترتی ہے اور نہ وہاں، جدھر سے ہم ایک بار پہلے ذلیل ہوکے آئے ہیں۔''

''اپنے خیال کی تصحیح کرلیجئے۔ آپ ذلیل ہوکے نہیں بلکہ ذلیل کرکے آئی ہیں اور میں اس غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میں سے کوئی میرا ساتھ دے گا تو وہ مجھ پہ احسان نہیں کرے گا بلکہ اپنے جرم کا کفارہ ہی ادا کرے گا اور جو ساتھ نہیں دے گا، وہ یہ مت سمجھے کہ اس کے ایسا کرنے سے میری ہمت کمزور پڑ جائے گی۔'' وہ واضح الفاظ میں کہتا وہاں سے نکل گیا۔

تسنیم بیگم دیر تک غصے سے کھولتی بڑبڑاتیں تو کبھی بلند آواز میں سویرا کو کوسنے لگتیں۔ کبھی رومیصہ ان کے عتاب کا نشانہ بنتی۔ رب نواز انہیں خاموش کراتے ہوئے یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ یہ سب حق نواز کی وقتی جذباتیت ہے اور وہ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں کرے گا جس سے اس کے ماں باپ کو ٹھیس پہنچے۔ ان دونوں سے الگ..... شاہ نواز بہت خاموش کھڑا تھا مگر اس کا چہرہ ہر پل رنگ بدل رہا تھا۔

کبھی وہاں خوف نظر آتا..... کبھی تپش..... کبھی غم اور کبھی بے بسی۔

☆======☆======☆

''یہ تو ایک بہت معمولی واقعہ ہے رومیصہ! حیرت ہے تمہارے جیسی لڑکی جو عملی صحافت میں اتنے عرصے سے ہے، وہ اس واقعے سے اتنی متاثر نظر آرہی ہے۔''

فرخندہ لودھی نے اسے اتنا ڈسٹرب دیکھ کر کہا۔ رومیصہ شا کی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''آپ اسے معمولی واقعہ کہہ رہی ہیں فرخندہ! ایک لڑکی کے لئے وقت سے پہلے آگہی اور وہ بھی اس بے درد انداز میں حاصل ہونا عذاب نہیں۔''

''نہیں یہ تو بہت بڑی بات ہے معمولی بات تو وہ بھی نہیں ہوتی جب کوئی بدقماش لفنگا قریب سے گزرتے ہوئے بدتمیزی سے چھو کر گزرتا ہے۔''

''آپ اس سلسلے میں کچھ کرتی کیوں نہیں؟''

''جس حد تک ہو سکتا ہے میں اور میرے ساتھی کرتے ہیں مگر اس کے لئے ہمیں والدین اور اساتذہ کا تعاون درکار ہے جو بدقسمتی سے ہمیں میسر نہیں۔ میں نے پچھلے دنوں ایک ٹیچرز ورکشاپ میں لیکچر کے دوران یہ تجویز پیش کی تھی کہ ٹیچرز کو پرائمری لیول تک کے بچوں کو مناسب الفاظ اور دوستانہ انداز میں یہ بتانا چاہئے کہ انہیں اجنبی لوگوں سے کس حد تک گریز برتنا چاہئے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے جاننے والے لوگ بھی اگر زیادہ بے تکلفی دکھاتے ہیں تو انہیں مزاحمت کرنی چاہئے، اپنے والدین کو بتانا چاہئے لیکن میری اس بات کی پُرزور مخالفت ہوئی۔ خاص طور پہ سکولوں کے مالکان کا یہ کہنا تھا کہ بچوں کے والدین اس ''سیکس ایجوکیشن'' پہ اعتراض کر سکتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ کیا اسے ''سیکس ایجوکیشن'' کے ڈمرے میں لا کر قابلِ اعتراض ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس طرح تو سکول لیول تک سائنس کے مضامین میں سے بیالوجی کو ختم کر دینا چاہئے اور گھروں میں ٹی وی، کیبل اور انٹرنیٹ کے ذریعے وہ اپنے بچوں کو جس قسم کی ایجوکیشن دے رہے ہیں وہ کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے رومیصہ بی بی! کہ بچوں سے زیادہ ان کے والدین کو شعور دینے کی ضرورت ہے۔ اس معاشرے میں بچوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات میں نوے فیصد ذمہ داران کے والدین ہوتے ہیں۔ ان کا اپنے رشتے داروں پہ حد سے زیادہ اعتماد کبھی یہ دن دکھاتا ہے تو کبھی اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف جا کے بڑھتے ہوئے بچوں کو ''معصوم اور بے ضرر'' سمجھنا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے پندرہ سولہ سال کے بھانجے بھتیجے ان کے بچوں کو ننھا بہن بھائی سمجھنے کے علاوہ کوئی اور خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں اور اس طرح بہت سے بچے کزنز کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ کبھی والدین کی لاپرواہی یہ دن دکھاتی ہے۔ بچے دن کا بیشتر حصہ کہاں گزارتے ہیں، کس کے ساتھ رہتے ہیں، کیوں رہتے ہیں، یہ جاننے کی زحمت تک نہیں کی جاتی۔''

''اوہ میرے خدا!'' رومیصہ نے جھرجھری لی۔ صحافی ہونے کے ناطے یہ خبریں اس کے لئے معمول کا حصہ تھیں۔ اب تو ہر چھوٹے بڑے شہر میں آئے دن ایسے واقعہ کی خبر آتی رہتی تھی

مگر ایک عورت ہونے کے ناطے وہ ہر بار اپنے دل کو کانپ اٹھنے سے روک نہیں پاتی تھی۔

''نہیں رومیصہ! یہ صرف نچلے طبقے کا ہی المیہ نہیں، یہ درست ہے کہ جرائم کی شرح نسبتاً اس طبقے میں زیادہ ہے۔ نشہ آور اشیاء کا استعمال بھی زیادہ نہیں ہوتا ہے مگر بچوں کا استحصال..... یہ واحد مسئلہ ہے جو ہر طبقے میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ ہائی فائی اپر کلاس سے لے کر مڈل اور لوئر کلاس تک بچے ہر جگہ پس رہے ہیں۔ لوئر کلاس میں خاص طور پہ کچی آبادیوں اور جھونپڑی کے رہنے والوں میں کم عمر بچوں کو ان کی تشنہ آرزوئیں ایک چاکلیٹ، ایک لالی پاپ یا دو تین روپے کے لالچ میں نشے کے عادی اور ہوس کے پجاریوں کے تعفن زدہ کواٹرز اور جھونپڑیوں تک لے جاتی ہے تو مڈل کلاس میں خاص طور پہ جوائنٹ فیملی سسٹم میں ماؤں کی بے توجہی انہیں برباد کر ڈالتی ہے۔ کام کا بوجھ اور فرائض کی زیادتی انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ بچوں کو رشتے کے بھائیوں، چچاؤں، پھوپھاؤں اور خالوؤں کے سپرد کر دیں۔ اب اگر گھر میں نانیاں دادیاں موجود ہوں تو بچت ہو جاتی ہے، ورنہ زیادہ تر میڈیا کی کرم نوازی کے باعث وقت سے پہلے جوان ہو جانے والے کزنز خود پہ قابو نہیں رکھ پاتے اور بے چارے معصوم بچے اپنے ہی گھر میں لٹ جاتے ہیں۔ اپر کلاس میں یہ کام ملازموں اور ڈرائیوروں نے سنبھالا ہوا ہے۔ ماں باپ دونوں جاب کرتے ہیں یا ماں بے حد سوشل ہے، گھر میں کوئی بزرگ نہیں ہے، بچے دن کا بیشتر حصہ گھر پہ اکیلے ملازم کے ساتھ گزارتے ہیں۔ وہاں ان واقعات کا ہونا معمول کی بات ہے۔ باپ کروڑوں کی ڈیل کرتا اور ماں تقریبات کے رہن کاٹتی رہ جاتی ہے اور بند کمروں میں بچوں کی معصومیت تار تار ہوتی رہتی ہے۔''

''اس فیلڈ میں آنے کے بعد میں نے اکثر سوچا ہے فرخندہ! کہ میں حیران ہونا چھوڑ دوں مگر..... مگر میں ایسا نہیں کر پاتی۔''

''حیران ہونا کبھی مت چھوڑنا رومیصہ! جو لوگ حیران ہونا ترک کر دیتے ہیں، ان پہ بڑے سے بڑا، سنگین سے سنگین تر واقعہ بھی اثر نہیں کرتا۔ جب دل پہ کوئی چیز اثر نہیں کرے گی تو دل، دل کب رہے گا، اس لئے حیران ہوتی رہنا۔ حیران ہو گی تو پریشان بھی ہو گی۔ پریشان ہو گی تو کسی کے لئے کچھ کرنے کی خواہش بھی پیدا ہو گی۔'' فرخندہ نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا۔

☆======☆======☆

اس نے تیسری بار رومیصہ کی کال ڈس کنیکٹ کی تھی۔ وہ اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے کل سے آفس بھی نہیں گیا تھا۔

''کیا کروں گا میں تم سے مل کے؟ کیا کہوں گا تمہیں کہ تمہارے جس مشورے پہ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور میں تمہیں ہزار باتیں سناتا وہاں سے اٹھ آیا تھا، یہ اعلان کر آیا تھا کہ میں.....حق نواز.....رومیصہ نثار کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، چند ہی گھنٹے بعد میں اپنے گھر میں ایک اور اعلان کر دیتا ہوں، سویرا عابد سے شادی کرنے کا اعلان.....کیسے بتاؤں اسے اور بھلا اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟ کیا وہ خوش ہوگی کہ میں نے اس کی بات مان لی یا پھر وہ حیران ہوگی کہ میں نے یہ بات کیسے مان لی یا پھر.....یا پھر دکھی ہوگی کہ میں نے یہ بات کیوں مان لی۔ اگر میں اس کے کہنے پہ فوراً یہ بات مان جاتا، تب شاید وہ خوش ہی ہوتی لیکن اس سے وہ سب کہہ دینے کے بعد، اس پہ اپنے سارے جذبے آشکارا کر دینے کے بعد اب میرا اتنی جلدی کسی اور سے شادی کا فیصلہ کر لینا کیا اسے دکھی نہیں کرے گا۔''

یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنا دل ٹٹولنا چاہا کہ کیا وہ دکھی ہے اپنے اس فیصلے پہ۔

دکھ کے بجائے ایک ہلکی سی کسک اور میٹھا سا درد چھایا ہوا محسوس ہوا۔ دل کا وہ کونا جہاں اس نے بہت دنوں سے ایک خواب سینت سینت کر رکھا ہوا تھا، بہت اجڑا اجڑا لگ رہا تھا مگر باقی کے حصے پہ اطمینان کا راج تھا۔ اسے اپنی جلد بازی پہ افسوس نہیں تھا، اسے اپنے اٹل فیصلے کے بے دھڑک اظہار پہ پچھتاوا بھی نہیں تھا، اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس پہ اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا یا اس کی محبت بے وفائی کا الزام عائد کرتی۔ حتیٰ کہ اسے تو یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ رومیصہ یہ سب جاننے کے بعد اس سے دور ہو جائے گی۔ وہ جانتا تھا اس کے اس فیصلے پہ سب سے زیادہ ہمت بندھانے والی وہی ہوگی۔ اس کے باوجود اس کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔

''مجھے تم سے ایک بے حد ضروری بات کرنی ہے حق نواز!'' شاہ نواز نے اندر آ کر دروازہ لاک کرتے ہوئے پوچھا۔

حق نواز نے اسے غور سے دیکھا۔ بڑھی ہوئی شیو، رت جگے کا اشتہار بنی آنکھیں اور بے ربط لہجہ۔ اس نے اپنا سیل فون آف کر کے بیڈ پہ پھینکا اور اس کی بات سننے کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے کیا کہنا تھا۔

''تم نے گھر میں کیا فساد کھڑا کر رکھا ہے۔ ختم کرو یہ تماشا۔''

''محض تمہارے کہنے پہ میں کچھ بھی ختم نہیں کر سکتا۔ کیا میرے کہنے پہ تم دوبارہ سہرا لگا کے نکاح کرنے چلو گے؟ نہیں نا۔ تو میں تمہارے کہنے پہ کیوں اپنا فیصلہ بدلوں؟''

''تم بیکار کی ضد کر رہے ہو، جانتے بھی ہو کہ اس سے ہمارے خاندان کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے والا ہے۔''

''میں اپنے خاندان اور اپنے خاندان کی آنے والی نسلوں کو ایک ناقابلِ تلافی نقصان سے بچانا چاہ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا ہماری آنے والی نسلیں کسی بددعا کے اثر میں ہوں۔''

شاہ نواز خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں۔ وہ ڈھے جانے والے انداز میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

''بددعا.....؟ مگر میں نے.....میں نے کچھ نہیں کیا اور ہم سب.....میرا مطلب ہے ہمارے خاندان کا کیا قصور ہے؟''

''تم نے کیسے کچھ نہیں کیا شاہ نواز! تم مرد ہو، خود مختار ہو، سب کچھ تمہارے ہاتھ میں تھا مگر تم روایات کے آگے بے بس ہو گئے۔ کیا یہ تمہارا قصور نہیں ہے؟ کیا تم نے بددعا لینے والا کام نہیں کیا؟ کم از کم میں اتنی آسانی سے اس معاملے سے الگ نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن تم.....حق نواز بات کو سمجھو، اس سے شادی نہیں کر سکتے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''تھوڑی بہت واقفیت اپنے دین سے مجھے بھی ہے اور میرے محدود علم کے مطابق کسی ایسی لڑکی سے نکاح کرنا کسی بھی طرح غلط نہیں قرار دیا جا سکتا جو کم عمری میں کسی کی جبری زیادتی کا شکار ہوئی ہو۔ جب اسلام کی رُو سے یہ غلط نہیں، تو تم اور کس حوالے سے اسے غلط ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''تم سمجھتے کیوں نہیں، سب تباہ ہو جائے گا۔ مٹی میں مل جائے گا۔ کیوں نہیں مان جاتے تم.....کیوں سب کچھ برباد کرنے پہ تلے ہوئے ہو۔'' وہ اپنے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑے مسلسل بڑبڑا رہا تھا۔ حق نواز کو اس کا یہ الجھا ہوا انداز چونکا گیا۔ وہ اپنا منوانا جانتا تھا اور حق نواز پہ تو اکثر ہی اپنے بڑے پن کا رعب ڈال کر زبردستی اپنی مرضی چلا لیا کرتا تھا لیکن آج اس کے انداز میں تحکم اور رعب کی بجائے بے بسی تھی۔ ایک عجیب طرح کی بے کلی تھی۔

''کیا برباد ہو جائے گا، کیا سمجھانا چاہتے ہو تم؟'' وہ آہستہ آواز میں کہتے ہوئے۔ اس کے بالکل سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''سب.....سب کچھ.....یہ عزت.....یہ بھرم.....یہ نام اور.....اور یہ رشتے.....سب برباد ہو جائیں گے۔ اگر تم نے اس سے شادی کر لی تو.....وہ.....وہ پھر یہاں آ جائے گی

''اور؟'' اس نے مزید کہنے پہ اکسایا۔

''اور.....'' شاہ نواز کی دہشت بھری آنکھیں پھیلیں۔ وہ اس وقت اپنے آپ میں نہیں لگ رہا تھا۔

''اور پھر وہ مجھے پہچان جائے گی۔''

حق نواز کو یوں لگا جیسے اس کمرے کی چھت ہی نہیں پورا آسمان اس پہ گر گیا ہو۔

☆======☆======☆

''جی، میں رومیصہ نثار ہی بات کر رہی ہوں۔''

اس نے دوسری جانب سے تصدیق چاہنے پہ اپنا تعارف دہرایا۔

''اور میں حق نواز کی ماں بات کر رہی ہوں۔'' بہت ہی سخت لہجے میں کہا گیا، وہ الرٹ ہوگئی۔

''جی آنٹی! السلام علیکم۔ کہئے، کیا خدمت کر سکتی ہوں میں آپ کی؟'' بہت چاہتے ہوئے بھی وہ ان سے حق نواز کے متعلق نہ پوچھ سکی جو نہ تو دو روز سے آفس آ رہا تھا اور نہ ہی فون پہ اس سے رابطہ ہو پا رہا تھا۔ رومیصہ کے خیال میں یہ سب اس کے اس دن والے مشورے کا ردِعمل تھا۔

''تم جیسیوں نے کسی کی کیا خدمت کرنی ہے۔ تم اپنی یا اپنے گھر والوں کی ہی کوئی خدمت کر لو تو بہت ہوگا۔ ہمیں تو معاف رکھو بی بی! اور ہو سکے تو میرے بچے کو بھی بخش دو۔ اسے الٹی سیدھی پٹیاں پڑھانا بند کرو۔''

''میں سمجھی نہیں آنٹی! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ مجھ سے اس قدر فضول بات کرنے کا مقصد؟'' اس کا لہجہ خود بخود روکھا ہو گیا۔

''تم ہی ہو جس نے حق نواز کے دماغ میں یہ فتور ڈالا ہے۔ اسے اکسایا ہے کہ وہ سویرا جیسی لڑکی سے شادی کر لے۔ پہلے تو خود اسے پھنسانے کی کوشش کرتی رہیں اور جب دیکھا کہ تمہاری دال نہیں گل سکتی تو سوچا کہ کیوں نہ اس کا بیڑا ہی غرق کرتی جاؤں۔ وہ اب وہاں بیاہ رچانے کو تلا ہوا ہے اور وہ یہ سب تمہاری خواہش پوری کرنے کے لئے کر رہا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری منت کروں گی اور اپنے بیٹے کو بچانے کے لئے تمہیں بہو بنانا منظور کر لوں گی۔'' وہ بے حد غصے میں تھیں۔

''مجھے اس قسم کی نہ تو کوئی امید ہے نہ خواہش اور نہ ہی آپ کا بیٹا محض مجھے خوش کرنے کے لئے سویرا سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ ہاں ہو سکتا ہے، وہ ایسا صرف اللہ کی خوشنودی

حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہو اور آپ میرا مشورہ مانیں گی تو نہیں پھر بھی کہہ دوں گی کہ اسے ایسا کرنے دیں۔ آپ کی عاقبت سنور جائے گی۔ آپ نے خود تو شاید ہی عمر بھر کوئی ثواب کمایا ہو، اسے اس ثواب سے روک کر گناہ گار مت بنیں۔''

اس نے تسنیم بیگم کا ردِعمل جاننے کی زحمت کئے بغیر فون بند کر دیا۔ ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر ذرا حواس قابو میں آئے تو نئے سرے سے اس اطلاع پہ غور کیا۔

''کیا واقعی وہ سویرا سے شادی کرنے جا رہا ہے؟ اگر اس کی امی جھوٹ نہیں کہہ رہیں تو پھر یقیناً ایسا ہو کے رہے گا کیونکہ اتنا تو میں جانتی ہوں اسے..... وہ خالی خولی باتیں کرنے والوں میں سے نہیں۔ اگر اس نے ایسا کہا ہے تو یقیناً کر کے بھی دکھائے گا لیکن اس دن میرے سامنے تو..... تب وہ یوں بھڑکا تھا جیسے میں نے اسے خودکشی کا مشورہ دے دیا ہو اور .....اور اس کا وہ دعویٰ'' اس کے ذہن میں حق نواز کے الفاظ گونجنے لگے۔

''میں اس لڑکی سے شادی کیوں کروں جب کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''تو پھر اب تم یہ شادی کیوں کر رہے ہو۔'' اس کے دل نے گلہ کرنا چاہا مگر اس نے سختی سے دل کو ڈانٹ دیا۔

''خود غرضی مت دکھاؤ۔ مجھے خوشی ہونی چاہئے کہ چاہے میرے کہنے پہ۔ یا اپنی مرضی سے یا کسی بھی اور وجہ سے میرا ایک دوست ایک اچھا کام کرنے جا رہا ہے۔ مجھے اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے مگر وہ ہے کہاں؟ کیوں چھپتا پھر رہا ہے؟''

وہ ایک بار پھر اس کا نمبر ملانے لگی جو بند ملا۔

''کس سے خفا ہو حق نواز! مجھ سے یا اپنے آپ سے؟'' اس نے اپنے اندر جھانکتے اس عکس سے چپکے سے سوال کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس عکس کو اس کے سوا کوئی اور دیکھے۔ حتیٰ کہ حق نواز بھی نہیں، اس لئے زندگی میں پہلی بار اس نے دل پہ ہلکورے لیتے اس عکس کو ڈرتے ڈرتے مخاطب کیا تھا۔

اس کے ہاتھ میں وبے سیل فون پہ ہونے والی وائبریشن نے اسے متوجہ کیا۔ سکرین پر فرخندہ لودھی کا نام جگمگا رہا تھا۔

''پریس کورج کے لئے آسکتی ہو؟''

''میں.....؟ کوئی خاص واقعہ ہے؟ رپورٹنگ کے لئے عموماً حق نواز یا پھر رفیق ہی.....''

''تم جس فیچر پہ کام کر رہی ہو اس سے متعلق ہے، اس لئے تمہیں فون کیا ہے۔''

رومیصہ فوراً سب بھول بھال کے فرخندہ لودھی کے ساتھ ''معصوم نگر'' جانے کو تیار

تھی۔ شہر میں موجود دوسرے بہت سے یتیم خانوں اور دارالامانوں سے بالکل مختلف ماحول تھا یہاں کا۔ یہاں ایسے بچوں کو اخلاقی سدھار کے لئے عارضی طور پر رکھا جاتا تھا جو حالات کی وجہ سے بچپن کی معصومیت کو ترک کر کے جرائم کی راہ پہ چل پڑتے تھے۔ یہاں رکھ کے انہیں معاشرے کا کارآمد اور فرض شناس افراد بننے کی تربیت دی جاتی تھی، اس کے بعد وہ اپنی راہیں منتخب کرنے میں آزاد ہوتے تھے۔ یہاں ایسے لاوارث بچے بھی ہوتے تھے جن کے ماں باپ انہیں قبول کرنے سے انکاری تھے اور پھر ہر بچہ اپنی جگہ ایک کہانی تھا اور رومیصہ انہی کہانیوں کو ترتیب دے کر آج کل وہ سلسلہ وار فیچر لکھ رہی تھی جو عوام میں تہلکہ مچا رہا تھا۔

''مقامی پولیس نے بچوں کا ایک گروہ پکڑا ہے جو جسم فروشی کے مکروہ پیشے سے منسلک ہیں۔ اس گروہ میں چھ سال سے لے کر سولہ سال تک کے بچے شامل ہیں۔''

''اتنے کم عمر بچے.....؟ یہ بچے اپنی مرضی سے تو اس دھندے سے وابستہ نہیں ہوں گے۔''

''یقیناً ان کے پیچھے کوئی بڑا ہاتھ ہے مگر ان بچوں میں سے اکثریت کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ وہ زبردستی یا مجبوراً یہ کام کر رہے ہیں۔ شاید ان کی برین واشنگ کی گئی ہے یا پھر نشے کی زیادتی نے ان سے کسی بھی اچھائی برائی کی تمیز کرنے کی صلاحیت چھین لی ہے۔ میرے وکیل نے ان بچوں کی کسٹڈی حاصل کر لی ہے، کیونکہ مجھے خطرہ ہے اس گروہ کے پیچھے جو بھی ہے، وہ ان بچوں کو جان سے مارنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ جس بچے کی وجہ سے پولیس اس گروہ کو قابو میں کر پائی ہے، وہ ایک چودہ سال کا لڑکا ہے۔ صورتحال سے کچھ ون قبل آیا ہے اور نشے کی حالت میں اپنے لئے گاہک تلاش کر رہا تھا۔ آؤ میں تمہیں ان بچوں سے ملواتی ہوں۔''

رومیصہ فوراً فرخندہ کے ہمراہ ان لڑکوں سے ملنے اٹھی تھی، مگر وہاں ان کے چہرے ایک ایک کے بعد ایک دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ کس قدر مشکل کام تھا۔

ان چہروں پہ کیا کچھ نہیں تھا..... بھوک، افلاس، جبر..... نفرت..... کراہیت، مظلومیت سب تھا۔ اگر نہیں تھی تو معصومیت، جو اس عمر کا امتیاز ہوتی ہے۔ اسے ان ''بالغ آنکھوں'' میں جھانکنے سے خوف آ رہا تھا۔

''اور یہ گل شاہ..... عمر چودہ سال مگر نشے کی زیادتی اور جسم فروشی نے جس کے اندر چودہ دنوں کی زندگی بھی باقی نہیں رہنے دی۔''

وہ اس وجود کے آگے تھم گئی۔ وہ دبلا پتلا، لمبا سا اور بکھرے مٹیالے بالوں والا لڑکا

ٹھنڈے فرش پہ ہاتھ پیر موڑے، ٹیڑھا میڑھا سا پڑا تھا، اس کا سر دیوار سے ٹکا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کیوں رومیصہ کا شدت سے جی چاہا، وہ اس کا چہرہ دیکھے۔ حالانکہ اس سے پہلے چار چہرے دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا کاش وہ یہ چہرے نہ دیکھتی۔

مگر اس چہرے کو دیکھنے کی چاہ اتنی بڑھی کہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

''سنو..... ادھر دیکھو۔''

پتہ نہیں اس کی آواز رومیصہ تک پہنچی یا نہیں۔ وہ اپنے دھیان میں دیوار پہ اپنی سوکھی زرد انگلیوں سے کچھ لکھ رہا تھا، رومیصہ نے غور سے دیکھنا چاہا کہ اس کی انگلیوں کی حرکت کیا لفظ بن رہی ہے اور تب وہ چونک سی گئی۔ اس کی کلائی پہ ایک گہری چوٹ کا نشان اسے بہت کچھ یاد دلا گیا تھا۔ وہ بے چین ہو کر کچھ اور آگے ہوئی۔ اس لڑکے کے شانے پکڑ کے اس نے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔ مدہوشی سے بند ہوتی آنکھیں..... رال ٹپکاتے سفید لب..... ماتھے سے جڑی گھنی بھنویں..... ستواں ناک اور اس کے عین اوپر سرخی مائل بھورا تل۔

''علی.....'' رومیصہ کے حلق سے کراہ نکلی۔ اس سے چند قدم آگے چلتی فرخندہ ٹھٹک کے پلٹی تھی۔

''تم علی ہو نا..... میرے علی..... ماما کے علی.....''

''پانچ سو روپیہ صاحب، صرف ایک گھنٹہ، خوش کر دوں گا صاحب..... بس پانچ سو روپیہ.....'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔

''علی.....'' وہ چیخی۔

☆======☆======☆

دس سال کے اس صحت مند، گورے چٹے اور ہنس مکھ بچے پہ الفت خان کی نظر عرصے سے تھی لیکن وہ اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ علاقہ غیر میں اس کا خاندان چار لاکھ روپے کا مقروض تھا۔ ایسا قرضہ جو نسلوں سے اُترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ البتہ، سود بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اور اس کے دونوں بھائی لاہور اور کراچی میں دن رات جان توڑ محنت کے بعد سود کی اس بھاری سِل کو ذرا سا پرے سرکانے کی کوشش کرتے۔ چالیس سال کے قریب عمر ہونے کے باوجود اب تک الف خان کی شادی بھی نہ ہو سکی تھی۔ وجہ وہی قرضہ..... اپنی فطری اور جائز خواہشات کی تکمیل کے لئے اس نے اپنے ہی جیسے دوستوں کا بتایا، ناجائز اور غیر فطری راستہ تلاش کر لیا تھا لیکن اس اچھے علاقے میں موجود پڑھے لکھے سرکاری افسروں اور کاروباری افراد کی یہ رہائشی بلڈنگ..... اس میں نوکری ملنے کے بعد اس کی تسکین کا وہ مکروہ

ذریعہ بھی بند ہو گیا جو فیکٹری کی چوکیداری کے دوران اسے میسر تھا۔ تنخواہ اچھی خاصی تھی جس سے وہ ہاتھ نہیں دھونا چاہتا تھا، مگر دوسری جانب گھنے سلکی بالوں اور چمکتی جلد والا علی اس کے اندر کے شیطان کو اکثر اکسا تا رہتا۔

اس دوپہر بھی یہی ہوا۔ علی کے دوست اس کے ساتھ کھیلنے نہیں آئے تھے۔ کمپاؤنڈ ویران پڑا تھا۔ علی بور ہونے کی وجہ سے بار بار الفت خان کے گرد چکر کاٹ رہا تھا۔ تاکہ اس سے باتیں کر سکے۔ اپنا دھیان بٹانے کے لئے الفت خان نے نشے کی دگنی مقدار لینے کا حربہ بھی آزمایا، مگر اس کے نتائج زیادہ خطرناک نکلے۔ شیطان اس پہ مکمل طور پہ حاوی ہو گیا۔ وہ علی کو بہلا پھسلا کے اپنے کوارٹر لے گیا۔ نشہ آور دوا میں بھیگا رومال اس دس سالہ بچے کو ہوش سے بیگانہ کرنے کے لئے کافی تھا۔

مگر خود الفت خان کو جب ہوش آیا تب تک شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ بلڈنگ کا دوسرا گیٹ کیپر اس کے ساتھ اس کوارٹر میں رہتا تھا اس کے آنے کے بعد علی کو چھپانا ناممکن ہو جاتا جو اب تک بے ہوش پڑا تھا اور اگر کسی کے آنے سے پہلے علی کو بھی ہوش آ جاتا تو تب بھی مشکل ہو جاتی۔ اس کی ماں کے واپس آنے کے بعد اسے ڈھونڈنے کا عمل بھی شروع ہو جاتا ایسے میں الفت خان کو اپنا بھائی پربت خان یاد آیا۔ اس نے نزدیکی پی سی او سے فون کر کے اسے جلد از جلد یہاں پہنچنے کو کہا۔ اس کے آنے کے بعد علی کو بے ہوشی کی مزید دوا سنگھائی گئی۔ پربت خان اسے اپنے ایک جاننے والے کے رکشے میں لاد کے بلڈنگ کی پچھلی جانب سے فرار ہو گیا۔

یہاں سے علی صوبہ سرحد پہنچا، پربت خان نے اس خوبصورت لڑکے کے اچھے دام وصول کیے۔ چار سالوں میں اُن گنت شیطانوں کی ہوس کا نشانہ بننے کے بعد وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا اور یہاں سے رومیصہ کو اس حال میں ملا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔

فرخندہ لودھی نے اسے فوری طور پہ ہسپتال داخل کروایا۔ رومیصہ اب تک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ علی کے ملنے کی اطلاع اپنی ماں کو دے..... یا نہیں۔

''پتہ نہیں یہ ان کے لئے خوش خبری ہو گی یا.....؟ پتہ نہیں علی کو دیکھ کر وہ پھر سے جی اٹھیں گی..... یا..... یا پھر جیتے جی مر جائیں گی۔'' سوچوں نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

☆======☆======☆

''تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' شاہ نواز چلا اٹھا تھا۔

''آہستہ بولو۔ چلانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ سوائے اس کے کہ امی ابا کو بھنک پڑ جائے گی اور جو سوال لے کر میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں، ان کے لبوں پہ بھی یہی سوال ہو گا۔ جب تک تم مجھے پوری بات نہیں بتاؤ گے میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔''

''کیسی پوری بات؟ میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے اٹھ کر جانے کی کوشش کی، مگر حق نواز نے سختی سے اس کا بازو تھام کر اسے دوبارہ صوفے پہ گرا دیا۔

''سیدھی طرح میرے سوالوں کا جواب دو ورنہ میں یہ بھول جاؤں گا کہ تم میرے بڑے بھائی ہو۔''

''وہ تو تم بھول چکے ہو۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا، کوئی تعلق نہیں ہے میرا سویرا سے تو تم مان کیوں نہیں لیتے۔ کیوں مجھے زچ کر رہے ہو۔''

''میں تمہاری زبان سے نکلے الفاظ کو نہیں تمہاری آنکھ کے خوف کو مانتا ہوں۔ یہ خوف ظاہر کر رہا ہے کہ تم اپنے اندر کوئی سچ چھپائے ہوئے ہو۔ ایک ایسا شرمناک سچ جو.....''

''بکواس بند کرو۔ کوئی سچ نہیں ہے میرے پاس۔ مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔''

''اللہ سے بھی نہیں؟'' حق نواز نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا۔ وہ ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔

''اور وہ ڈر کیسا تھا جو میری سویرا سے شادی کے ذکر پہ تمہیں پریشان کر گیا تھا۔ تم نے یہ کیوں کہا کہ وہ تمہیں پہچان جائے گی۔ کیا پہچان جائے گی وہ..... بول شاہ نواز! کب دیکھا تھا اس نے تمہیں؟ کیا نو سال کی عمر میں.....؟ کیا ان دنوں جب تم بوریوالہ گئے تھے؟''

''میں تو عرصے سے بوریوالہ نہیں گیا۔'' شاہ نواز نے پست لہجے میں کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں، سب جانتے ہیں کہ پہلے بہت شوق سے خالہ کے ہاں بھاگ بھاگ کر جانے والے شاہ نواز نے ایک دم ہی وہاں جانا ترک کر دیا تھا۔ مگر آخری بار تم اپنے انٹر کے امتحان دینے کے بعد چھٹیاں گزارنے وہاں گئے تھے۔ ذرا سی تحقیق کے بعد پتہ چل سکتا ہے کہ کیا سویرا کے ساتھ ہونے والا حادثہ بھی انہی دنوں ہوا تھا یا..... یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قتل ہونے والے لڑکے سے تمہارا میل جول تھا یا نہیں؟''

''میری تلی سے دور کی سلام دعا بھی نہیں تھی۔'' وہ جلدی سے کہہ اٹھا تو حق نواز کے

لبوں پہ ایک تھکی تھکی..... بجھی بجھی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''ٹلی.....؟ تو یہ نام تھا اس جہنمی کا۔''

شاہ نواز یوں پست ہوا جیسے اب اس کے پاس مزاحمت کرنے کی نہ سکت ہو نہ ہتھیار۔

''میں..... میرا یقین کرو، میری کوئی غلطی نہیں۔ وہ ٹلی ہی..... میں تو.....''

حق نواز دھیان سے اس کا الجھا ہوا بیان سننے لگا۔

☆======☆======☆

''میں آخری بار بور یوالہ تب گیا تھا جب میرا انٹر کا رزلٹ آنے والا تھا۔ چھٹیوں میں تم عموماً چچا جان کے ہاں جایا کرتے تھے اور میں خالہ کے پاس یہاں۔ حالانکہ نہ تو خالہ، امی کی سگی بہن تھیں نہ ہی اس شہر میں میری دلچسپی کا خاص سامان تھا۔ ان کے دونوں بیٹے مزاجاً مجھ سے بالکل الگ تھے۔ اس کے باوجود میں یہاں آنا پسند کرتا تھا کیونکہ یہاں میرے احساسِ برتری کو تسکین پہنچانے کا بہت سا سامان تھا۔ میرا لاہور سے آنا، وہاں کے کالج میں پڑھنا، میرا لب ولہجہ..... میری انگریزی، میرا لباس، میرے جوتے، وہاں کے پینڈو لڑکے مجھے ہیرو کہہ کے بلایا کرتے تھے، میں بھی ان میں بیٹھ کے خود کو کسی ہیرو سے کم نہیں جانتا تھا اور لمبی لمبی گپیں چھوڑ کے انہیں مزید متاثر کیا کرتا تھا۔ حالانکہ نہ تو میں کوالیفکیشن میں پڑھتا تھا نہ ہی ہمارے گھر کا ماحول بہت زیادہ ایڈوانس تھا اس کے باوجود میں اپنی فرضی گرل فرینڈز کے ساتھ اپنے بے باک تعلقات بڑھا چڑھا کے بیان کرتا۔ جب کہ حقیقت میں میرا کسی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پتہ نہیں یہ عادت کیسے پروان چڑھی۔

ان دنوں میری ملاقات اس سے ہوئی۔ سویرا سے نہیں بلکہ اس کی بڑی بہن سے۔ وہ صادق بھائی کی دکان پہ آئی۔ میں فارغ وقت اس دکان پہ گزرتا جہاں میرے پرستاروں او دوستوں کا رش لگا رہتا تھا۔ ایک دن جب وہ آئی تو میں اکیلا تھا۔ وہ بہت حسین نہ تھی، منفرد بھی نہ تھی جسے دیکھ کر آپ نظریں جھکا لیں یا چرا لیں..... وہ ایسی لڑکی بھی نہ تھی جسے دل ہی دل میں پسند کرتے رہنے کے باوجود آپ اس سے اظہار کرتے ہوئے ڈریں یا جھجک جائیں۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جو آپ کو کچھ کرنے، کچھ کہنے، کچھ کھلنے پہ اکساتی ہے۔ اس کی شوخی اور طراری نے ہی مجھے اکسایا۔ مجھے موقع ملا کہ میں اپنے دوستوں پہ ثابت کروں کہ میں صرف باتیں ہی نہیں بناتا، بلکہ حقیقتاً لڑکیوں کو مٹھی میں کرنا جانتا ہوں۔ کچھ میری عمر بھی ایسی تھی کچھ ماحول اور صحبت کا تقاضا..... میں جلد اس سے بے تکلف ہو گیا۔

اس بے باک لڑکی نے میرے اندر جذبوں کی آنچ دہکا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ بہت برا

اس نے۔ ورنہ میں برا نہ تھا۔ وہ میرے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اُلو بنا رہی تھی مجھے..... جن دوستوں کے سامنے میں ڈینگیں مار رہا تھا ان ہی کے سامنے وہ مجھے تھپڑ مار گئی۔ ٹلی نے مجھے بدلہ لینے پہ اکسایا۔ اور..... اور اس کی چھوٹی بہن کو بہلا پھسلا کے اپنی دکان پہ لے آیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میری نہ تو ایسی نیت تھی نہ یہ پلان۔ ٹلی خود بدنیت تھا اور اپنی غرض سے ایسا کر رہا تھا اور احسان وہ مجھ پہ جتا رہا تھا۔ میں نے منع کیا..... روکنا چاہا اسے مگر تب تک وہ اس کے ہاتھ پیر باندھ کے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس چکا تھا۔ میں بری طرح پھنس گیا۔ اس نے ایک ایسی فلم دکھائی جس سے میرے حیوانی جذبات بھڑک گئے۔ میں اس کا ساتھ دینے لگا۔ مگر اس بچی کی کم سنی، آنکھوں کا ہراس، اس کا چڑیا کے بچے سا کانپتا جسم۔

میں ہوش میں آ گیا۔ مجھے اپنے آپ سے گھن آئی۔ مجھے..... مجھے اس بچی کی جگہ فوزی نظر آئی۔ میں نے ٹلی کو پیٹ ڈالا جو اس وقت درندہ بن رہا تھا۔ وہ میرے قابو میں نہ آیا تو میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ راستے میں صادق بھائی ملے تو انہیں واپسی کا بتا کر لاہور آ گیا..... اور..... اور سالوں سے میرے دل سے یہ ملال نہیں جاتا۔ یہ پچھتاوا نہیں جاتا۔ کاش..... کاش میں نے ٹلی کو تب روکا ہوتا جب وہ اس بچی کو بہانے سے اندر لا رہا تھا۔

کاش میں صادق بھائی کو لے کر ٹلی کی دکان تک واپس چلا جاتا..... اس بچی کو بچا لیتا۔

کاش..... کاش مگر میرا یقین کرو حق نواز! میں نے کچھ نہیں کیا۔ نہ میرا ارادہ تب اس بچی پہ غلط نگاہ ڈالنے کا تھا، نہ ہی میں اسے اندر لانا چاہتا تھا۔ ہاں چند بے بس کر دینے والے لمحات میں، میں نفس کا غلام ضرور بنا مگر بس..... بس چند لمحوں تک۔ میرے ہاتھ صرف اسے چھونے کے گناہ گار ہوئے تھے تب سے میں انہیں پاک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس ایک لمحے کی غلطی کے بعد میں نے کسی گناہ، کسی لغزش کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ تم گواہ ہو میری پارسائی کے۔'' وہ بلک اٹھا۔

''پارسائی نہیں شاہ نواز! یہ تمہارا گلٹ تھا۔ میں اکثر تمہارے غیر معمولی طرزِ عمل کی وجہ جاننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ تمہارا حد سے بڑھا ہوا مذہبی رجحان، پاکی ناپاکی کا جنون، پردے اور عورت کے بارے میں کٹر خیالات..... یہ سب تمہارے اندر کی نفسیاتی گرہ تھی۔ دراصل تم اپنی پارسائی ثابت نہیں کر رہے تھے، بلکہ اپنی روح سے لتھڑی نجاست کو دھونے کی کوشش کرتے رہے اور تمہارا یہ مرض ابھی اور بڑھے گا شاہ نواز..... اب جب تم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ چکے ہو کہ اس بے گناہ بچی نے تمہاری وجہ سے کیسی زندگی گزاری ہے، گزارتی آ رہی ہے اور آئندہ گزارنے والی ہے۔ تم یہ جان چکے ہو کہ اس پورے خاندان پہ کیا گزر چکی ہے۔ اب

تم پل پل مرو گے..... سسکو گے۔ مگر نجات نہیں حاصل کر سکو گے۔ اس احساسِ گناہ سے تم کتنا ہی چلا چلا کے کیوں نہ اعلان کرو کہ تم نے کچھ نہیں کیا..... یہ تم بھی جانتے ہو کہ تم کیا کر چکے ہو۔"

"میں کیا کروں..... کیا کروں جو میری ذات سے یہ داغ دھل جائے۔ میری روح ہلکی پھلکی ہو جائے۔" وہ کراہا۔

"تم وہ کر و شاہ نواز! جو میں کرنے جا رہا تھا۔ یہ فرض تو تمہیں ادا کرنا ہے اور اگر تم نے قدم آگے نہ بڑھائے تو سمجھو، پچھتاوے کے ناگ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گلے میں ڈال لئے ہیں۔ اب تلافی کی یہی ایک صورت بچی تھی۔"

"میں کیسے اس سے شادی کر لوں، امی نہیں مانیں گی..... ابا جی کیا سوچیں گے، یہ دنیا کیا کہے گی؟"

"اور اللہ..... اللہ کے بارے میں سوچو شاہ نواز! شاید تمہارے اس اقدام سے وہ تمہارے بارے میں رعایت کر ڈالے۔ میں تو یہ کام نیکی سمجھ کے کرنے جا رہا تھا۔ ثواب کمانے..... مگر تمہیں تو کفارے کے طور پر کرنا ہے۔" اس نے رسان سے اسے سمجھایا تھا۔

☆======☆======☆

حق نواز نے سویرا سے شادی کی بات کر کے وہ طوفان کھڑا نہیں کیا تھا جو شاہ نواز کے اعلان نے کر دیا۔

"میں پوچھتی ہوں تم دونوں بھائیوں کو ہو کیا گیا ہے۔ ایسا کون سا سحر پھونک ڈالا ہے اس پردہ دار بی بی نے جو کبھی ایک اس سے بیاہ رچانے کو اتاولا ہو رہا ہے تو کبھی دوجا۔ کان کھول کر سن لو دونوں۔ میں یہ ڈرامے بازی نہیں چلنے دوں گی۔ وہ لڑکی اس گھر کی بہو کبھی نہیں بنے گی۔" تسنیم بیگم نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔

"وہ لڑکی اس گھر میں آپ کی بہو بن کے ہر حال میں آئے گی امی! اور ایسا شاہ نواز کو ہی کرنا ہوگا۔ میں نہ صرف اس کے ساتھ ہوں بلکہ اسے کبھی کمزور پڑتے دیکھا تو مجبور کر کے بھی..... یا زبردستی یہ کام کروا دوں گا۔"

"تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے، زبردستی کرنے کا۔ میں تمہیں اپنے گھر کو برباد نہیں کرنے دوں گی۔"

"میں اس گھر کو برباد ہونے سے بچانے کی ایک کوشش کر رہا ہوں۔ یہ بات میں کرنا تو نہیں چاہتا تھا، لیکن میرا خیال ہے مجھے مجبوراً کرنا ہوگی۔ امی! اگر آپ اس خاندان کی

آنے والی نسلوں کو کسی عذاب یا قہرِ الٰہی سے بچانا چاہتی ہیں تو اس مظلوم لڑکی کا گھر بسا دیں۔"

"تم کل کے لڑکے، مجھے عذابِ الٰہی سے ڈرا رہے ہو۔ شرم نہیں آتی؟ کون سے گناہ کر ڈالے ہیں میں نے..... اور میرا بیٹا ہی کیوں یہ ثواب کمائے۔ وہ پنج وقتہ نمازی، پرہیز گار..... دین کا پکا..... پاک خیالات والا، اس کے لئے تھوک کے چٹنگی عورت ہی رہ گئی ہے اور وہ مظلوم ہے تو ہوگی۔ ظلم کیا میں نے یا میرے خاندان نے کئے ہیں جو عذاب ہم پہ نازل ہوگا۔"

"ہاں....." ان کے غیض و غضب کے آگے حق نواز کا ٹھنڈے لہجے میں کہا گیا ایک لفظ بند باندھ گیا۔ وہ یک دم چپ ہو کر دونوں کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ شاہ نواز کی پیشانی عرق آلود تھی۔ رنگت سفید پڑ رہی تھی لگتا تھا جیسے وہ ابھی گر جائے گا۔

"شاہ نواز یہ اعتراف کر چکا ہے کہ تیرہ سال قبل سویرا کے ساتھ ہونے والے حادثے میں وہ بھی شریک تھا۔"

تسنیم بیگم جھاگ کی طرح ٹھنڈی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ایک بار پھر بڑی آس کے ساتھ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ وہ بیٹا جوان کا مان تھا، فخر تھا..... غرور تھا..... ان کا اٹھا ہوا سر تھا۔ آج وہ سر جھکا ہوا تھا۔ وہ منہ پہ دوپٹہ رکھ کے گھٹی گھٹی سسکیاں روکنے لگیں۔

"میں نے کہا تھا کہ میں یہ صورتِ حال برداشت نہیں کر پاؤں گا۔ اتنی ذلت اور اتنی شرمندگی اٹھانے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔ ابھی تو ان لوگوں کے ہاں سے نہ جانے کتنا ذلیل ہونا پڑے گا۔" شاہ نواز ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کیا منہ لے کر جاؤں کیسے اپنے بیٹے کے کرتوت دکھاؤں مجھے تو معاف رکھو۔" انہوں نے ہاتھ جوڑے۔

"فی الحال اس سب کی ضرورت نہیں۔ اللہ کا نام لے کر اس نیک کام کا آغاز کیجئے اور شاہ نواز! تمہیں قبل از وقت پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس حادثے کو ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ سویرا کے تمہیں پہچاننے کے امکانات صفر ہیں کیونکہ تم کہہ چکے ہو کہ تم وہاں سے نکل آئے تھے۔ اگر اللہ نے تمہارا پردہ رکھنا چاہا اور تمہارے کفارے کو یا تمہاری توبہ کو شرفِ قبولیت بخشا تو بغیر اس کے سامنے عیاں ہوئے بھی تم دونوں ان شاء اللہ ایک خوشگوار زندگی گزار دو گے۔ ہو سکے تو تم دونوں کچھ عرصے کے لئے کہیں اور شفٹ ہو جاؤ۔ وقت سب سے

بڑا مرہم ہے۔" حق نواز نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

☆======☆======☆

"کتنی مشکل سے ڈھونڈا ہے تمہیں۔ کہاں گم ہوگئی تھیں تم؟" حق نواز نے رومیصہ سے پوچھا۔ آج کتنے دنوں کے بعد دونوں روبرو تھے۔

"میں؟ میں گم ہوگئی تھی؟ رابطے میں تو تم نہ آرہے تھے۔" رومیصہ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ "میرا نمبر دیکھ کر فون تک آف کردیتے تھے۔"

"وہ ایک وقتی فیز تھا۔ میں تم سے کترا نہیں رہا تھا۔ بلکہ کچھ مہلت لے رہا تھا۔ صرف دو دن۔ صرف دو دن..... اور اس کے بعد سے میں مسلسل تمہیں تلاش کررہا ہوں۔ آفس کیوں نہیں آرہیں تم اور یہ فرشتہ لودھی کے پاس ڈیرے کیوں جمارکھے ہیں تم نے؟"

جواب میں رومیصہ نے اسے ساری کہانی سنا ڈالی۔ علی کے ملنے سے لے کر اس کے گزرے چار سالوں تک کی داستان۔

"میں بہت الجھ گئی ہوں..... سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔ علی کے لئے انصاف طلب کروں یا ماما کو ان کا علی لوٹاؤں۔ ماما نے چار سالوں تک علی کی جدائی بہت مشکل سے برداشت کی ہے اب وہ اس کا یہ حال دیکھ نہیں پائیں گی۔ دوسری جانب میں ان سے یہ بات چھپا بھی نہیں پارہی۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ اگر میں نے ماما کو علی کے بارے میں بتا دیا تو مجھے اس کی خاطر انصاف کی جنگ لڑنے کا فیصلہ بدلنا پڑے گا۔ ماما یہ برداشت نہیں کریں گی کہ ان کا مظلوم بیٹا جو چار سال تک رُلتا رہا۔ اب اس کی کہانی اخباروں کی زینت بنے۔ لوگ چسکے لے لے کر پڑھیں۔ چار لفظ ہمدردی کے کہیں اور پھر اسے دیکھ کے ناک پہ رومال رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر ہوجائیں۔ وہ بھی چاہیں گی کہ ان کی زندگی کے باقی سال علی کے ہمراہ سکون اور اطمینان سے گزاریں۔"

"اور تمہیں ان کی خواہش پوری کرنی چاہئے۔"

"مجرموں کو یونہی چھوڑ کر، کچھ اور معصوم بچوں کی زندگی تباہ کرنے کا موقع دیتے ہوئے اپنی اپنی زندگیاں اطمینان سے گزار لیں؟ ایسا کیسے کرسکتے ہیں ہم۔ انصاف کی راہ پہ چلنا مشکل سہی مگر ضروری ہے۔"

"فی الحال ایک ماں کے جذبات کا احترام زیادہ ضروری ہے۔ کیا یہ طے ہے کہ علی کے مجرموں کو انصاف مل پائے گا۔ تم ساری عمر بھی لگا دو گی تو ہاتھ کچھ نہ آئے گا۔ ہاں اگر اللہ نے چاہا تو ایک دن انصاف خود ہی مل جائے گا۔"

"میں مانتی ہوں خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے، لیکن سب کچھ قدرت پہ چھوڑ دینا۔ کیا یہ صحت مندانہ رجحان ہے؟"

"تم فی الحال وقت کا تقاضا دیکھو۔ آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ انہیں علی کی ضرورت ہے اور علی کو ایک گھر، ایک خاندان کی۔ اسے بھی مناسب علاج، اچھی غذا، بہتر ماحول اور بھرپور توجہ و محبت چاہئے۔ میرا دوستانہ مشورہ تو یہی ہے کہ فی الحال کیس لڑنے کا ارادہ مؤخر کرو۔ انسانی جان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ علی کی حالت سنبھل جائے تو بعد میں آنٹی کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک بار تم نے میری بات مانی تھی آج میں تمہاری بات مان لیتی ہوں۔"

"میں نے تمہاری بات؟"

"ہاں، سویرا سے شادی کی بات، مجھے بہت خوشی ہوئی تھی یہ جان کر، آنٹی کا فون آیا تھا مجھے۔"

"ہاں وہ سب....." وہ کھل کے ہنسا۔

"وہ ایک حربہ تھا۔ سویرا سے شادی ضرور ہورہی ہے مگر میری نہیں شاہ نواز کی۔ اگلے ہفتے سادگی سے نکاح ہوگا۔ البتہ ولیمے کا دعوت نامہ کل تک پہنچ جائے گا۔"

اس نے رومیصہ پہ ظاہر کیا جیسے اس نے سویرا سے شادی کرنے کا شوشا شاہ نواز کو اکسانے کے لئے چھوڑا ہو۔

"میں کسی اور سے شادی کیسے کرسکتا ہوں رومیصہ! میں تو تم سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے وہی بات دہرائی، اسی بے چارگی کے ساتھ اور ہنس دیا۔

اسی کی ہنسی رومیصہ کے اطراف میں سنہری دھوپ بن کے بکھر گئی۔

☆======☆======☆

وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے..... یہ حق نواز نے سچ کہا تھا۔ آج شاہ نواز اور سویرا کینیڈا میں ایک خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ شاہ نواز نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے سویرا کو زندگی کی ہر ممکن خوشی مہیا کرنے کی کوشش کی ہے اور بدلے میں سویرا کے چہرے پر پھوٹتی ہر نئی کرن اس کا احساسِ گناہ کم سے کم کرتی جاتی ہے۔

علی رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹ رہا ہے، اس کا جسمانی اور نفسیاتی دونوں طرح سے علاج جاری ہے۔ منصلع سنزیلو فرشار سے اس کے گزرے چار سال کا احوال پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ صرف اس کی گمشدگی کے بارے میں الفت خان کا ذکر کیا گیا۔ وہ رومیصہ کے منع کرنے کے باوجود اس بلڈنگ میں جاکے رہیں۔ وہاں سے الفت خان کے بارے میں

معلومات لے کر اس سے ملنے گئیں تا کہ اس سے اپنے بیٹے کی بربادی کا حساب مانگ سکیں اور وہاں جا کر رومیصہ کو حق نواز کی بات شدت سے یاد آئی۔ ''اللہ سے بڑا منصف کوئی نہیں۔'' الفت خان، بیماریوں کا گڑھ بن کے رہ چکا تھا۔ اس کا گلا سڑا جسم تعفن پھیلا رہا تھا۔ وہ نہ کچھ کہنے سننے کے قابل تھا، نہ اٹھنے بیٹھنے کے۔

رومیصہ نے اخبار کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ وہ اپنی ماں کی خاطر علی کے لئے انصاف کی جنگ تو نہ لڑ سکی مگر فرخندہ لودھی کے ساتھ مل کے معاشرے کے ان بے ضمیر افراد کے خلاف جہاد ضرور کر رہی ہے، جو بچپن اور معصومیت کو کبھی نہ ختم ہونے والا روگ لگا دیتے ہیں۔

اور حق نواز..... حق نواز صرف نام کا ہی حق نواز تو نہیں، وہ حق کی اس جدوجہد میں آج بھی رومیصہ کے ساتھ ہے۔

☆======☆======☆

طنابیں گلاب خوابوں کی

خواب کبھی نہیں مرتے، انسان مر جاتے ہیں۔

ایک باپ کا عجیب قصہ جو اپنے گھر کا شیرازہ بکھرنے سے بچانے کے لیے اپنے پانچ بیٹوں کے لیے پانچ سگی بہنیں بیاہ کر لانے کا خواب دیکھ رہا تھا اور جب اس کا خواب پورا ہوا تو.....

اسے ابی کی بے نیازی بری طرح کھل رہی تھی جو اس کے گھنٹہ بھر سے آس پاس منڈلانے اور من من کر کے کچھ کہنے کی کوششوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مسلسل گیندے کے پھول کے لاڈ اٹھانے میں مصروف تھے۔

"ابی پلیز....." اس نے "پلیز" کو لمبا کھینچتے ہوئے ایک بار پھر ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور شاید وہ سر اٹھا کر اپنے سب سے چھوٹے سپوت پر نظرِ کرم ڈال ہی دیتے اگر باگڑو ایک دم سے ہی آ کر ان کے پیروں پہ لوٹنا نہ شروع کر دیتا اور نتیجتاً ان کی توجہ کی ڈوری ایک بار پھر مہران کے ہاتھ آتے آتے رہ گئی۔

"اوہ کی گل ہے میرے باگڑو..... میرا شیر۔" وہ اپنے پلے پلائے موٹے تازے بلے کے لاڈ اٹھانے لگے۔

"اُف..... ف....." مہران نے لب بھینچ کر باگڑو کے منحوس تھوبڑے کو غصے سے دیکھا جو اس کے ابی کے زانو پہ دھرا تھا، اس کی چتی منی سی آنکھیں بند تھیں لیکن پھڑ پھڑاتی ہوئی مونچھوں تلے مہران کو خواہ مخواہ ہی ایک طنزیہ مسکراہٹ بھی نظر آ گئی اور تو اور اسے یہ بھی لگنے لگا کہ خبیث باگڑو مزور پلکوں کی جھری سے اس کی بے بسی کا مزہ لوٹ رہا ہے۔

"ابی! آپ میری بات بھی سنیں گے یا نہیں؟" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے ایک بار پھر ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کیا۔

"کچھ منہ سے پھوٹو گے بھی یا نہیں؟" بدستور اس سے رخ پھیرے پھیرے ہی خواجہ خلیق الرحمان نے ننھی سی جھڑکی دی۔

"ابی! میں یہ کہنا چاہ....." بات تو شروع کر لی اس نے لیکن ابی کی بے توجہی بھانپ کر پھر چپ کر گیا۔ ان کا ایک ہاتھ گود میں "کاکا" بن کر لیٹے باگڑو کو تھپک رہا تھا تو دوسرے ہاتھ

میں پکڑی چھڑی کی نوک سے وہ کیاری میں نہ جانے کیا کھود کر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس نے وہیں کھڑے کھڑے ابی کی اس سلطنت کا رقبہ نما جائزہ لیا جہاں آ کر وہ خود کو فراموش کر بیٹھتے تھے تو اولاد کیا چیز تھی۔ اس نے مٹھی میں بال بھینچتے ہوئے کینہ توز نظروں سے ایک ایک چیز کو گھورا۔

املتاس کے پیلے پیلے گچھوں سے لدے تین درخت.....

لکڑی کے چرچراتے گیٹ کے دائیں طرف والی دیوار کو مکمل ڈھانپے ہوئے منی پلانٹ کی سرسبز بیل جسے انہوں نے اپنی خوش بختی کی علامت سمجھ رکھا تھا۔

لیموں کے قد آور پودے کے ساتھ بنا باگڑو کا قلعہ۔

موتیے اور رات کی رانی کے پودے جن کی مہک کا پوری کالونی میں اُگے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے مقابلہ کرنا ابی کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

پچھلی طرف دیوار کے ساتھ بنی کیاریوں میں اُگے گلاب، گیندے اور سورج مکھی کے پھول..... ان سے ذرا آگے لان کے عین وسط میں بنے مختصر سے کھیت میں سے جھانکتے گوبھی کے پھول، پتوں میں چھپی بھنڈیاں اور توریاں، شاخوں سے لٹکتے بدہیئت بینگن.....

اس بدذائقہ کھیت کے کچھ نزدیک ہی ابی کی کرسی دھری تھی جس پہ اس وقت وہ بیٹھے مہران کی قوتِ برداشت کا امتحان لینے میں مصروف تھے۔ اس نے چڑ کر پھر سے سر گھمایا۔ برآمدے کی سیڑھیاں اترتی "بھابیز" پہ نظر پڑی تو بالکل ہی ہمت ہار دی۔

"اب کیا خاک بات ہو سکے گی۔" اس نے چائے اور اس کے لوازمات سے بھری طشتریاں اٹھائے بھابیوں کے ٹولے کو دیکھا اور تھکے تھکے قدموں سے اندر کی طرف بڑھنے لگا۔

"کہاں چلے برخوردار؟ تم تو کچھ کہنے والے تھے ناں؟ کوئی اہم بات؟" ابی نے پچھلے آدھے گھنٹے میں اب کہیں جا کر اسے سر اٹھا کے دیکھا۔

"پھر کبھی....." بڑے ہی ضبط کے ساتھ وہ صرف یہ دو الفاظ دہرا سکا۔

"کمال ہے..... حد ہے بدتہذیبی کی..... پچھلے دو گھنٹوں سے مجھے باندھ رکھا ہے۔ بات کرنی ہے، بات کرنی ہے۔ سب کام چھوڑ چھاڑ میں صاحبزادے کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھا ہوں۔ اب فرما رہے ہیں..... پھر کبھی..... بہت خوب..... سارا موڈ غارت کر کے رکھ دیا۔"

"اور میرے موڈ کی اس وقت کوئیں پھوٹ رہی ہیں ناں جیسے۔" ایک بار پھر اس نے ضبط سے کام لیا اور دل ہی دل میں ابی کی مبالغہ آرائی کی داد دیتا ہوا برآمدے کی سیڑھیاں

چڑھنے لگا۔

"چائے نہیں پیو گے مہرو؟" بڑی بھابی نے پاس سے گزرتے دیور کو مخاطب کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا، لب کھولنے سے وہ ہنوز گریز ہی کر رہا تھا۔ مبادا جلے دل کی ساری بھاپ زبان کے رستے باہر نہ نکل جائے۔

"میٹھی ٹکیاں بنائی ہیں اور بینگن کے پکوڑے بھی۔" بھابی نمبر دو نے اٹریکشن پیدا کرنا چاہی، نہ جانے کیسے وہ بھول گئیں کہ بینگن مہران کی چڑ ہیں اور وہ جو سوجی کی سوندھی سوندھی خوشبو والی کرکری خستہ میٹھی ٹکیوں کا تصور کرتے رک گیا تھا، منہ میں گھلتے لچلچے بینگن کی کڑواہٹ محسوس کر کے پھر سے پیر پٹختا آگے بڑھ گیا۔

منہ جبین بھابی نے اپنی جبین پہ بچی شکنوں میں چند ایک کا اور اضافہ کرتے ہوئے اسے تبصرہ کرتی نگاہوں سے گھورا جب کہ سب سے چھوٹی بھابی نے پیچھے سے بھی آواز لگائی۔

"کمرے میں چائے بھجوا دیتی ہوں مہرو اور ساتھ میں آلو کے پکوڑے بھی..... بس ابھی ڈالتی ہوں کڑاہی میں۔"

"منہ ناز..... مت ناز اٹھاؤ اس کے..... سر پہ چڑھتا جا رہا ہے۔" ابی نے دور سے ہی تنبیہہ کی۔ اس کے دھم دھم کرتے قدم اور زور سے فرش پہ بجنے لگے۔

"قیں..... قیں....." برآمدے کا دروازہ کھولتے ہی "ڈونالڈ" پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے ہوتا ہوا اس سے پہلے ہال کمرے میں پہنچ گیا۔ مہران نے غصے سے ابی کے ایک اور لاڈلے کی بدتمیزی ملاحظہ کی۔ گردن گھما کے لان کی طرف دیکھا جہاں اس وقت ابی اپنی چہیتی بہوؤں کی سنگت میں ٹی پارٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ تحقیر بھی اسٹائل میں مسکراتا ہوا اس بدشکل بلے کی طرف بڑھا جو ٹھک ٹھک چلتا ہوا کچن کا رخ کر رہا تھا۔

"لالچی، بدنیتا....." مہران نے بڑبڑا کر اسے دو نئے نام دیے۔ کچن سے نکالنے سے پہلے امی اس کی پیٹ پوجا کا انتظام جو کر دیتی ہیں، اس لئے ہر وقت وہاں گھسنے کے لئے تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ مہران جانتا تھا امی اس وقت اپنے کمرے میں عصر کی نماز ادا کر رہی ہوں گی اور بھاجیز تو اب ٹرے کے ٹرے صاف کر کے ہی اندر آئیں گی۔

"اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں اس بے سُرے ڈونالڈ سے نجات حاصل کرنے کا۔"

آج کل اس کے ذہن میں ہر وقت ایسے ہی باغیانہ اور تحقیر بھی منصوبے کلبلاتے رہتے تھے۔ جس وقت وہ ابی کے سامنے کھڑا ان کی چند لمحوں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا

تب ہی اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ گیندے کے ان بڑے بڑے پھولوں کی ایک ایک پتی نوچ لے۔

لمبی لمبی مزیل سی جھنڈیوں کا کچومر نکال دے۔

توریوں کو مروڑ کر رکھ دے۔

اور کچھ نہیں تو کم از کم اس ڈیلیل بانگڑو کی دُم ہی پیروں تلے اس بُری طرح کچل دے کہ دو دن تک بلبلاتا پھرے۔

ہائے..... لیکن..... ابی کی نظر اگر نہیں پڑتی تھی تو صرف اس پہ ہی نہیں پڑتی تھی ورنہ اپنی اس راجدھانی کی چپہ چپہ کی وہ خوب کیا کرتے۔ "اس بھدے بے سُرے قوال کی چونچ نہیں بند ہو سکتی ورنہ بغیر ڈنکے کیے ہی راحت کی طرف لے جاتا، وہ خود ہی حلال کرتا اور پھر خود ہی روسٹ کرتا۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے ایک تیز دھار چھری لہرائی اور ڈونالڈ کو گردن سے دبوچ لیا۔

"قیں..... قیں قیں....." اس نے دردناک آوازیں نکالیں، مہران کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ جانتا تھا ابی کی نظر کے ساتھ ساتھ کان بھی کس قدر تیز ہیں۔

"بھوؤ..... بھوؤ....."

اس چیلنج بھرے بھونکنے نے اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے، مارے گھبراہٹ کے اس کے ہاتھوں سے چھری چھوٹ گئی۔ "کیسا شور مچا رکھا ہے..... وہ موا کتا اندر تو نہیں گھس آیا؟" امی حواس باختہ سی کچن میں داخل ہوئیں۔

"تو اور کیا؟ کچن میں دندنا رہا تھا وہ کتا۔ اگر کسی ہاڈی میں منہ مار دیتا تو؟ ابی نے بڑا سر چڑھا رکھا ہے ان خبیثوں کو، اتنی مشکل سے میں نے اس کتے کے بچے کو نکالا ہے۔"

"اوں ہوں..... مہران..... گالی نہیں بکتے۔" امی نے سرزنش کی تو وہ جھلا گیا۔

"جب آپ ہی معاملے کی سنگینی نہیں سمجھ پا رہی ہیں۔ ابی سے تو کسی قسم کی سنجیدگی کی امید رکھنا فضول ہے۔"

"میری سنجیدگی تو تمہارے ابی کے مزاج سے وابستہ ہے، صاف بات تو یہ ہے۔" انہوں نے دامن جھاڑا یا تو وہ بجھ سا گیا۔

"یعنی آپ بھی میری کوئی مدد نہیں کریں گی۔ امی..... کبھی تو..... کبھی تو بیوی کے بجائے صرف ماں بن کر سوچیں..... کیا آپ کے خیال میں میرا یہ مسئلہ غیر اہم ہے اور کیا ابی کا مؤقف انتہا پسندانہ نہیں ہے؟" اس نے منت کی تو تسلے میں دال بھگوتے ہوئے شفیقہ خاتون

کے ہاتھ تھم گئے۔ نظر اٹھا کے خوبرو جوان بیٹے کو دیکھا جو سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سب سے لاڈلا بھی تھا۔ دل بیٹھ گیا۔

"میں مانتی ہوں، ان کا رویہ بہت سخت ہے۔ کچھ سننے پہ تیار ہی نہیں ہوتے وہ۔ کم از کم میری تو ایک نہیں سنیں گے۔"

"اور وہ "ایک" آپ کبھی کہہ بھی نہیں سکیں گی۔" وہ ناراض ناراض سا واپس پلٹنے لگا۔

"ایک طریقہ ہے۔" امی کی آواز پہ وہ خوش گمان ہو کر پھر رک گیا۔

"اگر سب لوگ مل کر انہیں سمجھائیں، انہیں منانے کی کوشش کریں تو ہو سکتا ہے بات بن جائے۔"

"سب لوگ کون؟ یہ سب؟ یعنی بھابیاں بمع فیملیز..... توبہ کیجئے..... یہی تو ابی کی مشیر خیاں ہیں اور یہ بھلا کہاں میرا ساتھ دیں گی۔ میرا گھر بسانا تو بڑی بات ہے، اس کا ذکر سنتے ہی چاروں کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔ کورس میں بھل بھل رونا شروع ہو جاتی ہیں۔"

"وہ تو بس....." امی نے سر جھٹکا۔ "وہ الگ بات ہے لیکن مجھے یقین ہے میں ان سے پیار سے بات کروں گی تو وہ ضرور سمجھ جائیں گی۔"

"وہ شاید سمجھ تو جائیں لیکن یہ بات بھول جائیے کہ میرے سلسلے میں وہ ابی سے بات کرنے پہ تیار ہوں گی..... وہ کب چاہتی ہیں کہ..... آپ لکھ لیجئے میری بات..... یہی چاروں ہیں ابی کے دماغ میں الٹے سیدھے خیال بھرنے والی۔ آپ بس اندر مصلے پہ بیٹھی نمازوں کے بعد لمبے لمبے وظیفے پڑھا کیجئے اور وہ بینگنوں کے پکوڑے بنانا کے انہیں کھلاتی رہیں اور ان کے مزاج اور بگاڑتی رہیں۔"

"تری بات بیٹا! میرے چندا ایسے نہیں کہتے اپنے بڑوں کے بارے میں اور نہ سوچتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے..... مان لیا سب مجھ سے بڑے ہیں۔ میں سب سے چھوٹا سہی مگر اب اتنا بھی چھوٹا نہیں اور نہ ہی تمام عمر چھوٹا رہوں گا۔ جوان تو ہو چکا ہوں، ایک دن بوڑھا بھی ہو جاؤں گا لیکن ہوتا رہوں، آپ کو کیا، ابی کو کیا؟" وہ کچن سے جا چکا تھا لیکن شفیقہ خاتون اسی طرح بے بسی کے عالم میں کھڑی اس کی باتیں دوہرا رہی تھیں، جو حرف بہ حرف سچی تھیں لیکن خواجہ خلیق الرحمان..... وہ جس بات پہ اڑ جائیں پھر اس سے ایک انچ سرکنا بھی مشکل تھا۔

☆======☆======☆

خواجہ خلیق الرحمان بس ایسے ہی تھے۔ یہ بات نہیں کہ ان کا دل بہت سخت تھا یا اولاد

کے لئے وہ بہت کڑے قسم کے باپ ثابت ہوئے تھے۔ دل تو ان کا بہت گداز تھا اور اس میں پیار بھی بے حد و حساب بھرا ہوا تھا۔ جب وہ اپنے ہاتھوں لگائے پھولوں پودوں کے لئے اتنے حساس ہو سکتے تھے تو اپنی پیدا کی گئی اولاد کے لئے کیوں نہیں۔ اپنے پالتو جانوروں کے لئے اتنے ذمہ دار ثابت ہو سکتے تھے تو اولاد کے سلسلے میں لاپروائی کیسے برتیں گے لیکن..... ایک بات ایسی تھی جس کے آگے وہ بے بس تھے۔ بس یہاں آ کر ان کا دل سخت ہو جاتا تھا۔ برسوں پہلے وہ جو خواب دیکھ چکے تھے، اس کی تعبیر کھلی آنکھوں دیکھنے کی خواہش وقت کے ساتھ ساتھ اور پختہ ہوتی چلی گئی۔ ابی کی خواہش پہلے پہل اسے بھی اوروں کی طرح انوکھی مگر بے ضرری لگتی تھی لیکن اب حالات کیا سے کیا ہو جانے کے باوجود بھی ان کا اسی طرح ضد پہ ڈٹے رہنا اسے سراسر ناانصافی اور ہٹ دھرمی لگنے لگا۔

خواجہ خلیق الرحمان کے جب اوپر تلے پانچ بیٹے ہوئے تو سب کو ان کی خوش بختی کا یقین ہو گیا لیکن ان کے دل میں جو پہلے بیٹے کے بعد سے ہی ایک پیاری سی "من موہنی سی" گڑیا بیٹی کی تمنا جاگ اٹھی تھی وہ مرجھا سی گئی۔ سن تو یہی رکھا تھا کہ بیٹی ہی والدین کا سہارا ہوتی ہے۔ غم خوار مونس ہوتی ہے۔ پرائی ہو کر بھی اپنی رہتی ہے جب کہ بیٹے اپنے ہو کر بھی پرائے ہی رہ جاتے ہیں۔ اپنا دکھ بے جی سے بانٹنا چاہا تو وہ ہنس پڑیں۔

"جھلیا! تُو سدا جھلا ہی رہے گا۔ باتیں بس باتیں ہی ہوتی ہیں۔ کوئی تقدیر کا لکھا تھم تو نہیں۔ تُو کیوں فکر کرتا ہے۔ چند سالوں کی بات ہے تیرے ویہڑے بھی ایک کے بعد ایک دو ہٹی اُتر ے گی تو سارے دیسوں والے چاؤ کرلے گا ان شاء اللہ۔" بے جی کی تسلی بھی ان کی ہمت نہ بڑھا سکی۔

"لیکن بے جی! کیا پتا آگے قسمت میں کیا لکھا ہے۔ آنے والی کیا تحفے لے کے آتی ہیں۔ کہیں بیٹے بھی نہ چھین کے لے جائیں۔ بالکل خالی ہاتھ ہی رہ جاؤں۔ لڑکے تو پھر اپنی بیویوں کے کہنے پر چلتے ہیں ناں۔"

"تُو تو نہیں چلتا اپنی زنانی کے کہنے پر۔" بے جی نے چھیڑا۔ "بے چاری کی جان قبض کئے رکھتا ہے، ساہ (سانس) سکھا کے رکھتا ہے اس کا۔"

"نہیں بے جی....." وہ شرمندہ سے سر جھٹکنے لگے۔ "میں نے کیا سانس سکھانا ہے وہ تو..... بس ہے ہی ایسی اور پھر وہ مجھے کچھ کہے گی تو میرے کچھ کرنے کی نوبت آئے گی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ تجھے الٹی سیدھی پٹیاں نہیں پڑھاتی تو پھر ثابت یہی ہوا کہ بہوئیں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں ساری کی ساری ڈائنیں ہی ہوں۔"

''اوہو بے جی۔ شفیقہ کو کیا تکلیف ہو سکتی ہے یہاں۔ میں آپ کا اکیلا اکیلا بیٹا۔ ابا م
اس کے گھر آنے سے پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نہ دیور جیٹھ کا رولا (شور)، نہ دیورا
جیٹھانی کا جلاپا، بس اس کا اپنا ہی راج ہے۔ ایک آپ ہی آپ ہیں جو مصلے پہ بیٹھے
اسے دعائیں دیتی رہتی ہیں۔ آپ سے اسے کیا شکایت۔ اس لئے گھر اتنا سکون سے چل ر
ہے لیکن میرے خیر سے پانچ بیٹے، سب کی اپنی اپنی بیویاں..... الگ الگ گھروں کی، الگ
الگ مزاج والی، الگ الگ عادتوں والی، اپنی اپنی فطرت اور خصلت لے کر آئیں گی۔ ہ
کتنے دن گزار سکیں گی اکٹھے ایک ہی چھت تلے۔ ایک کو دوسری کی عادتیں بُری لگیں گ
دوسری کو تیسری کے رہن سہن پہ اعتراض ہو گا، تیسری کا چوتھی سے نباہ کرنا مشکل ہو گا تو چوتھی
پانچویں کا وجود کھٹکے گا۔ ان کی کھینچا تانی میں..... بے جی میرے بچے..... میرے بیٹے بکھ
جائیں گے۔ میرا آشیانہ تنکا تنکا ہو جائے گا۔ کیا فائدہ میرے برسوں محنت کر کر کے انہیں
پالنے پوسنے کا۔ مجھے اتنی جان مار کر کیا ملے گا۔''

''اچھا چل چھوڑ ساری فکریں، بڑا آیا سیانا کہیں کا۔ بڑا پُتر تیرا پانچویں چڑھا ہے ا
چھوٹا ابھی گودی ہے اور تُو ان کی زنانیوں کے جھگڑے میں الجھا ہوا ہے۔ دماغ خراب ہو
ہے تیرا تو خلیق کا کے۔'' نصیحتیں ضائع جاتے دیکھ کے بے جی کی خفگی پھر عود کر آئی اور
ڈانٹ ڈپٹ کے بیٹے کے سر سے یہ فضول بوجھ اتارنے لگیں۔

''اور اگر اتنی ہی راتوں کی نیندیں اُڑی ہوئی ہیں تو پھر میرا مشورہ مان۔ لڑکوں کے
جوان ہوتے ہی ان کی شادی کسی ایسے گھر کر دینا جہاں پانچ بہنیں ہوں۔ سب کی بیویاں آ
بہنیں ہوں گی تو تیرا ڈر بھی جاتا رہے گا کہ دیورانی جیٹھانی کا جھگڑا گھر توڑ دے گا۔ ایک گ
کی پلی بڑھی بچیوں میں تو نباہ ہو جائے گا۔''

بے جی کے اس مشورے پہ خلیق الرحمان نے استہزائیہ ہنکارا بھرا اور چپ رہ
بڑھاپے میں تنہا رہ جانے کا خوف ابھی سے ان کی نیندیں اُڑائے ہوئے تھا اور یہ تب کی با
ہے جب ان کا سب سے بڑا بیٹا خواجہ فرقان خلیق میٹرک کے امتحان میں پاس ہوا تھا۔
پورے محلے اور ساری برادری میں لڈو بانٹتے نہ تھک رہے تھے۔ لڈوؤں کا ٹوکرا لے کر وہ بڑ
خوشی خوشی اپنے تاؤ جی کے ہاں گئے تھے۔ گھر بار اور کاروبار کی اُلجھنوں میں پڑے کئی
مہینوں وہاں جانا نہیں ہو پاتا تھا اور نہ وہ اپنے تاؤ جی سے بڑی محبت اور انسیت رکھتے تھے۔
جی کے گزرنے کے بعد انہی میں والد کی شبیہہ ڈھونڈتے تھے۔ شفیقہ نے یہ بڑا سا ٹوکرا دیکھ
حیرت سے پوچھا۔

''یہ کیا جی؟ سارے گھروں میں تو ڈبے اور تاؤ جی کے گھر پورا ٹوکرا۔''

''تو تاؤ جی کا نمبر (کنبہ) بھی تو بڑا ہے ناں۔ بڑے بھائی تو خیر سے پوتے والے بھی
ہو گئے ہیں۔ باقی سب بھی اپنے اپنے بیوی بچوں والے۔ بہنیں بھی اپنے اپنے گھر کی۔ تاؤ
جی ان کے گھر بھی تو چار چار لڈو پکڑائیں گے آخر پھوپھیاں ہیں وہ میرے فرقان کی۔''

''ہاں یہ تو ہے ماشاء اللہ جی بھی تو زیادہ ہیں تاؤ جی کے گھر۔ واقعی یہ ٹوکرا بھی پورا آئے
گا۔'' شفیقہ سر ہلا کے چپ ہو رہیں لیکن واپسی پہ جب خواجہ صاحب کا بجھا بجھا چہرہ، پیلی
پھنک رنگت اور گم صم کیفیت دیکھی تو چونک گئیں۔

''کیا بتاؤں شفیقہ! مجھے تو خود یقین نہیں آ رہا یہ سب کیسے ہوا۔ کس نے تاؤ جی کے ہنستے
بستے گھرانے کو نظر لگا دی لیکن..... کسی کے نظر لگانے سے ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا برسوں میں
بنائے گئے گھر اتنے کچے ہوتے ہیں کہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے اجڑ جائیں، برباد ہو جائیں۔''

''ہائے ہائے، خیر کی بات کریں خواجہ جی، اللہ خیر رکھے ہر طرف۔'' وہ ہول اٹھیں۔

''اب کیا خیر ہونی ہے شفیقہ! جا کر دیکھو ذرا تاؤ کا گھر۔ کیسی چہل پہل ہوتی تھی
سارے گھر میں۔ یہ لمبا دسترخوان بچھتا تھا۔ سارے مل کر کھانا کھاتے تھے۔ ہنستے بولتے تھے۔
اب..... اب تو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ وہی گھر ہے وہی چھت، بس فرق یہ پڑا
ہے کہ چند دیواروں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ تینوں بھائی الگ الگ ہو گئے ہیں۔ اپنا حصہ انہوں
نے علیحدہ کر لیا ہے۔ کاروبار میں بھی مکان میں بھی۔ جب سے انہوں نے چھوٹے دونوں
لڑکوں کی شادی کی ہے۔ خاندان میں یہی تذکرہ ہو رہا تھا۔ میں نے سن کر بھی یقین نہیں کیا۔
آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سراج اوپر چلا گیا ہے بیوی بچے لے کر، معراج اور وہاج دونوں
نے نیچے کے حصے کو دو حصوں میں بانٹ لیا ہے دیوار کھڑی کر کے اور تو اور جانتی ہو سراج بھائی
صاحب نے اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بھی گھر کے باہر سے رکھوائی ہیں۔

ان کے جھگڑے میں نقصان کس کا ہوا، تاؤ جی کا اور ان کے بیٹوں کا۔ خون کے رشتے کو
جلاپا لے ڈوبا۔ مجھ سے تاؤ جی کا حال دیکھا نہیں جاتا۔'' ان کی آواز بھر آئی تو شفیقہ کے آنسو
بھی چھلک پڑے۔

''تینوں نے ان کی ذمہ داری بھی بانٹ لی ہے۔ ایک ایک مہینہ تینوں کے پاس رہیں
گے اور تمہیں تو پتا ہے کہ کئی سالوں سے وہ کمر کی تکلیف کی وجہ سے سیڑھیاں نہیں چڑھ پاتے
ہی اُتر سکتے ہیں۔ جب بٹوارہ ہوا تو اصول کے مطابق پہلا حصہ بڑے بھائی کو ملا یعنی
سارے سامان کے ساتھ ساتھ تاؤ جی کو بھی مزدور اٹھا کر اوپر لے گئے اور تاؤ جی بتا رہے تھے

کہ برسوں جیسے ہی تیس دن پورے ہوئے، سراج بھائی صاحب انہیں اٹھا کر نیچے صحن میں بٹھ گئے، کپڑوں کا تھیلا پاس رکھا اور کال بیل دبا کے اوپر چڑھ گئے۔"

"ہائے اللہ۔" رقیق القلب شفیقہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ "اندھیر ہے..... میری توبہ۔ غضب پڑے گا ان پہ خدا کا..... ذرا خوف نہیں ان کے دلوں میں۔" روتے روتے ان کی نظر سفید پڑتے خواجہ صاحب پہ گئی تو رونا دھونا بھول کر انہیں سنبھالنے لگیں۔

"کیا ہوا جی آپ کو؟ حوصلہ کریں خواجہ جی..... یہ پانی پیجئے۔" چند گھونٹ پانی کے بھرنے کے بعد ان میں ذرا ہمت آئی تو ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولے۔

"شفیقہ! ہمارا بھی یہی حال ہوگا۔ یہی حال ہوگا..... دیکھ لینا۔"

"اللہ نہ کرے جی..... ہمارے بیٹے تو ماشاء اللہ....." وہ تسلی دینا چاہتی تھیں لیکن خواجہ صاحب نے بات کاٹ دی۔

"ہمارے بیٹے تو ماشاء اللہ پانچ ہیں..... تاؤ جی کے تین بیٹے اکٹھے نہ رہ سکیں تو ہمارے پانچوں کیسے رہ لیں گے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں تاؤ جی کا اتنا بڑا مکان تھا۔ آسانی سے تین حصے ہو گئے۔ میرا مکان تو بس اتنا سا ہی ہے، پانچ حصے تو ہرگز نہ ہو سکیں گے۔ اس کا مطلب ہے میرے بیٹے ایک چھت تلے بھی نہ رہ پائیں گے۔ ہم مہینوں ان کی شکل دیکھنے سے محروم ترسا کریں گے۔ ہماری بھی باریاں لگا کریں گی، ایک مہینہ فرقان کے گھر، ایک مہینہ لقمان کی طرف پھر وہاں سے عمران کے ہاں..... ہائے شفیقہ! ہمارے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے..... بہت برا....." وہ روہانسے ہو گئے پھر جیسے کسی خیال کے تحت فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

"نہیں میں اپنا بڑھاپا در در نہیں رولنے دوں گا ان لڑکوں کو۔ میں ان کی شادیاں نہیں کروں گا۔ ساری کل کل ہی ختم۔" شفیقہ خاتون کے تو ہاتھ پیر پھول گئے، اگرچہ انہوں نے فرقان سولہویں سال میں تھا اور کئی سالوں تک اس کی شادی کا امکان نہ تھا لیکن وہ جانتی تھیں کہ خواجہ صاحب کسی بات پہ اڑ جائیں تو پھر انہیں باز رکھنے کی ہر کوشش بے سود ہوتی ہے۔ اس لئے فوراً انہیں ٹھنڈا کرنے لگ گئیں۔ ان سے زیادہ کون جانتا تھا کہ یہ دعوے محض غصے میں آ کر کہے گئے چند الفاظ نہیں بلکہ پتھر پہ لکیر ثابت ہو سکتے ہیں اگر ان کا فوری سدباب نہ کیا تو.....

"کیسی باتیں کر رہے ہیں خواجہ صاحب! کیوں اپنی جگ ہنسائی کرانا چاہتے ہیں بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔ خدا کی رحمت سے کیوں ناامید ہوتے ہیں جی؟ ہو سکتا ہے

کہ یہ تمام خدشے بے بنیاد ثابت ہوں..... ہو سکتا ہے، آنے والیاں اور بھی زیادہ برکت لے کر آئیں آپ کے گھر..... ہو سکتا ہے ان کے آنے سے ہمارے بچے اور بھی زیادہ مضبوطی سے جڑ جائیں اور ہو سکتا ہے۔"

"بس کرو خدا کا واسطہ ہے چپ ہو جاؤ۔ تمہاری اس "ہو سکتا ہے" کے پیچھے میں یہ گھر داؤ پہ نہیں لگا سکتا۔ چلو مان لیا "ہو سکتا ہے" کہ کوئی ایک آدھ بہو اچھی بھی نکل آئے لیکن بیگم! ایک مچھلی سارے تالاب کو گندہ کرتی ہے۔ کوئی ایک بھی تاؤ جی کی چھوٹی بہوؤں جیسی نکل آئی تو پر خچے اڑ جائیں گے۔"

"لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اپنے بچوں کے گھر بسانے کا ارادہ ہی ترک کر دیں۔ اچھا ہی ہے کہ ہم دیکھ بھال کے خود ان کی بہنیں لے آئیں، بجائے اس کے کہ وہ باغی ہو کر خود کوئی قدم اٹھالیں۔"

"ناممکن نہ توڑ کے رکھ دوں نامرادوں کی۔ ایسی کی تیسی ان کے قدموں کی۔" وہ تلملا کے بولے۔

"ہو ہو خواجہ جی! آپ سمجھتے کیوں نہیں کہ وہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ کوئی پیڑ پودے نہیں جو قد آور اور سایہ دار ہونے کے بعد بھی آپ کے پانی لگانے کے محتاج رہیں گے۔"

"چلو تمہیں بھی کچھ نہیں سوجھا تو بے جی کی طرح پیڑوں اور درختوں کی مثالیں دینے لگیں۔" انہیں چند سال پہلے مرحومہ بے جی کے ساتھ اسی مسئلے پہ کی گئی بحث یاد آئی اور ساتھ ہی اچانک وہ مشورہ جسے انہوں نے سرسری سا سن کر سر جھٹک دیا تھا۔ ان کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار میں اپنے کئے گئے کسی فیصلے سے دستبرداری اختیار کر رہا ہوں۔ تمہاری بات مان لیتے ہیں۔"

"سچ؟ واقعی خواجہ جی؟" شفیقہ کو اتنی جلدی ان کے مان جانے کی امید نہ تھی۔

"ہاں لیکن میری ایک شرط ہے اور میں پہلے ہی واضح کر دوں اب مجھ سے بحث کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کی شادیاں ہوں گی مگر ایک ہی گھر میں۔" انہوں نے سختی سے کہا۔

"ہیں جی؟" وہ اس نئے فتوے پر حیران پریشان تھیں۔

"ہاں! ان پانچوں کی بیویاں بھی سگی بہنیں ہوں گی۔ ورنہ میری طرف سے بھلے ساری عمر کنوارے پھریں۔" انہوں نے نہ صرف فیصلہ صادر کر دیا بلکہ ہر ملنے جلنے والے کے ذریعے

زمانے بھر میں نشر بھی کرا دیا۔ لوگوں کے لئے یہ بات نئی بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ ہر چند کہ ابھی کوئی بیٹا شادی کے لائق نہ ہوا تھا لیکن قریبی رشتے دار یعنی لڑکوں کی خالائیں، ممانیاں، چچیاں وغیرہ ارد گرد نظر رکھنے لگیں کہ کہیں کوئی پانچ بہنوں والا مناسب گھرانہ ملے تو شفیقہ خاتون سے ذکر کیا جائے۔ یہ تلاش جاری رہی تاوقت کہ خواجہ صاحب کے بڑے صاحبزادے فرقان بی اے کرنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ شریک کاروبار ہو گئے۔ ایسے میں ایک دن خواجہ خلیق کے چھوٹے چچا ان سے ملنے آئے اور چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد فرقان کے رشتے کی بات چھیڑ دی۔

''ایک منٹ..... ایک منٹ چچا! آپ شاید بھول رہے ہیں، میں نے اپنے بیٹوں کی شادی کے سلسلے میں کیا فیصلہ کر رکھا ہے۔'' انہوں نے چچا رفیق کو مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی روک دیا۔ وہ برا سا منہ بنا کر کہنے لگے۔

''جانتا ہوں، میاں! جانتا ہوں اچھی طرح، جو تم نے برسوں سے زمانے بھر میں ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے۔ تمہاری یہ بات ذہن میں تھی جب ہی تو اس گھرانے اور اس کی بچیوں کو دیکھتے ہی مجھے تمہارا خیال آیا۔ ان لوگوں کو اچھی طرح جانچ پرکھ لینے کے بعد ہی میں تم سے بات کرنے آیا ہوں ورنہ ایسے گھرانوں کی کوئی کمی تو نہیں جہاں پانچ چھوڑ آٹھ آٹھ لڑکیاں ہوتی ہیں لیکن شادی بیاہ کے اور بھی سو معاملے ہوتے ہیں، سارا حساب کتاب، حسب نسب، شرافت، گن دیکھنے پڑتے ہیں۔ میں ہر طرح سے مطمئن ہو کر ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔''

''یہ تو آپ کی محبت اور عنایت ہے چچا جان! آج کل کون کسی کے لئے اتنی بھاگ دوڑ اور تردد کرتا ہے لیکن آپ نے وقت سے بہت پہلے ہی یہ ذکر چھیڑ دیا۔''

''وقت سے پہلے؟'' چچا حیرت سے بولے۔ ''ارے میاں فرقان پچیس کا ہونے کو آیا ہے، بڑی مناسب عمر ہے بیاہ کی اور پھر وہ نہ صرف تعلیم مکمل کر چکا ہے بلکہ اب تو تمہارے ساتھ کام میں بھی ہاتھ بٹا رہا ہے۔ بیٹے اپنے پیروں پہ کھڑے ہو جائیں تو انہیں گھر بار کا کر دینا چاہئے ورنہ قدم غلط راہوں کی طرف بھی لے جا سکتے ہیں۔''

''آپ کی بات درست ہے چچا جان لیکن.....'' وہ متردد ہوئے۔ ''لیکن فرقان اور لقمان ہی شادی کے قابل ہوئے ہیں۔ عمران، جبران کی تو کالج کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی اور مہران تو خیر ابھی بہت ہی کم سن ہے۔''

''خدا تمہیں عقل دے بے خلیق..... جوان بچوں کے باپ ہو اور ہر بات تفصیل سے سمجھانا

پڑتی ہے۔'' چچا نے بھتیجے کی عقل پہ ماتم کرتے ہوئے افسوس سے سر ہلایا۔

''پانچوں بیٹوں کا رشتہ ایک ہی گھر میں کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ تم اکٹھے ہی سب کے سروں پر سہرا باندھو۔ ارے جاؤ تو سہی ایک بار، بچیاں دیکھو، گھر بار دیکھو۔ پسند آئے تو دو بیٹوں کی شادی ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ باقی بچیاں بھی مانگ لو۔ اگر مہران کے جوان ہونے کا انتظار کیا تو فرقان کو بابا بنا دو گے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ کمال ہے چچا! اتنی سی بات میں سمجھ نہیں پایا۔'' وہ ایک دم سے ہلکے پھلکے ہو کر چچا رفیق کے ساتھ وہاں جانے کا پروگرام بنانے لگے۔

آناً فاناً تمام معاملات نمٹ گئے۔ خواجہ خلیق اور شفیقہ خاتون دونوں کو شیخ نواز حسین کا گھرانہ بے حد پسند آیا۔ شریف النفس، حلیم الطبع، درمیانی حیثیت کے نمازی پرہیزگار انسان تھے۔ محدود سی آمدنی میں چھ چھ بچیاں پال رہے تھے۔ جی ہاں چھ۔ چھٹی صاحبزادی چونکہ نہایت کم عمر تھیں اس لئے چچا جان نے ان کا ذکر کرنا ضروری نہ جانا تھا، بہرحال جہاں خواجہ صاحب اور ان کی بیگم کو حسب پسند اور حسب منشاء گھرانہ مل جانے کی تسلی ہوئی وہاں دونوں نے خدا کے حضور شکرانہ بھی ادا کیا کہ وہ انہیں ایک مجبور اور شریف کا بوجھ بانٹنے کی نیکی حاصل کرنے کی سعادت بخش رہا ہے۔ شفیقہ خاتون کو بس ایک بات کھٹک رہی تھی اور وہ تھی سب سے بڑی بیٹی مہ لقا کی عمر اور شکل وصورت۔ وہ تمام بہنوں سے ذرا کم رُو تھی۔ عمر بھی فرقان کے مقابلے میں زیادہ تھی اور یہ بات اس کے بالوں میں چمکتے تاروں اور آنکھوں کے نیچے پڑی جھریوں سے صاف واضح ہوتی تھی۔ رنگ بھی دبتا ہوا تھا، نین نقش اچھے تھے مگر بڑھتی عمر کے اثرات نے ان کی دلکشی کم کر دی تھی۔ اس بات کا ذکر شوہر سے کیا تو لمحہ بھر سوچنے کے بعد انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کہتی تم ٹھیک ہو لیکن اس ایک بات کے پیچھے میں باقی سب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ چلو، میں خود کچھ نہیں کہتا۔ تم فیصلہ کرو، بتاؤ مجھے کیا تمہیں شیخ صاحب کی شرافت کے بارے میں کوئی شبہ ہے؟ کیا تمہارے خیال میں آج کے دور میں چھ بیٹیوں کا بوجھ، انہیں عزت سے بیاہنے کی ذمہ داری ایک متوسط طبقے کے شخص کی کمر نہیں جھکا دیتی، اس کی راتوں کی نیند نہیں اُڑا دیتی؟ کیا تم نے ان سب بچیوں کا سلیقہ، گھڑا پا، سعادت مندی نوٹ نہیں کی؟ کیا تعلیم کے لحاظ سے بھی بڑی دونوں فرقان اور لقمان کے لئے مناسب نہیں ہیں؟ باقی تینوں بھی ابھی چھوٹی سہی لیکن کتنی باادب اور سلجھی ہوئی بچیاں ہیں؟ بولو؟'' وہ تائید میں سر ہلا کے رہ گئیں۔

''تو بس بیگم، بسم اللہ کر کے ہاں کہہ دیتے ہیں۔'' وہ رشتہ کرنے پہ تلے بیٹھے تھے اور

وہی ہوا جو وہ چاہتے تھے۔ فرقان اور لقمان کی شادیاں چند ماہ کے اندر اندر مہ لقا اور مہ پارہ سے ہوگئیں۔ ولیمہ کی تقریب میں عمران اور جبران کی مہ ناز اور مہ جبیں سے نسبت کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا گیا۔

خواجہ صاحب تو مہران اور ماہ نور کی منگنی کا اعلان بھی کرنا چاہتے تھے لیکن شیخ صاحب نے اپنی بیٹی اور خود مہران کی کم عمری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ اہتمام مناسب نہ جانا اور فی الوقت اس سلسلے کو ٹال دیا۔

☆======☆======☆

تقریباً پانچ سال بعد ان دونوں کی باری آئی تو مہران ایم بی اے کر رہا تھا اور ماہ نور نے ابھی ایف ایس سی کا امتحان دیا تھا۔ وہی روایت نبھائی گئی پھر سے ویسے ہی تقریب میں شفیقہ خاتون نے گلابی پشواز میں پیر بہوٹی بنی نازک سی نور کو اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے نام کی انگوٹھی پہنا دی۔ مہران کو بھی والدین کا یہ انتخاب پسند آیا۔

نور میں اپنی تمام بہنوں کی مشابہت تھی۔ بڑی باجی جیسا سرو قد.....بجیا جیسے لمبے گھنے بال.....اپیا جیسا گورا رنگ.....اور آپی جیسی میٹھی طبیعت.....ان تمام خصوصیات نے اسے سب میں ممتاز بنا دیا تھا۔ خاندان میں بھی یہی چرچا تھا کہ پانچوں بھائیوں میں مہران کا جوڑ ہی ٹھیک بیٹھا ہے۔ یہ چہ میگوئیاں سن کر بے چارے فرقان کے دل پہ بڑی بُری گزرتی۔ وہ مہ لقا کو دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا جوابی جان کی خواہش پوری کرنے کے چکر میں اس کے سر تھوپی گئی تھی، یوں تو وہ فرقان سے سال ڈیڑھ ہی بڑی تھی لیکن شادی کے موقع پہ بھی کم از کم پانچ سال بڑی معلوم ہو رہی تھی اور اب شادی کے چند سال گزرنے اور تین بچوں کے ہو جانے کے بعد وہ کہیں زیادہ بڑی اور عمر رسیدہ معلوم ہوتی تھی۔

ایک تو اس کا قد شوہر کے مقابلے میں چند انچ اونچا تھا۔ اوپر سے چوڑے چوڑے مردانہ شانے اور کمر درے بے ڈھنگے ہاتھ پیر، نقش مناسب ہی تھے۔ کچھ توجہ خود پہ دیتی تو پہن اوڑھ کے اچھی ہی لگتی لیکن اسے اتنی فکر ہی کہاں تھی۔ میکے میں بھی بڑی بہن ہونے کے زعم میں خود پہ غیر ضروری رعب دبدبہ طاری کر رکھا تھا اور سسرال آنے کے بعد سب سے بڑی بہو کا رتبہ ملا تو گردن میں مزید کلف آ گیا۔ لہجہ اور کڑک دار اور تیور مزید حاکمانہ ہو گئے۔ کوئی اور دیورانیاں ہوتیں تو چند دن بھی بڑی جیٹھانی کی حکمرانی برداشت کرتیں، نہ روک ٹوک سہتیں لیکن وہ تینوں بچپن سے عادی تھیں، بڑی باجی کی ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس لئے معمول کا حصہ سمجھ کے ٹال جاتیں۔ البتہ خواجہ صاحب اپنی بڑی بہو کے نظم و نسق سے بڑے مطمئن تھے

اور اس کا اظہار بھی برملا کرتے کہ گھر کو سنبھالے رکھنے اور اس عمدہ طریقے سے چلائے رکھنے میں مہ لقا کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔

ایک لحاظ سے یہ سچ تھا۔ گھر کا بجٹ وہی بناتی تھی۔ سب بھائیوں کی آمدن کے لحاظ سے حصہ لیا جاتا۔ کوئی کم دیتا تھا تو کوئی زیادہ لیکن سہولیات سب کے لئے یکساں تھیں۔ لقمان کے دونوں بار دو دو جڑواں بچے ہوئے اور اب حال ہی میں ایک بیٹی۔ اس طرح اس کے اخراجات زیادہ تھے۔ بڑے دونوں تو سکول جانے لگے تھے لیکن آمدنی اس کی فرقان اور عمران دونوں سے کم تھی۔ تین وقت کے کھانے کے علاوہ پھل، دودھ وغیرہ میں مہ لقا اس کا حصہ زیادہ رکھتیں۔ اسی طرح تمام بہوؤں کو ایک خاص حد تک ذاتی شاپنگ کی اجازت تھی، چاہے ان کے پاس ہزاروں روپے بھی کیوں نہ موجود ہوں۔ ان کڑے اصولوں نے گھر میں کبھی کسی قسم کی چپقلش پیدا نہ ہونے دی نا ہی حسد و رقابت کی فضا پیدا ہو سکی۔

ساس سسر اس کا سہرا اپنی بڑی بہو کے سر باندھتے تھے لیکن فرقان کو اس میں بیوی کی حیثیت سے کوئی خوبی نظر آتی۔ اس کے حکمیہ لہجے سے وہ چڑتا تھا، اس کی ہمہ وقت چڑھی بھنوئیں اسے زہر لگتی تھیں اور اس کا چوبیس گھنٹے گھر اور گھر داری کی فکر میں ہلکان رہنا اسے سخت برا لگتا۔ دونوں میاں بیوی کے درمیان موجود اس سرد مہری اور گریز کو سب محسوس کرتے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔

لقمان اور مہ پارہ بھی ہم عمر ہی تھے لیکن اپنی بڑی بہن کی طرح مہ پارہ بھی عمر سے چند سال بڑی ہی نظر آتی تھی، غصہ اس کی ناک پہ دھرا رہتا تھا لیکن مہ لقا کی طرح اس میں گھر داری کا رجحان کم تھا، اس کی دلچسپی دیگر امور کی طرف زیادہ تھی۔ اس نے بی ایڈ کر رکھا تھا لیکن ٹیچنگ کرنے کے بجائے گھر میں ایک ٹیوشن سنٹر کھول رکھا تھا کہ بقول اس کے سرکاری نوکری میں سر کھپائی زیادہ ہے اور معاوضہ کم جب کہ ٹیوشن سنٹر کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیسے بٹورے جا سکتے ہیں۔ اس سے اس کی فطرت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں پیسے کو اولیت دینے والی تھی لیکن پیسہ حاصل کرنے کے لئے عقل، ہنر اور محنت کے ساتھ ساتھ لگن کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بات اسے کوئی سمجھا نہیں سکتا تھا، حتیٰ کہ بڑی باجی بھی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو محلے کے چند ایک بچوں کے علاوہ کوئی اس سے پڑھنے نہ آتا تھا۔ اس کے اپنے پانچ بچوں نے ہی اس کی مت مار رکھی تھی۔ اپنے اسٹوڈنٹس پہ توجہ دینے کا وقت کہاں سے ملتا حالانکہ گھر میں اتنے لوگ ہونے کی وجہ سے اس پر کام کا دباؤ کم تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے، بڑی باجی نے ہر بار جڑواں بچوں کی وجہ سے رعایت دیتے ہوئے کم سے کم

ذمہ داری اس پر لگا رکھی تھی لیکن اس کے بعد بھی وہ اکثر ساری رات بچوں کی وجہ سے جاگنے کا بہانہ کر کے دن بھر کمرہ بند کر کے سوئی رہتی اور بچے وہ سنبھالتیں جوان کی چیچاں بھی تھیں اور خالائیں بھی۔

مہ پارہ کی شادی کے چوتھے سال جب آمنہ اور آئینہ کے بعد رضی اور وھی ہوئے تو دونوں چھوٹی بہنیں بیاہ کے آگئیں۔ نئی نویلی دلہنیں سارا دن ریں ریں کرتے بچے ہی اٹھائے پھرتیں۔ بڑی دونوں اپنی تائی سے مانوس تھیں۔ وہ ان کے کمرے میں ہی گھسی رہتیں، یوں بھی ندا اور نادران کے ہم عمر تھے اور کلاس فیلو بھی، چاروں بچوں کی آپس میں خوب بنتی۔

عمران اور جبران کی شادی ہوئی تو دونوں کی عمریں بالترتیب ستائیس اور چونتیس سال تھی۔ عمران ڈاکٹر تھا اور شادی میں یہ تاخیر اس کی تعلیم کی طوالت ہی کی وجہ سے ہوئی ورنہ خواجہ صاحب تو دونوں بڑے بیٹوں کی شادی کے دوسرے سال ہی دو اور بہوئیں لانے کے لئے مچلنے لگے تھے۔ مہ جبیں خود بھی بی ایس سی کر چکی تھی اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں میڈیکل ریپ کی جاب کر رہی تھی۔ عمران کی خواہش پہ اس نے اپنی جاب جاری رکھی اور یہ دونوں میاں بیوی کے لیے اچھا ہی تھا کیونکہ شادی کو تین سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی کوئی اولاد نہ تھی، عمران گورنمنٹ جاب کے علاوہ شام کو اپنے کلینک پہ بھی پریکٹس کرتا تھا۔ نتیجتاً گھر پہ کم ہی وقت گزارتا۔ ایسے میں اگر مہ جبیں کی یہ جاب بھی نہ ہوتی تو اسے میاں کا انتظار بھی کھلتا اور بچوں کا نہ ہونا بھی رنجیدہ کرتا لیکن یہ مصروفیات اسے اتنا تھکا دیتیں کہ گھر آنے کے بعد اپنے ضروری کام نمٹانے اور آرام کرنے کے علاوہ کوئی دوسری بات اس کے ذہن میں نہ ہوتی۔

مہ جبیں عمران سے دو سال چھوٹی تھی لیکن جبران اور مہ ناز دونوں ہم عمر تھے۔ لقمان اور مہ پارہ کی طرح ان میں عمر کا یکساں ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ایک تو جبران ماشاءاللہ لمبا چوڑا بہت تھا، دوسرے اس کے بال نوجوانی میں ہی گرنے لگے تھے۔ دونوں طرف سے نظر آنے والے چوڑے ماتھے نے اسے ذرا بڑی عمر کا ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اوپر سے مہ ناز چھوٹی موئی سی بوٹا سا قد رکھنے والی لڑکی تھی۔ رنگ اس کا سانولا اور نقش بھی عام تھے لیکن چہرے پہ غضب کی معصومیت اور نرمی تھی، یہی نرمی اس کے لہجے میں بھی تھی اور عادتوں میں بھی۔ اگر گھر کا ماحول پُرسکون بنائے رکھنے میں بڑی بہو کا زیادہ ہاتھ تھا تو چھوٹی بہو نے بھی آ کر گھر کے ماحول کو مثالی بنانے میں خاصا اہم کردار ادا کیا تھا ایک کے مزاج کی تلخی سب کو درست رکھتی تو دوسری کے مزاج کی نرمی سب کو شائستہ رکھتی۔

اب سب کی توجہ کا مرکز ماہ نور تھی۔ مہران کو بھی اپنی منگیتر سے دلچسپی ہو چلی تھی جو کہ ایک فطری سی بات تھی حالانکہ وہ کب سے جانتا تھا کہ بڑے بھائیوں کی طرح اس کا نصیب بھی شیخ صاحب کے گھرانے سے وابستہ ہے اور ماہ نور بھی بہنوں سے ملنے آتی جاتی رہتی تھی۔ اس وقت مہران کے دل میں ایسا کوئی شریر سا جذبہ کبھی نہیں جاگا تھا، دونوں کے درمیان سرسری سی ہیلو ہائے ہوتی، البتہ سب سے چھوٹی ماہ گل سے اس کی خوب بے تکلفی تھی۔ وہ تھی بھی تو اتنی پیاری اور گپلو سی۔ وہ اکثر اسے انکل کی بڑھاپے کی اولاد کہہ کر چھیڑتا اور بڑی بھابی سے جواباً ڈانٹ بھی سنتا جن کی بڑی بیٹی ندا اپنی سب سے چھوٹی خالہ سے بس ڈھائی تین سال ہی چھوٹی تھی۔ خالہ صاحبہ کا اپنے بھانجے بھانجیوں کے ساتھ خوب جھگڑا ہوتا، بات ہاتھا پائی تک آ جاتی۔ مہران بڑی مشکل سے اسے چھڑاتا، ندا اور نوید آئینہ، آمنہ کو لے کر خالہ کا منہ چڑاتے اپنے کمرے میں گھس جاتے اسے اپنے ساتھ نہ کھلانے کا اعلان کرتے ہوئے اور مہران اس کے پھولے پھولے گالوں پہ بہتے آنسو نہ دیکھ سکتا۔ جھٹ اسے موٹر سائیکل پہ بٹھا کے آئس کریم کھلانے لے جاتا۔ واپسی پہ چڑانے کی باری ماہ گل کی ہوتی۔

"دیکھا، تمہارے چاچو تمہیں نہیں لے کر گئے، وہ تو میرے فرینڈ ہیں....."

اور اب منگنی کے بعد اچانک ہی مہران کی دلچسپی اس گھر سے اور بڑھ گئی۔ اس نے ماہ گل سے اپنی دوستی کو استعمال کیا اور آئے دن چاکلیٹ، کہانیوں کی کتابیں لے کر وہاں جانے لگا۔ ماہ نور اگرچہ اس کے سامنے کم ہی آتی لیکن پل دو پل کا سامنا بھی دونوں کو خوشگوار سا احساس دے جاتا اور منگنی کے تیسرے مہینے ہی جب ماہ نور کے ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہونے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً امی جان کے ساتھ اپنی ہونے والی سسرال جا پہنچا۔ ہزار کوششوں کے بعد بھی وہ اس کی ایک جھلک تک نہ دیکھ سکا۔

وہاں سے لوٹنے کے تیسرے روز عمران بھائی نے اطلاع دی کہ وہ ماہ نور کو اپنے ہاسپٹل ایڈمٹ کر آئے ہیں۔ شیخ صاحب اور ان کی اہلیہ نے بیٹی کے آئے روز کے بخار کو اہم نہ جانتے ہوئے خود ہی علاج معالجہ کی طرف خاص توجہ نہ دی تھی، پیراسٹامول وغیرہ دیتے رہے اور ان کی سادگی یا لاپروائی نے یہ دن دکھایا کہ نہ صرف ٹائیفائیڈ بگڑ گیا بلکہ یرقان نے بھی جکڑ لیا۔ عمران بھائی اپنی غفلت کو کوس رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مہ جبیں پہ بھی بگڑ رہے تھے کہ انہوں نے بھی اتنی سمجھ بوجھ اور قابلیت رکھنے کے باوجود بہن کو کسی اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت کیوں نہ سمجھی۔ کم از کم انہیں تو بتا دیتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ ان کا تردد اور فکر سب کو پریشان کر گیا کہ ہو نہ ہو ضرور کوئی خطرناک بات ہے اور اگلے دن جب خواجہ صاحب

کے ساتھ ساتھ باقی تمام اہلِ خانہ بھی ماہ نور کی عیادت کے لئے ہاسپٹل گئے تو واپسی پہ سب کے چہروں پہ ایک ہی تاثر تھا۔ بھابیاں تو چپکے چپکے رو بھی رہی تھیں۔

مہران سے رہا نہ گیا۔ وہ صبح ہی مہ ناز بھابی کے ساتھ ہاسپٹل گیا، ماہ نور کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اس کی رنگت خطرناک حد تک پیلی پڑ چکی تھی۔ عمران بھائی کے مطابق اس کا جسم دوا قبول نہیں کر پا رہا تھا اور بغیر دوا کے وہ یرقان کے زرد دیو سے کتنی دیر تک لڑ سکتی تھی اور وہی ہوا جس کا خدشہ سب کے دلوں میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا لیکن کوئی بھی بدشگونی کے ڈر سے ایک دوسرے سے اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہ کر پا رہا تھا۔ اسی شام ماہ نور کی وفات کی خبر آئی۔

☆======☆======☆

پچھلے آدھ گھنٹے سے وہ گرم ترین برآمدے میں بیٹھا راحت کی دہائیاں سن رہا تھا۔ گرمی اور لو نے پسینے چھڑا رکھے تھے تو اس کے مسلسل اندر چلنے کے اصرار نے مہران کے چھکے چھڑا رکھے تھے۔

"یار! تو سمجھتا کیوں نہیں۔ مجھے زکام ہے۔ اندر اے سی میں نہیں بیٹھ سکتا۔" اس نے بہانا بنایا۔

"گرمی کے زکام میں اے سی کچھ نہیں کہتا بلکہ اور طبیعت بحال ہو جائے گی۔" راحت نے ماتھے سے بہتے پسینے کو رومال سے خشک کرنا چاہا لیکن وہ پہلے ہی اس قدر تر بتر ہو رہا تھا کہ چہرہ اور چپچپا ہو گیا۔

"میرا زکام ہے، مجھے زیادہ پتا ہے، کس چیز سے خراب ہوتا ہے اور کس چیز سے صحیح۔" اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا تو وہ مشکوک سا ہو کے اسے بغور دیکھنے لگا۔

"کہیں سے آثار نظر تو نہیں آ رہے نزلہ زکام کے۔" وہ جھٹ بُرا مان گیا۔

"میں نے کہا ناں۔ میرا زکام ہے مجھے ہی پتا ہے۔ ویسے بھی میں اپنی تکلیفوں کا اشتہار نہیں لگواتا..... جیسے غم اور دکھ دل کے اندر ہی پلی جاتا ہوں ویسے بیماریاں بھی چھپا کر رکھتا ہوں۔" مہران نے چہرے پہ "دیوداس" کے سے تاثرات سجاتے ہوئے کہا تو راحت جل کر رہ گیا۔

"ہاں ہاں۔ پتا ہے..... مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا یہ "اٹل حقیقت" کہ تم ہر دکھ اور غم دل کے اندر چھپا کے رکھتے ہو..... ہونہہ..... بچپن سے جانتا ہوں تمہیں، کانٹا بھی چبھے تو چیخ چیخ کر سارا زمانہ سر پہ اٹھا لیتے ہو، ذرا ذرا سی بات پہ تمہارے دکھڑے ڈھائی ڈھائی گھنٹے

تک میں ہی سنتا رہا ہوں۔"

"ابے موٹی کھال، کیوں اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی گردن توڑ بخار میں مبتلا کرتا ہے۔ اٹھ اندر چل، اے سی آن نہیں کرتے۔ صرف پنکھا چلاؤں گا۔"

"وہ تو یہاں بھی چل رہا ہے۔" اس نے برآمدے کی چھت پر لگے باوا آدم کے زمانے کے پنکھے کی طرف اشارہ کیا جو بغیر سائلنسر کے موٹر سائیکل کی آوازیں نکالتا ہوا دمے کے پرانے مریضوں کی طرح تھکی تھکی سی پھونکیں مار رہا تھا۔

"ارے یہ تو جہنم کی آگ پھینک رہا ہے۔ اندر چل، میرے یار، کمرہ ٹھنڈا بھی ہے، پُرسکون بھی، آرام سے بیٹھ کر کوئی مووی دیکھیں گے۔"

"یار! اس کھلی فضا میں....." وہ شاید موسم کی شان میں کچھ اور قصیدہ پڑھتا لیکن راحت کا میٹر تو لفظ "فضا" پہ ہی ڈاؤن ہو گیا۔

"مروتم اس "پُر فضا مقام" کے مزے لوٹتے ہوئے۔ میں باز آیا ایسی مہمان نوازی سے۔ میں تو اندر جا رہا ہوں۔ تمہاری مرضی اپنے گھر جاؤ یا پھر یہیں میرے گھر کے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے گیت گاتے رہو۔"

"موسم ہے عاشقانہ..... موسم ہے عاشقانہ۔"

مہران نے اس کی بات میں گرہ لگاتے ہوئے تان بلند کی، وہ واقعی اندر جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اے دل کہیں سے ان کو
ایسے میں ڈھونڈ لانا
ایسے میں ڈھونڈ لانا۔"

اندر جانے کے ارادے سے مڑتا راحت ٹھٹکا۔ گانا اس نے اسے چڑانے کے لئے شروع کیا تھا لیکن سوز اور تڑپ کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اس نے ٹٹولتی نظروں سے اسے دیکھا، اس کی بے قرار نظریں گیٹ پہ جمی تھیں، ٹانگ پہ رکھی ٹانگ اضطرابی کیفیت میں ہل رہی تھی اور مدھم ہوتی آواز کے ساتھ گنگناتا وہ خود مجسم انتظار بنا ہوا تھا۔

"اے دل کہیں سے ان کو....." اور ساتھ کال بیل کی خوشگوار سی چہکار اس کے لبوں پہ مسکراہٹ لے آئی۔

راحت کی مشکوک اور سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے بے ساختہ پھیلے لب سمیٹے اور جگنو کی سی چمکتی آنکھوں میں زمانے بھر کی معصومیت سمیٹتے ہوئے وضاحت کی۔

''تمہاری کال بیل کی آواز مجھے بڑی مدھر لگتی ہے، دل کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی، گنگناتی ہوئی.....'' راحت نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے قدم گیٹ کی جانب بڑھائے۔

''تم سے کچھ بعید نہیں میرے بھائی، تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہیں اگر یہ سڑا ہوا موسم عاشقانہ لگ سکتا ہے تو یہ منحوس چیں چیں بھی مدھر لگ سکتی ہے۔'' گیٹ کھولتے ہی اس کی زبان کو بریک لگ گئی۔ جیسے ساری بات سمجھ میں آگئی اس نے پیچھے مڑ کر اسے بغور دیکھا۔

کریدتے انداز پہ مہران قدرے سٹپٹایا۔ راحت نے مسکراتے ہوئے اسے بعد میں نمٹنے کا اشارہ دیا اور باہر متوجہ ہوا۔ جہاں گرمی سے گھبرائی ہوئی معطر کھڑی اسے حیران نظروں سے تک رہی تھی جو اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے نہ جانے کون سے مذاکرات نمٹا رہا تھا۔

''آؤ مٹھو! آؤ.....'' اس نے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے معطر کو اس کے پیار کے نام سے پکارا تو بے ساختہ اس کی گھبرائی گھبرائی نظریں برآمدے کی چیئر پہ بیٹھے مہران کی طرف اٹھ گئیں جو اس کے اس نام کو بھرپور انجوائے کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے لبوں کی مسکراہٹ ''مٹھو مٹھو'' پکار رہی تھی۔

''وہ راحت بھیا! آج میرا پیپر تھا سیکنڈ ٹائم کا، امی نے کہا تھا کہ اگر جلدی فارغ ہو جاؤ تو ماموں کی طرف چلی جانا، دوپہر کو اتنی دور تک ویگن میں سفر مت کرنا..... اس لئے میں.....''

''بھئی، جب مرضی آؤ، تمہارے ماموں کا گھر ہے بلکہ چلو اچھا ہے کوئی تو بہانا بنا تمہارے یہاں آنے کا۔'' وہ معطر کا نروس ہونا بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔ ''ویسے بھی میں نے تم سے کب پوچھا..... میں تو کسی سے بھی نہیں پوچھتا۔'' آخری جملہ اس نے مہران کے قریب آکر آہستہ سے کہا تھا۔ خطرے کی گھنٹی سر پہ بجتے دیکھ کر وہ فی الفور اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم اندر دادو کے کمرے میں چلی جاؤ مٹھو! امی تو گھر پہ نہیں، اگر بھوک لگے تو کھانا وانا خود نکال کر کھالو۔ مینا تو دوپہر کو اصطبل بیچ کر سوتی ہے۔ اس کے آسرے پہ مت رہنا۔'' راحت کی تاکید پہ وہ مسکرائی تو جیسے مہران کو سچ مچ آدھ گھنٹے کی گرمی اور حبس کی کوفت زائل ہوتی محسوس ہوئی۔

''میں جانتی ہوں راحت بھیا! لیکن مجھے فی الحال بھوک نہیں، ناشتہ دیر سے کر کے گھر سے نکلی تھی۔''

''جاؤ پھر سکوائش بناؤ اور ایک جگ ہم دونوں کے لئے بھی لے آؤ۔'' معطر کو ہدایت

دیتے ہوئے اس نے جانے کے لئے پر تولتے مہران کی راہ روکی۔

''تم کہاں چل دیئے، گیت مکمل نہیں کرو گے؟ یار! سچ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔ تمہاری آواز میں اتنا سوز اور گداز ہے، واقعی سماں باندھ دیا تم نے..... واہ..... واہ..... ایسا حسین موسم، مست نظارے اور تمہاری آواز..... ہو جائے پھر موسم ہے عاشقانہ۔'' وہ چیئرز گھسیٹ کے اور دھوپ میں لے آیا۔

''کہو تو لان کے عین وسط میں نرم گرم سی گھاس پہ گاؤ تکیے لگوا دوں۔'' وہ کان کھجاتے ہوئے مہران کو چڑا رہا تھا۔

''بس کر..... بہت اوور ایکٹنگ ہو گئی۔ میں جا رہا ہوں، تمہارا دل چاہے تو گھاس پہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھو چاہے جامن کے پیڑ سے لٹک کر.....'' لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی راحت نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔

''اچھا اب راز کھل گیا تو بھاگنے کی تیاری۔ چل شرافت سے میرے ساتھ اندر چل۔ اب تو گرمی میں بیٹھنے کا کوئی ارمان نہ رہا ہوگا۔'' اس نے زبردستی اسے اپنے کمرے کی طرف گھسیٹا اور مہران نے خود کو اس کی ہر طرح کی جرح کے لئے تیار کر لیا۔

پچھلے پون گھنٹے سے سخت ترین گرمی میں نہ جانے کس چیز نے اسے ہر بات سے بیگانہ کیا ہوا تھا۔ اب نیم تاریک کمرے میں آکر اسے یک دم احساس ہوا کہ اندر اور باہر کے موسم میں کتنا فرق ہے۔ تپش سے جھلستے بدن کو ایک دم ہی ٹھنڈک بھرا لمس ملا۔ راحت کا اے سی آن کرنے کے لئے بڑھتا ہاتھ رک گیا۔

''اوہو، کہیں تمہیں چھینکیں نہ آنا شروع ہو جائیں۔''

''ایک بار کہہ چکا ہوں کہ اب اوور ایکٹنگ بند کر دو۔'' مہران نے جھلا کر اسے کشن دے مارا۔ وہ پھر بھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولتا رہا۔

''یار! تم بھی کمال کی چیز ہو، گرمی نے بھی تمہارے چہرے کی تازگی کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ مجھے تو رونق پہلے سے بڑھ کر نظر آرہی ہے۔ ہاں بھئی، اب ہر کسی کے نصیب میں کہاں یہ ٹھنڈے جھونکے۔ ہمیں تو ٹھنڈے پانی کا ایک شاور لے کر ہی حواس ٹھکانے لانے ہوں گے۔'' وہ تولیہ کاندھے پر رکھتا واش روم میں گھس گیا اور مہران نے تکیے پہ کمر ٹکائی لیکن چند ہی سیکنڈ بعد دروازے پہ ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے سنبھل کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

لیکن سکوائش کے جگ کے ساتھ اندر آنے والی معطر ہی تھی۔ عرصے بعد اسے روبرو پا کر مہران کا دل خوشگوار سی تال پہ دھڑک اٹھا۔ کمرے میں اسے تنہا پا کے معطر کے چہرے

پہ ذرا سی گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔

"وہ..... راحت بھ....."

"دفع کرو اسے۔ تم کچھ دیر یہاں بیٹھو میرے پاس۔" اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا لیکن وہ مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ہر بار آپ ہی کی بات نہیں مانی جائے گی۔"

"ایک منٹ..... پلیز!" اسے پلٹتے دیکھ کر مہران نے بے چینی سے پکارا

"جی..... فرمائیے!" وہیں دروازے کے پاس کھڑے کھڑے اس نے پوچھا۔

"فرمانا کیا خاک ہے۔" اس کا تکلف مہران کو زہر لگ رہا تھا۔ "زحمت نہ ہو تو ایک گلاس سکوائش پلا دیجئے۔" اب کے اس نے معطر سے بڑھ کے تکلف پیش کیا جسے محسوس کر کے اس کے لبوں پہ پھر سے وہی گدگداتا تبسم ٹھہر گیا، جو پہلی بار میں مہران کو لوٹ کر لے گیا تھا۔

وہ ہتھیلیوں میں چہرہ پھنسائے بڑی دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب وہ یہاں آئی تھی تو کالج یونیفارم میں تھی، سفید لباس میں دھوپ کی تمازت سے تمتمایا چہرہ بے حد سرخ لگ رہا تھا۔ اب اس نے ایک ڈھیلا ڈھالا سا لان کا سوٹ پہن رکھا تھا جو غالباً مینا کا ہوگا۔ اس نے منہ ہاتھ دھونے کے بعد تولیے سے پونچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، ہلکی ہلکی سی نمی کے آثار گالوں پہ نمایاں تھے اور ماتھے کے ذرا اوپر بالوں پہ چند سنہرے قطرے بھی دمک رہے تھے۔

"لیجئے!" گلاس اس کے سامنے ٹیبل پہ رکھ کے وہ پھر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہران دوبارہ کوئی بہانا بنا کے اسے کچھ دیر اور روکنا چاہتا تھا لیکن واش روم سے مسلسل آتی بہتے پانی کی آواز ایک دم خاموش ہوئی تو اسے خود پہ ضبط کرنا پڑا۔

بہرحال وہ اپنی بے قراری کی وجہ سے معطر کی ناراضی افورڈ نہیں کر سکتا تھا اور معطر..... وہ اس معاملے میں حد سے زیادہ حساس اور محتاط تھی، اسی لئے تو اس کا رابطہ مہران سے صرف ای میلز اور ٹیلی فون کا لز تک محدود تھا اور آج کئی ماہ کے بعد صرف اور صرف اس کی ضد اور اصرار کے ہاتھوں تنگ آ کے وہ یہ راہ نکالنے پہ مجبور ہوئی تھی تاکہ مہران کی اسے ایک جھلک دیکھ لینے کی خواہش بھی پوری ہو جائے اور اسے کسی ایسے امتحان سے بھی نہ گزرنا پڑے جس کے نتیجے میں اس کے گھر والوں کا اس کی ذات پر اعتماد ڈگمگا جائے۔ اس کی شوخ اور قدرے بولڈ شخصیت کے پردے میں پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگاتا یہ نسوانی وقار ہی تو

مہران کو بھایا تھا۔ اسے آج بھی اپنی اور اس کی پہلی ملاقات یاد تھی۔

☆======☆======☆

بات زیادہ پرانی نہیں تھی بلکہ مہران کو تو جیسے کل کا واقعہ لگتی۔ ایسا ہی ہوتا ہے، دن جب خوشگوار ہو جائیں، پہر جب سبک ہو جائیں اور راتیں خواب بننے میں کٹنے لگیں تو ایسا ہی ہوتا ہے اور ایک وقت وہ بھی تھا جب اسے تمام شب و روز ایک جیسے لگتے تھے..... جامد..... تھکے ہوئے..... طویل..... اور اکتائے ہوئے۔

یہ بھی ان ہی مشکل دنوں کا ذکر ہے۔ ماہ نور کی وفات کو چھ ماہ گزر چکے تھے لیکن خواجہ ہاؤس اور اس کے مکینوں پہ ابھی تک روز اول والی سوگواری نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ خود مہران بھی خود کو اس مہیب اداسی سے بچا نہ پایا تھا۔ بلکہ دیکھا جائے تو سب کے دلوں پہ غم اور صدمے نے حملہ ہی اب کیا تھا۔ ماہ نور کی آناً فاناً بڑھتی عام سی تکلیف اور پھر ایک آدھ دن میں ہی وفات کی خبر نے پہلے پہل سب کو جس جھٹکے سے دوچار کیا تھا وہ حیرت کا تھا۔

کسی کو یقین ہی نہ آتا تھا کہ ایک ہنستی کھیلتی زندگی سے بھرپور لڑکی جس کی آنکھوں نے ابھی ابھی خوابوں کا ذائقہ چکھا تھا، ہمیشہ کے لئے پلکیں موند چکی ہے۔ جیسے جیسے حیرت کا شکنجہ ڈھیلا پڑتا گیا، دکھ کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ تمام بھابیاں تو نڈھال تھیں ہی، بچے بھی اپنی ہوش میں پہلی موت دیکھنے پر سہمے ہوئے تھے۔ غرض یہ کہ گھر کا ماحول بھی اس قدر ماتمی اور سوگوار سا تھا کہ مہران کو سنبھلنے کا کوئی سہارا نہ مل سکا۔ اسی عالم میں اس کا ایم بی اے کا رزلٹ آیا۔ اس کی شاندار کامیابی نے خواجہ ہاؤس کے در و دیوار پہ چھائے جمود پہ پہلی دراڑ ڈالی اور کئی ماہ سے ایک دوسرے کو دلاسا دیتے مکینوں نے خود کو مبارک باد دیتے سنا۔

ان ہی دنوں نشاط باجی کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ راحت سے اس کی دوستی نئی نہیں تھی۔ وہ دونوں ہائی سکول سے ایک ساتھ تھے لڑکپن کی ہلکی پھلکی سی دوستی کالج جا کر یارانے میں بدل گئی۔ راحت اگر چہ بی کام کرنے کے بعد اپنے ابو جی کے ساتھ آفس جانے لگا تھا لیکن دونوں کی دوستی پہلے سے کہیں زیادہ گہری ہو گئی تھی کیونکہ کالج کی دوستی اب گھر تک پہنچ گئی تھی۔ مہران اب اس سے ملنے اس کے گھر جایا کرتا تھا، اس کے مختصر سے گھرانے کا سادہ اور پُرخلوص ماحول اسے بے حد بھایا تھا۔

نشاط باجی کی ڈانٹ ڈپٹ، چھوٹی مینا کی شکایتیں سننے اور امی جی اور ابو جی کی نصیحتیں سننے میں اسے مزہ آنے لگا۔ ماہ نور کے بعد اس کا دل ہر چیز سے ایسے اچاٹ ہو گیا تھا کہ اس نے راحت کے گھر تک جانا رفتہ رفتہ نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا۔ راحت جانتا تھا کہ اس کے

ابی کی طرف سے تمام بیٹوں کے دوستوں کا گھر تک بلا وجہ آنا ممنوع ہے۔ اس نے اس بات کا کبھی برا بھی نہیں مانا تھا لیکن مہران کی پژمردگی اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ کھینچ کھانچ کے اسے اپنے ساتھ لے آتا۔ نشاط باجی، مینا، امی جی سب ہلکی پھلکی گفتگو کے ذریعے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کرتے۔ سب ہی اس گھرانے پہ گزرنے والے سانحے سے واقف تھے اور واقعی چند گھنٹے سب کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرتا لیکن گھر آنے کے بعد وہی افسردگی اور یاسیت کی لہر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

راحت کے گھر شادی کی تیاریاں زوروں پہ تھیں۔ آج شام میلاد کے بعد ڈھولک رکھنے کا پروگرام تھا۔ راحت اپنی امی جی کے ساتھ اس کے گھر دعوتی کارڈ دینے آیا تھا۔ امی جان اور بھابیوں سے میلاد میں شریک ہونے کے پُرزور اصرار کے بعد اس نے مہران کو رات ڈھولکی کے لئے پہنچنے کی سختی سے تاکید کی۔ بھابیوں سے تو اس نے مصلحتاً اس رسم میں شامل ہونے کے لئے نہیں کہا تھا، مبادا وہ برا محسوس نہ کریں کیونکہ مہران کا کہنا تو یہی تھا کہ ابھی تک وہ خود کو چھوٹی اور چہیتی بہن کے دکھ سے نکال نہیں پائیں۔

''تمہارا دماغ خراب ہے؟ میں اس خالص گھریلو اور زنانہ محفل میں کیا کروں گا؟'' مہران نے اس کے اصرار پہ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ڈھولک پہ چمچہ بجاؤ گے، ارے یار مل بیٹھنے کا بہانہ ہے یہ سب اور کیا۔ سب یار دوست مل بیٹھیں گے، گپ شپ لڑے گی، چائے قہوے کا دور چلے گا، بیک گراؤنڈ میں لائیو میوزک الگ سے بج رہا ہوگا۔ بتو تیرے ابا کی اونچی حویلی..... بتو میں اینٹیں چنتا آیا۔'' وہ بھانڈوں کی طرح تالیاں پیٹنے لگا تو مہران نے ناگواری سے اسے گھورا۔

''یہی حرکتیں اگر تم نے رات کو بھی کرنی ہیں تو میرے آنے کی امید مت رکھنا۔ مجھے شوق نہیں بے سُری قوالیاں سننے کا۔''

''اچھا میری توبہ جواب میں نے چوں کی آواز بھی نکالی اپنے منہ سے لیکن تجھے بھی قسم ہے میری دوستی کی کہ اپنی بہن کی خوشی میں تمام رسموں میں پورے دل کے ساتھ شریک پڑے گا۔'' اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مہران کو آتے ہی بنی۔

''او تیرے بنڑے دے..... متھے تے.....''

مسرت نذیر کی آواز میں اس مشہور پنجابی گیت کو وہ کئی بار سن چکا تھا لیکن وہ نہیں پا رہا تھا کہ اس میں اتنا ہنسنے والی بات کون سی ہے۔ کافی دیر سے برآمدے میں بیٹھ گیت کے ان بولوں کی تکرار بھی سن رہا تھا اور ساتھ ہی بے ساختہ امنڈنے والے قہقہوں

بھی۔ ہنسی کا طوفان ذرا تھما تو پھر سے ایک لڑکی نے ڈھلی پہ تال مارتے ہوئے آواز بلند کی۔

''متھے تے چمکن.....'' ابھی وہ یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ پھر سے کھی کھی اور ہاہ ہاہ شروع ہوگئی۔ اندر سے نشاط باجی پیر پٹختی نکلیں۔

''منع کرلو ان سب کو راحت ورنہ میں ابو جی کو بتا دوں گی۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔ راحت، جس کے اپنے دانت اندر نہیں جا رہے تھے۔ سنجیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''باجی! میں سمجھتا ہوں..... لیکن آپ کیوں چڑ رہی ہیں۔ اب یہ ہنسی مذاق تو چلتا ہی ہے ناں۔'' وہ ناراض ناراض سی بہن کو شانے سے تھامتا اندر لے گیا اور جانے کیا کہا کہ کچھ دیر کے لئے ہنسی کا طوفان تھم گیا۔ خود وہ باچھیں چیرتا تھوڑی دیر بعد ہی آ گیا۔

''بڑی بدتمیز ہے یہ مینا بھی۔ سارا شوشا اسی نے چھوڑا ہوا ہے۔'' پھر مہران کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہنے لگا۔

''یار! دراصل یہ جو منور بھائی جان ہیں، میرے ہونے والے بہنوئی، بالوں کے معاملے میں ذرا ہاتھ تنگ ہے ان کا۔ ماتھے سے کافی آگے جا کر حدود شروع ہوتی ہیں۔ اسی لئے.....''

اور مہران کو ''متھے تے چمکن بال'' پہ لڑکیوں کا کھلکھلانا سمجھ میں آ گیا۔ اس نے بے ساختہ وارد ہوئی مسکراہٹ کو منہ پھیر کر چھپایا۔

''پھر بھی یہ ہے تو بدتمیزی۔ تمہیں سختی سے منع کر کے آنا تھا مینا کو۔ بے چاری نشاط باجی کو کتنا برا لگتا ہوگا۔''

''مینا کوئی اکیلی تو ہے نہیں جو میں اسے ڈپٹ کر چپ کرا دوں گا۔ جتنے کا جتھا ہے اس کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر منٹو، اس کی موجودگی میں سب ہی لڑکیاں شیر ہوئی بیٹھی ہیں۔''

''اچھا چلو ایسا کرتے ہیں گانے کے بول بدل لیتے ہیں۔'' ایک شوخ و شنگ سی آواز نے رائے دی۔

''متھے تے ٹاواں ٹاواں (کہیں کہیں، اِکا دُکا) بال میرے بنڑے تے۔''

''بس کرو، میں اب تم سب کو مارنے لگوں گی۔'' باجی نے دھاڑ کر چپ کرایا۔

''ہم کیا کریں باجی! میلاد میں آپا جی نے ایسی اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں، اب جھوٹ بولنے کو دل ہی نہیں کرتا۔'' مینا کی منمناتی آواز پہ سب نے تائید کی۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم نے ابھی اور اسی وقت اس متنازعہ گیت کو چھوڑ کر کوئی اور گیت

شروع نہ کیا تو میں یہ مقدمہ ابو جی کے پاس لے جاؤں گی۔" اس دھمکی کے ساتھ ہی ڈھولک کی تھاپ گونجی اور کورس بجنا شروع ہو گیا۔

"بجیاجی، بجیاجی

بھولے بھالے بجیاجی....."

شروع سردی کے دن تھے۔ ابھی خنکی اتنی بڑھی نہیں تھی۔ راحت نے نادر اور شعیب کے ساتھ مل کر نائٹ بسنت منانے کا پروگرام بنا ڈالا۔ مارے جوش کے سب لڑکوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مہران کو پتنگ بازی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ وہیں برآمدے میں شمس سا بیٹھا ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ نادر فوراً سے پیشتر اپنی موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے گھر سے پتنگیں اور گڈے لینے چلا گیا۔ شعیب اور یاسر وری، کرسیاں اور ڈیک چھت پر پہنچا رہے تھے۔ مظہر کو سرچ لائٹ کا انتظام کرنے بھیج دیا تھا اور خود راحت اسٹور میں پچھلے سال کی بسنت کے بچے کھچے مانجھے، گڈے نکلوا رہا تھا۔ سب کی افراتفری، بھاگم دوڑ اور سب سے بڑھ کر پیچھے کے کمرے سے آتی بے سُری آوازوں اور ڈھولک کی تھپ تھپ نے اسے اتنا بے زار کیا کہ وہ اٹھ کر برآمدے کے دوسری جانب چلا گیا جہاں کچن کی کھڑکی اور بیرونی دروازہ کھلتا تھا۔ برآمدے کے ایک طرف پنجرے میں لَو برڈز رکھے تھے۔ اس نے جالی کو ہلکا سا تھپتھپایا مگر ایک بھی پرندہ پنجرے میں رکھے گئے چھوٹے چھوٹے گھڑونچوں سے باہر نہ نکلا۔

"ٹیں ٹیں۔" طوطے کی کراری آواز پہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ گرل کے دروازے پہ لٹکے لکڑی کے خوش نما مختصر سے پنجرے میں لمبی سی سبز اور پیلی دُم والا طوطا پھدک پھدک کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ مہران اس کی طرف بڑھ گیا۔

"مٹھو..... میاں مٹھو، چوری کھاؤ گے، میاں مٹھو۔" وہ آہستہ آہستہ اسے پکارنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بچپن لوٹ آیا ہو۔ ایک پُر رونق اور بھرے پُرے گھر میں قدرے تاریک اور تنہا گوشے میں ایک معصوم سی ذی روح کے ساتھ اٹکھیلیاں کرنا اسے عجیب پُر لطف سا لگا۔

"مٹھو، مٹھو نے کیا کھانا ہے، بسکٹ۔" وہ طوطے کو چمکارتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی بسکٹ توڑ کر پنجرے میں ڈالنے لگا تھا کہ ایک خنکی بھری آواز پہ بری طرح چونک گیا۔

"بدتمیز شرم تو نہیں آتی اس طرح....." کچن کی کھڑکی سے کسی لڑکی نے بے حد جارحانہ انداز میں اسے لتاڑنا چاہا لیکن پھر اس کی حواس باختہ سی شکل، ہاتھ میں پکڑے بسکٹ کے ٹکڑے اور سامنے لٹکے طوطے کے پنجرے کو دیکھ کر رک گئی۔ خجالت کے رنگ اس کے نکھرے چہرے پہ صاف نظر آ رہے تھے۔

مہران کافی دیر کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں ہکا بکا کھڑا رہا پھر دفعتاً لڑکی کے ہاتھ میں پرنس کوکونٹ کوکیز کا ڈبہ دیکھ کر ساری پوزیشن سمجھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرتا، لڑکی خود ہی منظر سے اوجھل ہو گئی۔ کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود اسے اپنی پوزیشن بڑی آکورڈ سی لگی۔ بہرحال دوست کا گھر تھا اور خوشی کا موقع۔ نہ جانے یہ لڑکی راحت کی کون تھی۔ کہیں کوئی غلط فہمی معاملہ بگاڑ نہ دے۔ وہ خائف ہو کر اوپر بسنت کی تیاریوں میں شامل ہونے چل پڑا۔

اگلی شام اتفاقاً راحت کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا سب سے پہلے اسی لڑکی سے ہوا۔ پورچ میں رکشہ رکوائے وہ نہ جانے کن مذاکرات میں گم تھی، بے نیازی سے گزر کر اندر جانے ہی والا تھا کہ مینا کی آواز آئی۔

"بھیا! مہران بھیا۔"

وہ رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آواز رکشہ میں سے آ رہی تھی۔ اچانک رکشہ خالی ہونے لگا۔ مینا کے بعد دو اور لڑکیاں بھی اُچھل کر باہر نکل پڑیں۔

"مہران بھیا آ گئے ہیں مٹھو۔" اور مٹھو نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ مہران کو بھی اس لفظ سے گزشتہ رات ہونے والا دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ وہ دل ہی دل میں بے حد محظوظ ہوا۔

(اوہ تو اس قدر چڑنے کی وجہ یہ تھی کہ موصوفہ کا اپنا نام مٹھو ہے۔ تب تو واقعی وہ یہی سمجھی ہو گی کہ میں اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا ہوں، اس خیال کے آتے ہی وہ سنبھل سا گیا۔ اگرچہ صورت حال اسی وقت کلیئر ہو گئی تھی پھر بھی اسے اپنا اسٹیج تو صاف رکھنا ہی تھا۔)

"چلیں مہران بھیا! ہم سب کو مارکیٹ لے جائیں۔" وہ پورے استحقاق سے کہتی ہوئی اسے واپس گاڑی کی طرف لے جانے لگی۔

"اور تم اپنا رکشہ بے شک واپس لے جاؤ۔ بڑا آیا..... چار چار سواریاں نہیں بٹھاؤں گا۔" وہ منہ اور آواز بگاڑ کر بولی تو مہران نے سرزنش کی۔

"بری بات مینا! یوں ہر کسی سے نہیں اُلجھتے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ چاروں لڑکیوں کو مارکیٹ لے گیا، اسی الٹی میٹم کے ساتھ کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ اپنی ساری شاپنگ کر لیں۔

"کوئی کیسٹ آن کریں ناں بھیا۔" مینا کی فرمائش پہ اس نے آن کر دیا، ویسے بھی چاروں کی چڑ پڑ سے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ گانے کی آواز میں کم از کم ان کی آوازیں کچھ تو دب جائیں گی۔

ہاتھ سے ہاتھ کیا گیا
دل تیرے ساتھ کیا گیا
شیراڈ کی مختصر فضا میں گلوکار کی پُرسوز آواز گونجی
تُو نہیں،
تیری چوڑیوں کی کھنک
اب بھی سنتا ہوں دل کی دھڑکن سے
تیرے آنچل کی ست رنگی دھنک
جانے نہیں پانی میرے آنگن سے

مینا نے بڑی گہری نظروں سے پہلے اسے اور پھر پیچھے مڑ کر مٹھو، بلی اور ردا کو دیکھا۔ اس کے اس جتانے والے انداز کو مہران نے سرسری سا لیا، اس کا سارا دھیان تو ڈیوس روڈ کی پُرہنگم ٹریفک کی طرف تھا۔ میوزک کے شور نے ان چاروں کی گفتگو مدھم کر دی تھی، اس کے اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی تھا، ورنہ اسے دوران ڈرائیونگ میوزک سننے کا کوئی خاص شوق نہ تھا اور وہ بھی اس طرح کی سڑکوں پہ۔

"مہران بھیا! آپ ہنسا بولا کریں، یوں چپ چاپ کب تک؟ میرا مطلب ہے، ایسے تو زندگی نہیں گزرتی۔" اس نے پارکنگ میں کار کھڑی کی تو مینا باہر نکلتے نکلتے رک کر بڑی دل سوزی سے اسے مشورہ دینے لگی۔ اسے ہنسی آ گئی لیکن بظاہر سنجیدہ ہو کر اسے ڈپٹا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ چلو اترو اور جلدی سے کام نمٹا کر آؤ۔" اب وہ اسے کیا بتاتا کہ اس انجان لڑکی پہ پہلا پڑنے والا غلط امپریشن اس کی سنجیدگی اور لئے دیئے رہنے والے انداز سے ہی زائل ہو سکتا تھا۔

"لیکن میں اس پہ اچھا امپریشن ڈالنا ہی کیوں چاہتا ہوں؟ میری بلا سے وہ جو چاہے سمجھے۔"

دل کی بے تکی احتیاط پہ اس نے خود کو جھڑکا۔ واپسی پہ مینا کے ساتھ ساتھ باقی تینوں لڑکیوں کی غیر معمولی سنجیدگی اور خاموشی پر وہ کچھ کھٹکا۔ ذرا گردن گھما کے پیچھے دیکھ لیتا تو یقیناً ان سب کی آنکھوں سے جھانکتا ترحم اسے مزید الجھا دیتا۔

اگلے دن وہ قصداً نہ گیا۔ دو دن ہی خوب جی بھر کے بور ہو لیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب شادی کے دن ہی جائے گا چاہے راحت کتنا ہی اصرار کیوں نہ کر لے۔ رات گئے فون کی بیل نے اس کی محویت توڑی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا رسل کروکی نئی مووی

"A Beautiful Mind" میں کھویا ہوا تھا۔ (یہ پونے ایک بجے کس کا فون ہو سکتا ہے) اسی اُلجھن میں اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری جانب سے موصول کردہ تعارف نے اسے اپنی جگہ سے اُچھلنے پہ مجبور کر دیا۔

"میں ماہ نور بول رہی ہوں۔"

"جی؟" وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔

"میں ماہ نور بول رہی ہوں مہران۔" اس گنگناتی ہوئی سی آواز میں جیسے شہد گھلا ہوا تھا۔

"کون؟ کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟" کوئی ایک ماہ نور تو نہیں زمانے میں۔ اس خیال کے تحت اس نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پھر پوچھا۔

"ماہ نور اور کس سے بات کرنا چاہے گی؟ ظاہر ہے مہران سے۔ جو اسے اتنی دور سے بلا لایا ہے۔" مہران کے ماتھے پہ شکنیں نمودار ہو گئیں۔ "اگر یہ شرارت ہے تو بڑی ہی گھٹیا..... لیکن یہ کون ہے جو اتنا قریب سے جانتی ہے مجھے۔" یہ سب سوچتے ہوئے اس نے سختی سے سوال کیا۔

"محترمہ! آپ کون ہیں؟ رات کے اس پہر کسی کے گھر فون کر کے بے مقصد گفتگو کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہیں؟"

"یہی کہ میں ماہ نور ہوں۔ میں لوٹ آئی ہوں۔ کسی کی بے قراری، اداسی اور تڑپ مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ میں نے خدا سے اپنی زندگی دوبارہ مانگی اور لوٹ آئی۔ کیا میرا یقین نہیں کرو گے مہران۔"

"بکواس بند کرو۔ مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے۔" اس کی بے تکی باتوں پہ مہران کو اشتعال آ گیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی مخاطب ایک لڑکی ہے، اس لہجے میں بات کر بیٹھا۔

"اگر مذاق ہی کرنا ہے تو اس میں کسی مرے ہوئے شخص کو استعمال تو مت کرو۔ کم از کم اتنا احترام تو تمہیں کرنا چاہئے۔" اسے واقعی اسے سنگین مذاق سے تکلیف ہوئی تھی۔

"مرے ہوئے شخص کا احترام؟" دوسری طرف سے بڑے اچنبھے کے ساتھ دہرایا گیا۔ "کیا ماہ نور اب اس دنیا میں نہیں؟"

"نہیں، ماہ نور کو گزرے چھ ماہ ہو چکے ہیں اور اب وہ کبھی واپس نہیں آ سکتی۔" اس نے اس مذاق کرنے والی کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"یہی تو آپ کو سمجھانا چاہتی تھی میں مسٹر مہران۔" اس کا لہجہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ "کہ نہیں ماہ نور نہیں ہوں۔ کوئی بھی ماہ نور نہیں ہو سکتی، ہاں کسی اور کا نام ماہ نور ضرور ہو سکتا ہے مگر

وہ.....وہ نہیں ہوگی کیونکہ ماہ نور ایک ہی تھی اور اب نہیں ہے اور نہ ہی کبھی واپس آئے گی۔ اگر آپ اس حقیقت سے باخبر ہیں تو پھر اسے تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ ماہ نور کو آپ کسی بھی طرح واپس آنے پہ مجبور نہیں کر سکتے۔'' فون بند ہو چکا تھا لیکن ریسیور ہاتھ میں لئے وہ کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔

وہ کون تھی، کیا کہنا چاہتی تھی اور کیا کہہ رہی تھی.....سب اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پہلے تو وہ اسے کسی مینیجر حس مزاج رکھنے والی لڑکی کا اوچھا سا مذاق سمجھا تھا لیکن اب اسے بات کچھ اور بھی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنا تعارف جس انداز میں کرایا تھا تب غصے اور حیرت کی شدت نے اس کا دماغ تقریباً ماؤف کر دیا تھا اور اس نے کسی بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اب ایک بات تھی جو اسے کھٹک رہی تھی، اندر کہیں ایک الارم بج رہا تھا لیکن وہ پورے وثوق سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہا ہے، ویسا واقعی ہے بھی یا نہیں۔ اگر اس وقت بات کرتے ہوئے وہ دھیان دے لیتا تو شاید کوئی سرا ہاتھ آ جاتا۔ خود سے الجھتا وہ سو ہی گیا۔

اگلی رات اسی وقت ٹھیک ایک بجے اسے پھر فون کی بیل سنائی دی۔ دن بھر جاب کے لئے بھاگ دوڑ میں مصروف وہ رات کا واقعہ تقریباً بھول چکا تھا، اس لئے نوٹس نہ لیا، تیسری بیل پہ جیسے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، اس نے وال کلاک پہ ٹائم دیکھا اور جلدی سے سلیپر پہنتا کمرے سے نکلا۔

لقمان بھائی جمائیاں لیتے لاؤنج سے نکل کر واپس اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ فون یا تو بند ہو گیا تھا یا پھر کسی نے ان کی آواز سن کر لائن کاٹ دی تھی۔ وہ بیل کی آواز کم کرتے ہوئے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ اس بار اس نے خود کو اپنے اوسان بحال رکھنے کا آرڈر دیا۔ پچھلے فون پہ اس کے لاشعور میں جو ہلکی سی پس منظر کی بازگشت رہ گئی تھی، وہ اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ ہلکی سی بیل ہونے پہ اس نے ریسیور اٹھا لیا اور دم سادھ کر بغیر کچھ بولے سننے لگا۔ دور کہیں سے ڈھولک کی مدھم سی تھاپ سنائی دے رہی تھی وہ چونکنا ہو گیا۔

''ہیلو.....کون؟ ماہ نور؟'' اس نے جان بوجھ کر یہ کہا تھا۔

''اُف.....آپ کب سمجھیں گے کہ ماہ نور کو آپ اس طرح جوگ لے کر واپس نہیں لا سکتے۔ آپ اسے یاد رکھیں کسی اچھی بات کی طرح لیکن اس یاد کو ناسور مت بنائیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی زندگی گزار کر آپ اس کی روح کو کوئی تسکین دے رہے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ آپ کی یہ حالت دیکھ کر اسے یقیناً تکلیف ہو رہی ہوگی۔'' وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اسے خبر نہ تھی، ساری توجہ اس جانب تھی کہ وہ کہاں سے بول رہی ہے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ

اس وقت اکیلی نہیں بلکہ اس کے اردگرد اور بھی لڑکیاں جمع ہیں جو اسے مختلف مشوروں سے نواز رہی ہیں۔ ان کی آوازیں کھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح اس تک پہنچ رہی تھیں۔

''آپ کی یہ حرکتیں.....''

''کیسی حرکتیں؟'' اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد مہران نے اب اس کی گفتگو کی طرف دھیان دیا۔

''یہی اداس رہنا، گم صم چپ چاپ بیٹھے رہنا، زندگی سے بے زاری، رونق اور گہما گہمی سے اکتاہٹ، خوشیوں سے ناراضی.....ایسے گیت سننا۔'' اس کے آخری حوالے پہ وہ بری طرح چونکا۔ اسے یاد آنے لگا کہ اس شام گاڑی میں وہ سیڈ سونگ لگتے ہی مینا کے تاثرات بدل گئے تھے اور مارکیٹ سے واپسی پہ باقی لڑکیوں کا رویہ بھی بدلا بدلا لگ رہا تھا۔

ہو نہ ہو یہ ان چاروں میں سے ایک ہے اور یہ بھی ممکن ہے چاروں کا ٹولہ ہی ہو۔ مینا احمق بھی ہے اور شریر بھی لیکن اس طرح کا مذاق اور وہ.....نہیں۔ ہو سکتا ہے، یہ سب اسی کی وجہ سے ہو لیکن یہ مینا نہیں ہو سکتی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اپنے مہران بھیا سے اتنا سنگین مذاق کر سکے۔

''آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ رویہ آپ کو نارمل زندگی سے دور لے کر جا رہا ہے۔'' اس کی خاموشی نے لڑکی کی ہمت بڑھائی۔ ''آپ ذہنی مریض بھی بن سکتے ہیں بلکہ بن رہے ہیں۔ بات کرتے کرتے چپ ہو جانا بھی اس کی ایک نشانی ہے اور بے زبان جانوروں اور پرندوں سے اکیلے میں گفتگو کرنا بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ اب انسان سے ناامید ہو چکے ہیں۔ دیکھئے یہ غلط رویہ ہے۔ زندگی کسی ایک فرد کے جانے سے ختم نہیں ہو جاتی اور.....'' وہ بولتی رہی اور مہران نے ٹھنڈی سانس بھر کے ریسیور کو گھورا۔

جو بات وہ جاننا چاہتا تھا، اس نے بڑبولے پن میں خود ہی اگل دی تھی۔ بچپن سے ابی جان کے پالے ہوئے کتوں، بلیوں، بطخوں، مرغیوں اور طوطوں میں رہ رہ کر اسے ان بے زبان جانوروں سے انسیت سی ہو گئی تھی اور اس رات طوطے سے باتیں کرتے ان چار میں سے صرف ایک لڑکی نے ہی اسے دیکھا تھا۔ وہ لڑکی.....جو طوطے کی ہم نام تھی اور شاید ہم عادت بھی۔ ابھی بھی ایک تواتر کے ساتھ رٹا رٹایا سبق دہرا رہی تھی۔

''آپ کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔''

''پچیس سال۔'' نجیدگی سے ٹوٹ کر بات کاٹی۔ اس کا سلسلۂ کلام پھر سے جڑا۔

''وہی تو، اس عمر میں جوگ لے لینا کوئی اچھی بات ہے؟ آپ کی ذات پہ دوسروں کی

محبتیں بھی فرض ہیں۔ کسی ایک کے عشق میں دنیا چھوڑ دینا انصاف نہیں۔" وہ نہ جانے کس غلط فہمی میں مبتلا تھی۔ کیسا عشق؟ کیسا جوگ؟ وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اچانک اسے ایک شرارت سوجھی۔

"میاں مٹھو! چوری کھاؤ گے؟"

دوسری طرف زبان کو اچانک بریک لگ گئی۔ مہران نے اپنا سوال دہرایا تو لمبی سی "ہائے" کے ساتھ فون رکھ دیا گیا۔

اگلے دن وہ بظاہر راحت کے "پُرزور اصرار" پر وہاں گیا تھا۔ حالانکہ رات کو فون بند ہوتے ہی اس نے کل مایوں کی تقریب میں جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس کی متلاشی نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی تھیں لیکن ابھی تک اس کی ایک بھی جھلک وہ دیکھ نہ پایا تھا۔ ایک تو آج باقاعدہ رسم تھی مایوں کی اس لئے لوگ بھی زیادہ تعداد میں تھے۔ دوسرے یہ کہ نشاط باجی کے کمرے کے بجائے لڑکیاں آج ہال میں جمع تھیں۔ وہیں رسم ادا ہونی تھی۔ اس وقت شاید اِدھر رقص وگلوکاری کے مظاہرے ہو رہے تھے۔ اس لئے مردانہ داخلہ ممنوع تھا۔

"یار مہران! یہ ہار اور گجرے ذرا اندر مینا کو پکڑا آ۔" راحت نے اسے پیلے رنگ کے پھولوں سے بنے درجنوں ہار اور گجرے تھمائے اور خود عجلت میں لان کی طرف لپکا جہاں نشستیں اس کی مرضی کے مطابق سیٹ نہیں کی گئی تھیں۔ وہ پھولوں کا ڈھیر سنبھالتا ہال کی طرف بڑھا۔

بتیاں بجھائی رکھ دی، میں بتیاں بجھائی رکھ دی
دیوا بلے ساری رات میریا ہانیا
دیوا بلے ساری رات

کارپٹ پہ گول دائرے کی صورت میں بیٹھی تالیاں بجاتی لڑکیوں کے ہجوم میں وہی تھی جو اس وقت پورے جوش کے ساتھ ڈانس کرنے میں مگن تھی۔ کزنز اور دوستوں کی متواتر تالیاں اسے اور پُرجوش کررہی تھیں اور اس کے تھرکتے پیر مزید متحرک ہوکر تال سے تال ملانے لگتے تھے۔ دروازے میں ایستادہ مہران نے بڑی دلچسپی سے اس کی سادہ مگر بے ساختہ حرکات دیکھیں۔ کھلتے ہوئے پیلے رنگ کے قمیص پائجامہ کے ساتھ اس نے چنری کا چنا ہوا پیلا، سبز اور سرخ رنگ کا دوپٹہ لے رکھا تھا۔ دونوں کلائیوں میں بھر بھر کے ہم رنگ کانچ کی چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ ریشمی بال چوٹی میں قید تھے، البتہ چند لٹیں ڈانس کے دوران چہرے

پر گر آئی تھیں، ہلکے سے میک اَپ کے ساتھ وہ پہلے سے کہیں اچھی اور الگ نظر آرہی تھی۔

اجہرو لیلے توں راہواں تکدی
پادینی آں شاماں
منتاں کر کے تھک گئی آں میں
سوہنیاں وانگ غلاماں

دونوں ہتھیلیاں جوڑ کر جب اس نے منتیں کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے رخ پھیرا تو ایک دم مہران کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل بھی انہی ہتھیلیوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا ہے۔

اج میری اک من لے ٹو
اج میری اک من لے ٹو

فضا میں لہرا کے اٹھتے اس کے مرمریں بازو وہیں بلند رہ گئے۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں اکثر نے پیچھے گردنیں گھمائیں تو خود کو سنبھالتا مہران یوں قدم بڑھانے لگا جیسے وہ ابھی ابھی منظر میں داخل ہوا ہو۔ مٹھو دھپ سے کارپٹ میں بیٹھ چکی تھی۔ گانا ابھی بھی چل رہا تھا اور کئی لڑکیوں کی قل قل بھی شروع ہوچکی تھی۔ مہران نے متانت سے پھولوں سے بھرے تھیلے مینا کی طرف بڑھائے اور اسی سنجیدگی سے باہر نکل گیا۔

اگرچہ رسم رات دیر گئے تک جاری رہی مگر وہ قصداً ساڑھے بارہ بجے وہاں سے نکل آیا۔ پونے ایک بجے سے لے کر دو بجے تک لاؤنج میں فون کے نزدیک نیم دراز وہ چینل سرچنگ کرتا رہا لیکن بیل نہ ہوئی۔ (لگتا ہے میاں مٹھو کی ٹیں ٹیں بند ہوگئی، سارے کس بل نکل گئے ایک ہی نظر میں)

"کس کے؟ اس کے یا تمہارے؟" اندر سے سوال گونجا تو وہ مسکرا اٹھا۔

☆======☆======☆

مہندی والے دن لڑکیاں جن دو کوسٹرز میں سوار ہوئیں، ان میں سے ایک کی ڈرائیونگ کا فریضہ اسے سونپا گیا۔ بائل گرین شیلون کے مقیش سے سجے لہنگے اور میرون کلر کی وُیل چولی کے ساتھ ٹائی اینڈ ڈائی.....اور گوٹے سے سجا بڑا سا دوپٹہ اوڑھے سلور جیولری اور میرون شیڈ میک اَپ کے ساتھ وہ تمام لڑکیوں میں نمایاں تھی۔ حالانکہ آدھ درجن لڑکیوں نے اس وقت اسی طرح کا لہنگا پہن رکھا تھا لیکن اس کی چھب ہی نرالی تھی۔

مہران نے محسوس کیا کہ اسے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے دیکھ کر اس کے بڑھتے قدم تھم گئے

تھے۔ کچھ تذبذب کے عالم میں کھڑی وہ دوسری کو سٹر دیکھنے لگی جو پہلے ہی اوپر تلے چڑھی لڑکیوں سے بھر چکی تھی۔ اتنی ہی دیر میں دوسری کو سٹر میں بھی تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ مہران نے اپنے برابر کی سیٹ پہ دھرے مہندی کے تھال کو دیکھا اور پیچھے ردا کی گود میں چڑھی بیٹھی مینا کو آواز دی۔

"مینا! تم آگے آجاؤ اور اگر کوئی اور بھی رہتی ہے تو اسے بھی لے آؤ۔" اسے بالکل قریب اکیلے بٹھانا خود اسے بھی معیوب لگ رہا تھا۔ اس لئے مینا کا سہارا لیا کہ وہ تو بالکل اس کی چھوٹی بہنوں جیسی تھی۔

"مم..... میں..... میں بھیا۔" مینا کترائی کترائی سی پھر رہی تھی۔ جس سے صاف ظاہر تھا کہ مٹھو کی شرارت میں وہ برابر حصہ دار تھی، اسی لئے راز کھل جانے کے بعد اس سے بچتی پھر رہی تھی۔

"اتنی محنت سے سجایا تھال خراب نہ ہو جائے۔" اس نے عذر پیش کیا۔

"گود میں رکھ لینا۔" اس کے قطعی لہجے پہ ناچار وہ نیچے اتری۔ "ارے مٹھو تو باہر کھڑی ہے ابھی تک۔ آجا میرے ساتھ بیٹھ جا۔" اس کا بازو بھی کھینچا۔

اب مہران کے برابر میں صحت مندی کی پلو مینا تھی اور ساتھ پھنسی ہوئی مٹھو اور دونوں کی گود میں رکھا تھال جس پہ مہندی پہ گری افشاں اور کہیں کہیں رکھے سلور پینٹ کئے دیئے سجے ہوئے تھے۔ پیچھے بیٹھی لڑکیوں نے مہندی کے گیتوں کی پریکٹس جاری رکھی تھی لیکن وہ دونوں چپ چاپ سامنے تکے جا رہی تھیں۔ لڑکے والوں کا گھر قریب آنے پر اس نے بریک لگائی۔ گھر سے ذرا پہلے ہی تمام لوگ سواریوں سے اتر کر جمع ہونے لگیں۔ وہ دونوں بھی اترنے والی تھیں جب مہران نے کہا۔

"تم دونوں نے جو حرکت کی، مجھے اس کی وضاحت چاہئے، مکمل جواز کے ساتھ، جو کہ میں جانتا ہوں کہ ہرگز نہیں ہوگا تمہارے پاس۔ پھر بھی..... اس حرکت کو نظر انداز کر دینا چاہئے یا نہیں اس کا فیصلہ تمہاری وضاحت سننے کے بعد ہی ہوگا۔"

"وہ..... بھیا..... دراصل....." مینا گڑبڑا کے کچھ کہنے ہی جا رہی تھی کہ مہران نے روک دیا۔

"تم سے تو میں بعد میں تفصیلی بیان لوں گا۔" اس نے خشمگیں نظروں سے گھور کر مینا کو ہراساں کیا۔ "ہاں ان مٹھو صاحبہ سے کہہ دو کہ....."

"میرا نام معطر ہے، معطر ہمایوں۔" تڑختے لہجے میں اطلاع دی گئی۔ اس نے لمبا

سانس کھینچ کر فضا میں سے کوئی مہکا احساس اندر اتارا۔ جیسے اس کے نام کے ہلکے سے ارتعاش نے ہی ہواؤں کو معطر کر دیا ہو۔

"نام جو بھی ہے، کام تو آپ نے ایسا کیا ہے کہ جواب طلبی ہر حال میں ہوگی۔ کل دن کو دس سے بارہ کے درمیان میں آپ کے فون کا انتظار کروں گا۔"

جواباً اس نے سر ایسے جھٹکا تھا گویا اسے کسی بات کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔ اس کی فق ہوئی رنگت البتہ کچھ اور کہہ رہی تھی اور وہی ہوا کافی انتظار کرنے کے بعد جب بارہ بجنے میں محض پانچ ہی منٹ رہ گئے تھے، اس کا فون آگیا۔

"پلیز ہم سے غلطی ہوگئی۔ آپ کسی کو بتائیے گا مت۔" چھوٹتے ہی پہلی بات اس نے یہ کی۔ لہجہ انتہائی التجا آمیز تھا۔

"آپ نے فون کرنے کا کہا، میں نے کر لیا حالانکہ یہ میرے لئے انتہائی مشکل مرحلہ تھا پھر بھی میں نے صرف اس لئے کیا تاکہ آپ اب تو اس غلطی کو معاف کر دیں۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں آپ کو دھمکا ہرگز نہیں رہا اور نہ ہی آپ کو بلیک میل کرتے ہوئے فون کرنے پہ مجبور کیا ہے۔ میں تو صرف اس سارے قصے کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔ مینا مجھے کافی عرصے سے جانتی ہے۔ مجھے اپنے بھائی کا درجہ بھی دیتی ہے۔ اس کا اور میرا ہلکے پھلکے مذاق کا رشتہ بھی بنتا ہے اگرچہ اس قسم کے بے ہودہ مذاق کا نہیں، پھر بھی..... مگر آپ نے کیا سوچ کر مجھے اپنے مذاق کا نشانہ بنایا، ایک انجان آدمی کو تنگ کرنے کی غرض سے آدھی رات کو فون کرتے ہوئے آپ جھجکیں نہ گھبرائیں اور اب یہ کیسے ایک مشکل مرحلہ ہوگیا، بتائیے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ آپ شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آپ کو فون کرنے کے پیچھے نہ تو مینا کی شرارت کا ہاتھ ہے نہ ہی میرا کوئی مذاق کرنے کا ارادہ تھا۔ ہم دونوں نے آپ کو فون کسی غلط مقصد کے تحت نہیں کیا تھا اس وقت میری نیت کچھ اور تھی، میرے دل میں کسی قسم کا غلط خیال نہ تھا۔ اس لئے آپ سے بات کرتے ہوئے جھجکی نہیں اور اب صرف آپ کے مجبور کرنے پہ یہ قدم اٹھایا ہے تو ظاہر ہے گلٹی تو فیل ہو رہی ہے۔ تب میں اکیلی نہیں تھی۔ میرے ساتھ مینا تھی، ردا بھی، بیلی اور فری بھی تھیں۔ ہم چھپ کر کوئی کام نہیں کر رہے تھے اور آج میں اپنے گھر والوں سے چھپ کر آپ کو فون کر رہی ہوں صرف اس ڈر سے کہ آپ ہماری بے ضرری حرکت کو غلط رنگ دے رہے ہیں اور کہیں اسی انداز میں سب کے سامنے پیش نہ کر دیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں لیکن آپ کا اسٹائل دھمکانے والا ہی تھا۔" سادہ سے لہجے میں

اتنی سچائی تھی کہ مہران کو یقین کرتے ہی بنی۔

''مانا..... لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ کے اور مینا کے دماغ میں کیا سمایا تھا۔ اصل حقیقت تو وہ اب بھی جاننا چاہتا تھا۔

''اس روز شاپنگ کرتے ہوئے مینا نے آپ کی منگیتر کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ مختصر سی علالت کے بعد بڑی کم عمری میں وفات پا گئی اور یہ بھی کہ چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی آپ خود کو اس صدمے سے نکال نہیں پا رہے۔ اس نے بتایا تھا کہ راحت بھیا بھی خاصی کوشش کر رہے ہیں آپ کو زندگی کی طرف دوبارہ لانے کی لیکن آپ ہیں کہ جوگ لئے بیٹھے ہیں۔'' خاصی صاف گوئی کے ساتھ اس نے بتایا۔

''اچھا تو جوگی ایسے ہوتے ہیں، ویل ڈریسڈ، کلین شیو۔''

''اب مجھے کیا پتا، مینا نے تو یہی بتایا تھا پھر آپ کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ دردناک گانے سنے جا رہے تھے۔ دوستوں کی محفل بار بار چھوڑ کر آپ تاریک گوشے تلاشتے پھرتے تھے۔ ہنستے بولتے تو آپ کو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ اس لئے یقین کر لیا اور سچی بڑا افسوس بھی ہوا۔ دیکھیں ناں، جانے والے تو چلے جاتے ہیں، بس یادیں رہ جاتی ہیں، ان کو دل میں تو بسایا جا سکتا ہے مگر دل بہلایا تو نہیں جا سکتا۔'' اس کی باتیں کھٹ سے مہران کے دل پہ لگی تھیں۔

''واقعی دل یادوں سے کب بہلتا ہے بھلا اور یادیں ہیں بھی کتنی؟'' اس نے سوچا۔

''یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزرتی۔'' وہ بولتی رہی۔

''ماشاء اللہ کس فلم کے ڈائیلاگ ہیں۔'' اس کے دل جلا دینے والے ریمارک پہ وہ چڑ گئی۔

''کیا مطلب؟ آپ مجھے اپنی اُڑا رہے ہیں میرے خلوص کا۔ ہم سب نے تو محض ہمدردی کی نیت سے بڑے خلوص کے ساتھ آپ کا غم ہلکا کرنا چاہا تھا۔ یہی سوچا تھا دو چار فون کالز کے ذریعے آپ کی برین واشنگ کریں گے، زندگی کی قدر کرنا سکھائیں گے اور زندگی سے محبت کرنا بھی۔''

''ہاں محبت..... محبت کرنا تو تم نے سکھا ہی دیا۔'' اس نے دل ہی دل میں سرگوشی کی۔

''بتائیے، اب تو آپ کو یقین آ گیا کہ یہ کوئی اوچھا مذاق نہیں تھا۔''

''چلیں مان لیا لیکن آپ کیا سوچ کر مجھے سدھارنے چلی تھیں۔ مینا کا مجھ سے کوئی تعلق بنتا ہے لیکن آپ محض اس بیوقوف لڑکی کی باتوں میں آ کر اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھیں۔ ایک انجان شخص پہ اعتبار کرنا سراسر بیوقوفی ہے۔''

''لیکن میں نے بتایا تو ہے کہ میرا مقصد.....'' مہران نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ضروری نہیں کہ جو جیسا نظر آ رہا ہے ویسا ہی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دوسرے کسی کے بارے میں جو اندازہ لگا کر آپ کو بتائیں وہ درست ہی ہو۔ ماہ نور ایک بہت اچھی لڑکی تھی، بالکل ایسی جسے کوئی بھی شخص اپنی بیوی کے روپ میں دیکھنا پسند کرے گا۔ ہماری منگنی مکمل طور پر ارینج تھی۔ کوئی عشق و عاشقی کا چکر نہیں تھا اور نہ ہی منگنی کے بعد کوئی ایسا سلسلہ چلا جیسا کہ آپ سمجھ رہی ہوں گی لیکن میں خوش تھا، مطمئن تھا اور مجھے ہونا بھی چاہئے تھا۔ ماہ نور میں کوئی کمی نہ تھی اور پھر وہ میرے پورے گھرانے کی مشترکہ پسند تھی۔ اس کی اچانک موت واقعی ایک سانحہ تھی، سب کے ساتھ ساتھ میرے لئے بھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی معطر کہ اگر وہ منگیتر نہ ہوتی تب بھی یہ حادثہ میرے دل پہ اثر ڈالتا اور شاید مینا نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ وہ میری ایک نہ دو پوری چار عدد بھابیوں کی چھوٹی اور چہیتی بہن بھی تھی۔

ان چاروں کا وجود مجھے ماہ نور کو بھلانے نہیں دیتا۔ ہمارے پورے گھر میں پچھلے کئی ماہ سے سوگواری چھائی ہوئی ہے۔ میں، میری امی جان اور ابی جان مکمل کر مسکرا بھی نہیں سکتے کہ کہیں ہماری بھابیوں کو یہ محسوس نہ ہو کہ ان کا دکھ ہمارا دکھ نہیں ہے۔ انہیں اپنی بہوؤں کی دل آزاری منظور نہیں اور میں..... بتائیں، میں کیسے ہنس سکتا ہوں، بول سکتا ہوں۔''

''واقعی؟ عجیب سی بات ہے یہ تو۔ آج کل ایسا ہوتا ہی کہاں ہے؟'' وہ مہران کی فیملی کے خلوص سے متاثر ہو گئی۔ ''ساس سسر اور بہوؤں کے مزاج کا اس درجہ احساس کریں؟ کتنا اچھا لگ رہا ہے سننے میں ہی۔ یقیناً آپ کے امی اور ابو بہت حساس دل کے مالک ہیں لیکن انہیں اپنی بہوؤں کا غم بانٹنا چاہئے نہ کہ انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دینا چاہئے اور آپ ایسے کیوں بنے پھر رہے ہیں۔ کیوں خود کو مجرم مجرم سا محسوس کرتے ہیں اپنی بھابیوں کے سامنے، خود بھی مسکرائیں اور انہیں بھی ان کی مسکراہٹ واپس لوٹائیں۔ اس میں ڈرنے جھجکنے کی کیا بات۔''

وہ اس کے اتنے صحیح تجزیے پہ حیران ہوا تھا۔ یہ سب تو اس نے مینا کو بتایا بھی نہیں تھا۔ واقعی وہ کھل کے جینا چاہتا بھی تو کسی نہ کسی بھابی کو سامنے دیکھ کے چور سا بن جاتا۔ اسے لگتا جیسے وہ دل ہی دل میں گلہ کر رہی ہو کہ ''مہران اتنی جلدی..... اتنی جلدی تم ہماری نور کو بھول گئے..... اتنی جلدی۔'' اور اس کے لب سکڑ جاتے، دل مرجھا جاتا۔

''پچیس سال کے ساتھ کے بعد جب کسی کی بیوی مر جاتی ہے تو میں نے اکثر کو چند ہی دنوں کے بعد دوسرا بیاہ رچاتے بھی دیکھا ہے اور کوئی انگلی تک نہیں اٹھاتا۔ آپ نہ جانے کیسی

شبیعت کے ہیں....." وہ نہ جانے تعریف کر رہی تھی یا طنز۔

"میں بس ایسا ہی ہوں، مجھے ہمیشہ اگلے کی فکر زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی کیا سوچ رہا ہے، کیا سوچے گا، فلاں کو کیسا لگے گا، فلاں کیا محسوس کرے گا۔"

"تی الحال تو مجھے یہ فکر زیادہ ہو رہی ہے کیونکہ فون کال خاصی لمبی ہو گئی ہے۔ ابھی کسی نہ کسی کام سے کوئی مجھے ڈھونڈتا آئے گا اور پہلا سوال یہی ہو گا کہ کسے فون کر رہی ہو۔"

"اور تمہارا جواب کیا ہو گا؟" بڑے نامحسوس طریقے سے وہ آپ سے تم پہ آ گیا۔

"بس یہ دعا کیجئے کہ اس سوال کی نوبت ہی نہ آئے۔ بات چھپانے کی تھوڑی سی بددیانتی میں پھر بھی کر لوں گی مگر مجھے دھڑلے سے منہ پہ جھوٹ بولنا نہیں آتا اور وہ بھی ان لوگوں سے جو مجھ پہ خود سے بڑھ کے اعتماد کرتے ہیں۔ اس لئے خدا حافظ۔" اس نے جواب سننے سے پہلے پیشتر ہی ریسیور رکھ دیا لیکن اس کے آخری فقرے مہران کے آس پاس دیر تک گونجتے رہے۔

"تو محترمہ خدا ترسی اور ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر میری دیوانگی کا علاج کرنا چاہتی تھیں۔" وہ دل میں خوب ہنسا۔ "تم مجھے دیوانہ، عاشق اور مجنوں ٹائپ کا بندہ سمجھ کر مجھ سے ہمدردی کر رہی تھیں معطر! تم غلط تھیں، میں نہ تو جوگی تھا نہ ہی دیوداس۔ ہاں تم نے اب مجھے عاشق ضرور بنا دیا ہے اور وہ بھی اپنا۔"

☆======☆======☆

رات کو شادی کے موقع پہ اس کی آنکھیں کل کی طرح اسے ہی تلاشتی رہیں۔ بارات کے آنے کے بعد وہ اسے دیکھ پایا۔ آف وہائٹ کلر کے نیٹ کے کام دار سوٹ میں اپنی دیگر کزنز کے ساتھ کھڑی وہ بڑی کھوئی کھوئی سی محسوس ہوئی۔ ساری شوخی جیسے کوئی ایک دن میں لوٹ کر لے گیا تھا۔ شانے پہ بکھری ریشمی زلفیں چہرہ دونوں اطراف سے ڈھانپے ہوئے تھی۔ اس نے پہلی بار اسے کھلے بالوں کے ساتھ دیکھا اور سراہے بغیر نہ رہ سکا تھا، بلاشبہ بے حد حسین اور دراز گیسو تھے۔

تقریب کے دوران دو ایک بار مہران کی نظر اس سے ملی بھی تو نہ جانے کیوں وہ رخ بدل گئی۔ اس کا گریز اور اجتناب مہران کی بے قراری اور سوا کر گیا۔

اگلے دن ولیمہ کی تقریب دوپہر کو تھی۔ وہ صبح سے ہی تہیہ کئے بیٹھا تھا کہ اس سے دو ٹوک بات کر کے رہے گا۔ بے شک وہ راحت کی فرسٹ کزن تھی لیکن شادی کے بعد نہ جانے اس سے دوبارہ سامنا کب ہو سکے۔ اگلے رابطے کے لئے اسے آج ہی کوئی سبیل نکالنی تھی۔

اس کا سامنا کرنے کے لئے اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔

وہ جان گیا تھا کہ جب جب بھی وہ اسے ملی اور جتنی بار بھی ملی پہلے سے کہیں بڑھ کر دلکش اور منفرد محسوس ہوئی۔ ہر بار اس کا دیدار ایک نیا احساس دل پہ ثبت کرتا تھا۔ پہلی بار میں ہی اس نے مہران کو چونکا دیا تھا، جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ "نہ جانے حسنِ یار آج کیا غضب ڈھانے والا ہے۔" وہ سر اٹھائے ہال میں موجود سینکڑوں لوگوں میں سے اس ایک کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ولیمہ کی تقریب میرج ہال میں تھی۔

"ایکسکیوزمی۔" پشت سے آتی مانوس آواز پہ وہ چونک کے پلٹا۔ ایک نئے روپ میں بالکل جدا انداز میں وہ اس کے بالکل پیچھے کھڑی گزرنے کا راستہ مانگ رہی تھی۔ مہران نے ایک نظر ہال میں بیٹھے لوگوں کی گہما گہمی اور معمور فیت پہ ڈالی اور مزید پھیل کر کھڑا ہو گیا، کچھ یوں کہ اندر جانے کا راستہ آدھے سے زیادہ بند ہو گیا۔ وہ ٹپٹپا اٹھی۔

نیلگوں گہرائی لئے سلک کا جدید تراش کا ٹراؤزر اور شارٹ شرٹ کا سوٹ پہنے، آج وہ قدرے ماڈلک کے ساتھ سامنے آئی تھی۔ جیولری اور ہیر اسٹائل میں بھی جدید انداز نمایاں تھا۔ مہران نے اس کی خوبصورتی، اعتماد اور ذہانت کے بعد اس کی خوش ذوقی کا بھی اعتراف کر لیا۔

"اس دن آپ نے میری بات سنے بغیر فون کیوں رکھ دیا؟" اس نے پوچھا تو بغیر گھبرائے وہ کہنے لگی۔

"کیونکہ میری بات مکمل ہو گئی تھی اور آپ کی بات سننے کی میں پابند نہ تھی۔"

"ویل سیڈ، لیکن اس وقت آپ کی ساری احتیاط پسندی اور دور اندیشی کہاں جا سوئی تھی جب ہمدردی کے بخار میں آدھی رات کو آپ ایک انجان شخص کو فون کر رہی تھیں۔"

"آخر آپ بار بار اسی بات کا حوالہ کیوں دیئے جا رہے ہیں۔" وہ زچ ہو اٹھی۔ "اب بس بھی کیجئے۔"

"اونہوں، میں نے مان لیا کہ آپ کی نیت صاف تھی۔ اب آپ بھی مان لیجئے کہ آپ کا طریقہ کار غلط تھا۔"

"اچھا مان لیا۔" وہ عجلت سے بولی۔

"مینا کے کان پکڑ کر اسے سرزنش کرنے کا استحقاق رکھتا ہوں میں اور آپ..... کیا تم مجھے کوئی حق دو گی؟" اس سے بات بن نہ سکی۔

"کان پکڑنے کا؟" حیرت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور کھل گئیں۔

"نہیں بھئی..... وہ..... دراصل....." وہ حقیقتاً پزل ہوگئی۔

"وہ اس دن تم نے کہا تھا کہ یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزرتی لیکن تم یہ تو بتانا بھول ہی گئیں کہ زندگی پھر کس سہارے گزرتی ہے۔ کیا..... کیا تم وہ سہارا بنو گی معطر؟" اس کے لہجے کی گھمبیرتا پہ پلکیں گرائے کھڑی معطر نظر اٹھانے پہ مجبور ہوگئی۔ اس کی سیاہ بھنور آنکھوں میں ایک گدگداتا سا تبسم سارے جواب لئے ہوئے تھا۔ مہران مطمئن سا ہو کے ایک طرف ہوگیا۔ پھر بعد میں اسے ایک کونے میں تنہا پا کے چپکے سے کہہ آیا۔

"میں نہ دھمکی دے رہا ہوں نہ التجا کر رہا ہوں۔ میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں کہ کل رات دس بجے میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔"

اور اس رات معطر کا فون آیا تو سہی مگر یہ وعدہ لینے کہ آئندہ کبھی وہ اسے فون کرنے نہیں کہے گا۔

"میں خود ہی کبھی کبھار تمہیں کال کر لیا کروں گی۔ اس وقت جب گھر پہ کوئی نہیں ہوگا کسی کی موجودگی میں وہی خطرہ ہوگا کہ اگر کسی نے پوچھ لیا تو میں مشکل میں پڑ جاؤں گی۔" مہران میں نے خود سے عہد کر رکھا ہے کہ میں خود پر اعتماد کرنے والے ہر شخص کا مان رکھوں گی۔ میرا ایک جھوٹ اس مان میں دراڑ ڈال دے گا۔ مجھے یقین ہے، تم کبھی ایسا نہیں چاہو گے۔"

اور اس نے بھی متاثر ہو کر وعدہ کر لیا تھا۔ بعد میں ای میل کے ذریعے اور کبھی کبھی میسجنگ کے ذریعے وہ دل کی باتیں کر لیا کرتے۔

آج کافی عرصے بعد اس کی فرمائش پہ وہ اپنا چہرہ دکھانے پہ رضامند ہوئی تھی۔ صرف یہی ایک طریقہ تھا جو معطر کے لئے کسی حد تک قابلِ قبول تھا۔ سخت ترین گرمی میں لمبا راستہ طے کرنے کے بجائے وہ کالج کے قریب ہی ماموں کے گھر چلی آئی اور طے شدہ پروگرام کے تحت مہران کو وہیں ہونا تھا۔ اس کا ارادہ معطر کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد واپس لوٹنے کا تھا لیکن برا ہو اس بے قراری کا جو چھلک چھلک گئی۔ راحت نے اس کا بھید پا لیا اور اب وہ اسے یونہی چھوڑ سکتا تھا بھلا۔

☆======☆======☆

راحت نے اس سے سب کچھ اگلوا کے ہی دم لیا۔ (یہ الگ بات کہ جسے وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا، وہ کچھ بھی نہ تھا، مہران نے جہاں تک ہو سکا داستان خاصی سنسر کر کے سنائی کہ بہرحال وہ معطر کا بھائی تھا، ماموں زاد ہی سہی۔ اس سے وہ اپنی واردات قلبی کی تمام تفصیل بے

سے تو کہہ نہیں سکتا تھا)

"تو یہ چکر ہے....." اس نے کشن اسٹیئرنگ کی طرح گول گھماتے ہوئے کہا تو مہران کو سخت برا لگا۔

"ایک تو یہ لفظ "چکر" مجھے سخت معیوب لگتا ہے۔ اچھا بھلا شریفانہ سا تعلق مشکوک ہو کے رہ جاتا ہے۔"

"جو چیز چھپائی جائے، اس میں کوئی نہ کوئی چکر ضرور ہوتا ہے۔" وہ اپنی بات پہ قائم تھا۔ "تم مجھ سے اتنی پرانی دوستی کے دعوے دار ہو اور اتنی اہم بات مجھ سے چھپا کر رکھی۔" مہران کے حسبِ توقع وہ گلہ کر ہی بیٹھا۔ اس کے پاس بھی جواب حاضر تھا۔

"یار! تُو میرا دوست سہی لیکن آخر تیرے گھر کی بات تھی۔ تیری کزن ہے وہ۔ (اس نے جان بوجھ کر لفظ "کزن" استعمال کیا۔ خدشہ تھا کہ بہن کا لفظ اس کی غیرت کو جگا نہ دے) ڈر تھا تم برا نہ مان جاؤ۔"

"ہاں۔ وہ میری کزن ہے اور تم میرے دوست ہو۔ میں اسے بھی اچھی طرح جانتا ہوں تمہیں بھی۔ برا لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ برا تب لگتا جب میں تمہارے بارے میں غیر مطمئن ہوتا۔ تم وقت گزاری کرنے والے بندے تو ہو نہیں جو میں سمجھ پاتا اور جہاں تک معطر کی بات ہے تو اس پر میں تم سے بھی کہیں بڑھ کے اعتبار کرتا ہوں۔ وہ کوئی غلط فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ نو..... نیور۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کی حتمی تصدیق کے بعد مہران کے دل سے بوجھ سرکا، وہ سبک سا گیا۔

"مجھے حیرت صرف اس بات پر ہو رہی ہے کہ ہم لوگوں کے اندازے کس قدر غلط تھے۔ ہم سب یار تو سمجھے تھے کہ تُو اپنی منگیتر کے عشق میں گوڈے گٹوں سمیت غرق ہو چکا ہے۔ کیا ماہ نور کا خیال معطر سے ملنے کے بعد دل سے نکلا ہے یا پہلے ہی خیالات بدلنے شروع ہو گئے تھے۔"

"ماہ نور سے مجھے محبت نہیں تھی راحت! وہ صرف کم عمری کی محبت کا پہلا احساس تھی۔ محبت کا احساس ہونے میں اور واقعی محبت کرنے میں خاصا فرق ہوتا ہے۔"

"محبت کا یہ فلسفہ میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ مجھے تو سیدھی سادی باتیں ہضم ہوتی ہیں۔ جیسے کہ ایک دوسرے کو پسند کیا، ماں باپ تک بات پہنچائی، شادی کی اور اللہ اللہ خیر صلا۔ میری مان تو تُو بھی محبت کے فلسفے رٹنا چھوڑ اور اسی لائن پہ آ جا۔ بہت ہو گیا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں یار! مگر مجھے تو یہ نیا پار لگتی نظر نہیں آ رہی۔ کوئی راستہ نظر نہیں

آتا۔ اسی ڈیپریشن میں یہاں تک چلا آیا۔ خود کو بہت تنہا تنہا سا محسوس کر رہا تھا۔ پتا چلا کہ معطر آج تمہاری طرف آنے والی ہے تو سوچا کہ..... ورنہ یقین کرو، ایسے سستے اور اوچھے طریقوں سے ملاقاتیں کرنا نہ اسے پسند ہے نہ مجھے۔'' اس نے ایک بار پھر اپنی اور اس کی پوزیشن صاف رکھنے کے لئے تھوڑی بہت غلط بیانی کے ساتھ کہا۔

''او چھوڑ یار! میں کیا جانتا نہیں۔ مجھے یقین ہے اپنے یار پہ اور یہ تُو نے کیا کہا نیا پیار نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک مٹھو کا تعلق ہے تو پھوپھی جی کے گھر کا ماحول خاصا دوستانہ سا ہے اور پھر وہ اکلوتی بیٹی ہے اس کی پسند وہ مسترد کر ہی نہیں سکتے اور ایسی صورت میں جب اس کی پسند تیرے جیسا بندہ ہو۔ تیری سب سے بڑی سفارش تو تُو خود ہے اور دوسری سفارش میں ہوں۔ پھر فکر کاہے کی۔''

اور میرے گھر والے؟ ان سے نمٹنا کیا کم مشکل ہے۔'' اس نے منہ لٹکا کر کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے، میں رٹھ دا ہو گیا ہوں لیکن نہیں لوگ رٹھ دوں کو بھی عقدِ ثانی کا مشورہ دینے میں دیر نہیں لگاتے۔ میرے لئے تو لگتا ہے دنیا ہی ختم ہو گئی ہے۔ ابھی صرف امی جی سے بات کی تو وہ سنتے ہی ایسے گھبرائیں جیسے خدانخواستہ میں کوئی جرم کر بیٹھا ہوں۔ شادی کے بارے میں سوچ کر۔ ابی جان سے بات کرنے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا، ان کی ہچکچاہٹ پہ میں کھٹک سا گیا ہوں کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے، کہیں خدانخواستہ ابی جان مجھے ماہ نور کے نام پہ عمر بھر کنوارے بٹھائے رکھنے کا ارادہ تو نہیں کر بیٹھے۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے کہنے پہ ایک بار پھر خالہ جان سے بات کر کے دیکھ۔ تھوڑی ڈائیلاگ بازی اور ایکٹنگ سے کام لے یار۔ ماؤں کو بلیک میل کرنا تو بہت آسان ہے۔''

''کوشش کرتا ہوں لیکن ان میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ میری خاطر ابی جان سے ٹکر لے سکیں اور رہے ابی جان تو نہ جانے ان کے دل میں کیا ہے۔'' مہران نے ایک بار پھر امی جان کا سہارا لینے کا ارادہ کیا۔

☆======☆======☆

''آپ بات شروع تو کریں۔'' وہ ایک بار پھر شفیقہ خاتون کے سر پہ سوار تھا۔

''کیسے کروں..... کیا فائدہ؟ وہ ہرگز نہیں مانیں گے۔''

''کیوں نہیں مانیں گے۔ کیا ساری عمر مجھے کنوارا رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس اچھا تھا، مجھے ماہ نور کے ساتھ ہی ''ستی'' کر دیتے۔''

''کیا کر دیتے؟'' وہ ذرا نہ سمجھیں۔

''کباڑا۔'' وہ چلایا پھر امی کی آنکھوں میں حیرت اور غصے کے تاثرات دیکھ کر دھیما پڑا۔ شرمندگی بھی ہوئی کہ کس کا غصہ کہاں نکال رہا ہے۔

''سوری امی! دراصل میں..... آپ سمجھیں پلیز۔ ابی سے بات کرنے میں آخر کیا مضائقہ ہے۔ کم از کم ان کے دل کی بات تو باہر آئے گی۔ پتا تو چلے کہ آخر وہ چاہتے کیا ہیں۔''

''دیکھو بیٹا! تم جانتے تو ہو کہ برسوں سے ان کا یہی خواب رہا ہے تم لوگ اتنے سے تھے تب سے انہوں نے اس خواب کی تکمیل تمام رکھی ہے ایک طویل عرصے سے جو دھن ان کے سر پہ سوار ہے، اسے ایک دم تو نہیں اتارا جا سکتا۔''

''یہ دھن تو تب ہی ختم ہو جانی چاہئے تھی امی جی جب ماہ نور.....'' اس نے لحظہ بھر توقف کیا۔

''کوئی انسان تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ ابی جان کو سب کچھ ان کے حسبِ منشا تو نہیں مل سکتا۔ ان کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہئے کہ طلائیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہیں۔ کچھ فیصلے زندگی خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ ماہ نور کا جانا اور معطر کا میری زندگی میں آنا بھی اس کا بڑا ثبوت ہے۔''

اس نے امی کو ابی سے بات کرنے کے لئے راضی کر ہی لیا لیکن ان کے خدشے بھی بے بنیاد نہ تھے۔ شفیقہ خاتون خود کو ہر طرح کی دھما کہ خیز بات کے لئے ذہنی طور پر تیار کرنے کے باوجود ہکا بکا رہ گئیں۔

''کیا بکواس ہے یہ؟ مہران کی ہمت بھی کیسے ہوئی کسی اور جگہ سوچنے کی۔ کیا وہ جانتا نہیں میں اپنی اولاد کے بارے میں کیا فیصلہ کر چکا ہوں اور امید تو مجھے تم سے بھی نہیں تھی شفیقہ خاتون کہ تم سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی اس کا مقدمہ میرے سامنے پیش کرنے چلی آؤ گی۔ کیا تمہاری نظر میں بھی میرے خوابوں کی کوئی وقعت نہیں ہے؟'' ان کے کڑک دار لہجے میں رفتہ رفتہ گھلتا ملال انہیں پشیمان کر گیا اور وہ خود کو غلط نہ مانتے ہوئے بھی سرزنش کرنے لگیں۔

''جاؤ جا کر کہہ دو اس سے، چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر یہ عشق کا بخار اُتر جانا چاہئے، ورنہ علاج کے لئے مجھے خود کچھ کرنا پڑے گا اور وہ اچھی طرح جانتا ہے، میرا طریقہ علاج کیا ہے۔'' انہوں نے الماری کے پیچھے کئی سالوں سے سنبھال کے رکھی بید کی چھڑی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شفیقہ خاتون کا دل ایک بار پھر بے ایمان ہوگیا، ان کی ہمدردیاں دوبارہ بیٹے کی جانب منتقل ہوگئیں۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ خواجہ جی! جوان بیٹے کے ساتھ کیا کوئی ایسے پیش آتا ہے۔ کیا انوکھا کام کرلیا ہے اس نے، کون سا جرم کر بیٹھا ہے۔ اچھے گھرانے کی ایک سلجھی ہوئی شریف بچی ہے، اس کے رشتے کے لئے ہمیں بھیجنا ہی تو چاہتا ہے۔ اس میں بری بات کون سی ہے۔"

"جب وہ جانتا ہے میں اپنی بہوئیں سالوں پہلے منتخب کر چکا ہوں تو اسے اِدھر اُدھر نظر بھٹکانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دیدہ دلیری تو دیکھو، منہ پھاڑ کے اپنے رشتے کی فرمائش بھی کرائی جارہی ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوگا، اس گھر میں باہر سے کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔ یہ میرا برسوں پرانا فیصلہ ہے۔ آج کل کس گھرانے میں اس خوش اسلوبی سے چار چار بھائیوں کے کنبے اکٹھے رہ رہے ہیں۔ آنے والی پانچویں بہو اگر ان چاروں میں سے نہیں ہوگی تو..... تو بنا بنایا گھر ڈانواڈول بھی ہوسکتا ہے بیگم.....! یہ بات اسے سمجھا دو۔ اس گھر کو گھر بنائے رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اسے اپنی ضد چھوڑنا ہوگی۔"

"آپ کی ہر بات درست، لیکن تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ سب ویسا تو نہیں ہوتا جیسا ہم سوچیں۔" بیٹے کا بڑھایا تازہ بہ تازہ سبق دہرایا گیا۔ "اب اگر ماہ نور نہیں رہی تو مہران کو اپنا گھر بسانے کا کوئی حق نہیں ہے کیا؟ جب جیتا جاگتا انسان پل بھر میں ختم ہوسکتا ہے تو خوابوں کی بساط ہی کیا ہے؟"

"واہ بیگم....." انہوں نے توصیفی انداز میں کہا۔ "ساری عمر یہ حسرت رہی تھی کہ کبھی آپ کے منہ سے بھی چار سیانی باتیں سن لیں لیکن بجلی کے روز بروز بڑھتے نرخوں، لان کے سوٹوں کے کچے رنگوں، مسالوں کے گھٹیا معیار اور ملازمین کی آئے دن کی چھٹی کے دکھڑے رونے کے سوا آپ سے کبھی کچھ نہ سنا۔ ماشاء اللہ آج تو بڑی مدبرانہ گفتگو ہورہی ہے۔" تحسین کے جھینپے مارتے مارتے اچانک انہوں نے پینترا بدلا۔ "لیکن عقل مندی کی باتیں کرنے اور واقعی عقل مند ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔" اس طنزیہ انداز پہ وہ خجل ہو کے رہ گئیں۔ واقعی یہ بڑی بڑی دلیلیں وہ کیسے دے سکتی تھیں بھلا..... بس جو مہران سے سنا، دہرا دیا۔

"خواب کبھی نہیں مرتے، انسان مرجاتے ہیں۔ میرا خواب ماہ نور نہیں تھی، وہ تھیں وہ مگر میرا خواب سلامت ہے۔ اس خواب میں آخری رنگ اب ماہ گل بھرے گی۔"

شفیقہ خاتون پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ شوہر کی مزاج آشنا ہونے کی وجہ سے یہ موہوم سا اندیشہ ان کو کئی دنوں سے ہولا تو رہا تھا۔ خواجہ صاحب کی اطمینان بھری خاموشی اسی طرف اشارہ کررہی تھی لیکن پھر خود ہی وہ اپنے اس خیال کو جھٹلا دیتی تھیں۔ "نہیں نہیں خواجہ صاحب لاکھ ضدی اور جذباتی ہوں پھر بھی ایسا نامعقول خیال ان کے دماغ میں نہیں آسکتا۔" ان سے ہر طرح کی نامعقولیت کی امید رکھنے کے باوجود وہ خوش گمان ہوجاتیں لیکن اب دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے خواجہ خلیق نے ان کی ساری خوش گمانیوں کی ایسی کی تیسی کرکے رکھ دی تھی۔

"یہ..... یہ زیادتی ہے۔" کمزور آواز میں انہوں نے احتجاج کرنا چاہا جسے خواجہ صاحب نے فوراً ہی دبا دیا۔

"کیسی زیادتی؟ کیا غلط سوچ لیا میں نے۔ اپنے گھر کو گھر بنائے رکھنے کی خواہش رکھنا غلط کیسے ہوسکتا ہے؟ اپنی اولاد کو پیار محبت سے اکٹھے ہنستا بستا دیکھنا زیادتی کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو خدا کا کرم ہے، اس نے مجھے کسی امتحان میں نہیں ڈالا، ورنہ سوچو ماہ نور کے بعد اگر ماہ گل کا وجود نہ ہوتا تو میں کس قدر مشکل میں پڑ جاتا۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔" شفیقہ خاتون نے دل ہی دل میں سوچا۔ "ماہ گل کے لئے ایسا سوچنے سے قبل آپ اسے غور سے دیکھ تو لیتے۔ بمشکل تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ برا نہ مانیں لیکن آپ کی اپنی بڑی پوتی ندا تقریباً اس کی ہم عمر ہی ہے جسے آپ ابھی تک کاندھے پہ اٹھائے پھرتے ہیں، اگر کل کو کوئی اس کے رشتے کے لئے آپ سے بات کرنے آجائے تو؟ اور وہ بھی کسی ایسے لڑکے کے لئے جو اس سے عمر میں دوگنا بڑا ہو تو آپ کو کیسا لگے گا؟" ان کا گستاخانہ انداز خواجہ جی کو سخت ناگوار گزرا۔

"تم آج بہت بڑھ چڑھ کے بول رہی ہو شفیقہ۔" ان کے پاس آخری حربہ یہی تھا کہ وہ ڈانٹ کر انہیں چپ کرا دیں اور ایسا ہی ہوا، شفیقہ خاتون سہم سی گئیں لیکن بدبدا کر اتنا کہنے سے خود کو روک نہ پائیں۔

"آپ مجھے تو چپ کرا دیں گے مگر آپ کے اس فیصلہ پہ اور کون ہے جسے اعتراض نہ ہوگا۔ اتنا بے جوڑ سا رشتہ ہے اور بے تکا بھی۔ پھر مہران..... وہ تو ماہ گل کو اس حیثیت سے ہرگز قبول نہیں کرے گا خاص طور پر اب جب کہ وہ کسی اور کو بنجیدگی سے پسند کرنے لگا ہے۔"

"اسے اپنی پسند بدلنی ہوگی اور باقی سب کو بھی اپنے اپنے اعتراض پسِ پشت رکھنے ہوں گے۔ اس گھر کی بقا کے لئے یہ اقدام اب اور زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔ ظاہری بات ہے

اگر آخری بھوبا باہر سے لاؤں گا تو وہ خود کو اوپرا اوپرا محسوس کرے گی۔ یہ چاروں سگی ایک طرف ہوں گی اور وہ اکلے۔ گھر میں دو محاذ کھلے ہوں گے۔ میں مہران کی بہتری کے لئے یہ فیصلہ کر رہا ہوں۔ اسے اپنی زندگی میں سکون اور امن چاہئے تو میری بات مان لے۔"

☆======☆======☆

مہران کے لئے تو ابی جی کا یہ نیا حکم حیاہ کن تھا ہی، باقی سب کے لئے بھی کم غیر متوقع نہ تھا۔ سب ہی اپنی اپنی جگہ حیران تھے، آخر ابی جان کو یہ سوجھی کیسے۔ خواجہ جی کی ہدایت کے پیش نظر گھر بھر میں یہ خبر پھیلانے کے بعد شفیقہ خاتون یوں شرمندہ شرمندہ سی تھیں جیسے اس نامعقول فیصلے میں ان کا برابر کا ہاتھ ہو۔ مہران تو سن کر ہی بدک اٹھا تھا۔

"کمال کرتے ہیں ابی جان، یہ نت نئے تجربے کرنے کے شوق میں آخر کار وہ اپنے اولاد کا بیڑہ غرق کر کے چھوڑیں گے۔ انہیں بتایئے کہ ان کے بیٹوں اور ان کے پالتو جانوروں میں بہت فرق ہے، ان کی اولاد اور ان کی اُگائی سبزیوں کے تقاضے بالکل جدا جدا ہیں۔ تجربے کرنے کے شوق وہ ان ہی پہ پورے کر لیا کریں۔ باگڑو کو دودھ اور ملائی کے بجائے انہوں نے ناشتے میں جیم توس دینے کا تجربہ کیا۔ اسکوبی ڈو کو ہڈیاں اور گوشت کھلانے کے بجائے سبزیاں کھلانے کی کوشش کی۔ ڈونالڈ کو کئی دن پانی سے دور رکھا۔

ان کے اس جدت آمیز تجربات کا کیا رزلٹ رہا، باگڑو نے کھانا پینا ترک کر دیا، اسکوبی ڈو اچھی بھلی پُر امن فطرت بھلا کر ہر آنے جانے والے پر لپکنے لگا اور ڈونالڈ نے چیخ چیخ کر گھر سر پہ اٹھا لیا۔ جب ان کے الٹے سیدھے تجربے بے زبان جانوروں نے قبول نہیں کیے تو مجھ سے یہ توقع نہ رکھی جائے کہ میں ایسی تابعداری کا مظاہرہ کروں گا۔ اگر بات صرف والدین کا حکم ماننے اور اپنی پسند کو اولیت نہ دینے کی ہوتی تو پھر بھی سوچا جا سکتا تھا لیکن.....

ماہ گل..... آپ خود سوچیں..... کوئی ذی ہوش آج کے زمانے میں ایسی بات سوچ سکتا ہے۔ اگر معطر میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تب بھی یہ فیصلہ میرے لئے قطعی ناقابلِ قبول ہوتا۔ آپ ابی جان سے کہہ دیجئے کہ بھلے سے آپ میری خوشیوں کی پرواہ نہ کریں، معطر کو قبول نہیں کرنا تو نہ کیجئے، مجھے منظور ہے لیکن میں صرف ان کی بے تکی سی فرمائش پوری کرنے کی خاطر ایک معصوم بچی کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔

میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری چھوٹی بہنوں جیسی ہے، ندا اور آمنہ کی دیکھا دیکھی وہ مجھے چاچو کہہ کر پکارتی تھی اور میں نے اس میں اور ندا میں کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا اور آپ جانتی ہیں ندا میری کیا ہے؟ وہ میری بیٹی ہے۔"

اس کے قطعی لہجے پر شفیقہ خاتون چپ کی چپ رہ گئیں یوں بھی ان کو چپ ہی رہنا تھا۔ اپنی بساط سے کہیں بڑھ کے وہ پہلے ہی بول چکی تھیں۔ البتہ باقی سب خوب بڑھ بڑھ کے بول رہے تھے۔ سب ہی نے اپنا اپنا ردِ عمل الگ الگ انداز میں ظاہر کیا تھا لیکن سب سے عجیب و غریب ردِ عمل ماہ پارہ بھابی کا تھا۔

"ابی جان کو کم از کم اب تو اپنی اولاد کو اعتماد میں لے لینا چاہئے تھا۔ اتنے سال شادی کو ہو گئے، بال بچے بھی قد کے برابر آ گئے لیکن اب بھی ان بھائیوں کی حیثیت اپنے ابی کی نظر میں ننھے بچوں کی سی ہی ہے۔ اتنا بڑا فیصلہ چپ چپاتے ہو گیا، مشورہ لینا تو دور کی بات، کسی نے ڈھنگ سے اطلاع دینا گوارا نہیں کیا۔"

"بہوؤں کی حیثیت تو تب بنے جب بیٹے خود اپنا مقام بنا پائیں۔" حیرت انگیز طور پر مہ جبیں بھابی نے ان کی تائید کی ورنہ مزاجاً دونوں شمالاً جنوباً تھیں۔

"چلو بہو سمجھتے ہوئے نہ سہی اس حیثیت سے ہی رائے لے لیتے کہ ماہ گل کا ہم چاروں سے کتنا گہرا رشتہ ہے۔"

مہران نے خاصی ناگواری سے ان کا تبصرہ سنا اور مدد طلب نگاہوں سے لقمان اور عمران کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں لاتعلقی کے ساتھ فٹ بال کا میچ دیکھنے میں مگن تھے۔

"ہاں تو اور کیا؟ آخر کب ہماری حیثیت تسلیم کی جائے گی۔ ذمہ داریاں نبھانے میں سب برابر کے شریک لیکن اختیار کسی کے پاس بھی نہیں۔" دونوں متفق ہو گئیں اور مہران مایوس ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"فیصلہ مناسب ہے یا نہ مناسب، اس سے کوئی غرض نہیں۔ بس یہ غم ستا رہا ہے کہ انہیں لفٹ کیوں نہیں کرائی گئی۔" یہ سب سوچتا وہ بڑی بھابی کے پاس چلا آیا، امید تھی کہ وہ اپنی سمجھ داری کی بدولت شاید اس کا مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد کر سکیں۔ وہ ندا کو ہوم ورک کرا رہی تھیں۔ قریب ہی فرقان بھیا کیلکولیٹر اور رسید بک سنبھالے کسی حساب کتاب میں مصروف تھے۔ اس نے ندا کو بہانے سے چائے بنانے بھیجا اور اپنا دکھڑا رونے لگا۔

"بھابی! آپ ہی بتایئے۔ ابی جان کی ضد جائز ہے یا ناجائز۔ میں معطر کو پسند کرتا ہوں لیکن اگر ایسا کچھ نہ بھی ہوتا تو ان کا فیصلہ میرے لئے ناقابلِ قبول تب بھی تھا۔ کوئی تک بھی تو ہو کسی بات کی....."

بھابی کچھ کہنے جا ہی رہی تھیں کہ پہلے بھیا نے قلم ہاتھ سے رکھ کر بیان دیا۔

"ابی جان کو عادت ہے بے تکے جوڑ ملانے کی۔"

بھابی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اس بات سے انہیں کیا غرض کہ کیا جائز ہے کیا ناجائز، کس کی حق تلفی ہو رہی ہے، کس کے ساتھ ناانصافی..... بس ان کا برسوں پرانا خواب پورا ہونا چاہئے۔ ان کے پانچوں بیٹے ایک ہی چھت تلے رہنے چاہئیں..... اب وہ کیسے رہتے ہیں..... خوش یا پھر..... خیر میں نے کہا ناں اس سے انہیں کیا غرض۔ ان کی مرضی کے مطابق ان کے بیٹوں کی بیویاں سگی بہنیں ہیں اور حسب امید خاصے سلوک سے رہ بھی رہی ہیں۔ چلو ان کو بہوئیں تو من پسند مل گئیں، بیٹوں کو بیویاں من چاہی ملیں یا نہ ملیں۔'' بے حد جلے ہوئے انداز میں کیا گیا یہ تبصرہ مہ لقا بھابی کا پارہ چڑھا گیا۔

''بیٹوں کا نام کیوں لیتے ہیں، صرف اپنی بات کریں۔ اتنے سال گزر گئے شادی کو، ابھی تک پچھتاوا ختم ہونے کو نہیں آرہا۔ بیوی کے سامنے جلے دل کی بھاپ اُڑانے کا کیا فائدہ، اتنے ہی ارمان مچل رہے تھے من چاہی دلہن کے تو اس وقت کیوں نہ اپنی مرضی چلا لی۔''

''ہونہہ..... مرضی.....'' انہوں نے استہزائیہ ہنکارا بھرا۔ ''یہ تمہارے سامنے تو کھڑا ہے ''مرضی'' والا، کتنی سنی جاری ہے اس بے چارے کی؟ اور وہ تو وقت ہی اور تھا۔ اس زمانے میں تو ابی جان کے ''تبکے'' ہی اور تھے، رعب مارنے کا حوصلہ نہ تھا۔ بس..... برے پھنسے۔''

''بس کیا کیجئے، بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ بیٹی کو ایک نظر دیکھ لیجئے۔ شاید ہوش آجائے۔ ہر وقت یہی ذکر..... یہی رونے..... سن سن کر تنگ آگئی ہوں میں تو۔'' بھابی نے ہاتھ میں پکڑی کاپیاں نیچے پٹخیں اور سخت عاجز آکر کہا۔

''صرف سن سن کر ہی؟ میری ہمت کی داد دو، دیکھ دیکھ کر تنگ آگیا ہوں بے رونقی..... بدرنگی..... اور بدمزاجی بھی.....'' انہوں نے چھوٹے بھائی کی موجودگی کا لحاظ بھی نہ کیا اور انتہائی خراب الفاظ میں اپنی بے زاری ظاہر کی، جسے سن کر بھابی کے چہرے کا رہا سہا رنگ بھی اُڑ گیا۔ اتنی تذلیل وہ برداشت نہ کر سکیں اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ مہران خود بھی دنگ تھا دونوں کے حالات دیکھ کے۔

بھیا کی بھابی سے بے زاری اور گریز روز اول سے سب پہ عیاں تھا، یہ کوئی دھکی چھپی بات تو نہیں تھی لیکن اس طرح بھیا کو کھل کر بولتے دیکھ کر وہ حیران تھا۔ (یہ تو ان کی عادت نہ تھی) وہ کچھ ٹھٹک سا گیا۔

''پلیز بھیا! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں

اور سمجھ دار بھی، ہر بات کا اثر لیتے ہیں۔ ہر وقت کی نوک جھونک مناسب نہیں۔'' اس نے بھیا کی اچھی خاصی بدزبانی کو مروت میں نوک جھونک کا نام دیا۔ ''عمر کے اس دور میں آکر بردباری.....''

''کیسی عمر، کتنی عمر؟ اور میری عمر یا اس کی عمر؟'' بھیا بھڑک ہی تو اٹھے۔ ''میرا خیال تھا کہ تم پہ یہ وقت آن پڑا ہے، اس لئے کم از کم تم تو میرا دکھ جان پاؤ گے لیکن نہیں..... سب کی نظر میں بس اپنا مسئلہ ہی اہم ہوتا ہے۔ دوسروں کے لئے بڑی آسانی سے صبر اور برداشت کے مشورے دے دیئے جاتے ہیں۔''

''میں اسٹینڈ لے چکا ہوں اور جو دور آپ گزار رہے ہیں۔ اس سے بچنے کی خاطر ہی یہ سب کر رہا ہوں۔ میری نظر میں یہ اہم نہیں کہ میرا من پسند ساتھی مجھے ملے..... یہ بات زیادہ اہم ہے کہ کوئی اور ہستی میری ناپسندیدگی کی بھینٹ نہ چڑھے۔ اگر آپ میں ہمت نہیں تھی اپنی منوانے کی تو اس میں بھابی بے چاری کا کیا قصور۔ وہ خود تو زبردستی آپ کے سر پہ نہیں چڑھیں۔ اپنی بزدلی اور کم ہمتی کی بھڑاس ان پہ نکالنے کا کیا فائدہ؟''

''بھڑاس میں نکال رہا ہوں یا تم؟ تمیز تک نہیں تمہیں بڑے بھائی سے بات کرنے کی؟ اپنی اوقات میں رہو۔ پہلے اپنا کیس نمٹا لو پھر اپنی چہیتی بھابی کی وکالت کرتے رہنا۔'' فرقان آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہی بدک گئے اور اسے کمرے سے چلتا کر دیا۔ دروازے کے باہر سرخ آنکھیں لئے بیٹھی بڑی بھابی کو دیکھ کر وہ نظریں چراتا باہر نکل گیا۔

''مہرو.....''

یہ انداز اور یہ آواز صرف چھوٹی بھابی کی تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھیں موندے لیٹا رہا۔

''مہرو..... کھانا نہیں کھاؤ گے؟'' وہ قریب چلی آئیں۔ ابھی چند منٹ پہلے اس نے رضی کے زور لینے کھانے سے صاف منع کرنے کا پیغام بھجوایا تھا لیکن وہ رہ نہ سکیں اور خود پوچھنے چلی آئیں۔

ہمیشہ کی طرح وہ اس بار بھی ان کے سامنے مجبور ہو گیا اور آنکھوں سے بازو ہٹا کر انہیں خفگی سے تکنے لگا۔ طویل ناراضی کا سارا پروگرام تہس نہس کر دیا تھا انہوں نے اپنے میٹھے لہجے کے وار سے۔

''رضی نے بتایا نہیں آپ کو۔'' وہ روٹھا روٹھا سا بولا۔

''اور رضی نے یہ نہیں بتایا کہ میں نے تمہاری پسند کی مسالہ بھری بھنڈی پکائی ہے اور قیمہ میں شملہ مرچ بھی تمہارے لئے ہی ڈالی ہے ورنہ اور سب تو آلو قیمہ ہی شوق سے کھاتے

ہیں۔ چلو اٹھو..... شاباش..... باہر آؤ..... میں گرم گرم روٹی ڈالوں۔" وہ بازو کھینچ کر اسے اٹھنے پہ آمادہ کرنے لگیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے، بالکل بھی نہیں ہے۔" مہ ناز نے رتی برابر یقین نہ کیا۔ اس نے ناشتے پہ بھی خالی چائے کا کپ ہی لیا تھا اور وہ جانتی تھیں کہ ان کا یہ اکلوتا دیور بھوک کا کس قدر کچا ہے اور خصوصاً چھٹی والے دن تو ناشتہ کرتے ہی دوپہر کے کھانے کے لئے واویلا شروع کر دیتا، کچن میں گھس گھس کر فرمائشیں کی جاتیں۔"

"چلو چلو، نخرے چھوڑو، کھانے سے کیا ناراضی بلکہ ہم سب سے بھی کیا ناراضی، شکایت تو صرف ابی سے ہے پھر یوں گھر بھر سے منہ سجا سجا کر پھرنے کا کیا مطلب؟"

"مجھے سب سے شکایت ہے۔ کون ہے جو میرا ساتھ دے رہا ہے؟ امی ہیں تو ہار مار کے بیٹھ گئی ہیں۔ بڑے بھیا کے پاس گیا تو بجائے میری مدد کرنے کے اپنے پچھلے حساب کھول کے بیٹھ گئے ابی جان سے، الٹا بھابی کی شامت آ گئی، میرا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا اور دونوں کا جھگڑا شروع۔ عمران اور لقمان بھیا سے ڈسکس کرنا چاہا تو دونوں نے حسب عادت لاتعلقی اختیار کر لی، ان دونوں کا تو خیر ہمیشہ سے یہی وطیرہ رہا ہے۔ گھر کے ہر معاملے سے الگ تھلگ رہتے ہیں جیسے کسی سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ بس اپنا آفس، اپنا کام، اپنی بیوی اپنے بچے..... اور بھابیاں..... ان کی بات ہی نرالی ہے، جانتی ہیں اس وقت انہیں کیا غم لاحق ہے کہ ابی جان نے انہیں میٹنگ میں شریک کیوں نہیں کیا اور ان کا مؤقف ہے کہ جب کسی بات میں ان کی رائے طلب کی ہی نہیں جاتی تو پھر وہ دخل بھی کیوں دیں۔ ہر طرف سے صاف انکار سننے کے بعد کیا اب بھی مجھے ناراض ہونے کا حق نہیں۔"

"ہر طرف سے؟ ہر طرف سے تو انکار نہیں ہوا۔ تم نے مجھ سے بات کی؟ اپنے چھوٹے بھیا سے ذکر کیا؟"

"آپ سے؟ مگر آپ کیا کرتیں..... آپ تو خود ابی جان کی....." وہ "چمچی ہیں" کہتے کہتے رک گیا۔ "جب امی جان اور بڑی بھابی نے معذوری ظاہر کر دی تو آپ بھلا کیا تیر مار لیتیں۔"

"اور کچھ نہیں تو تمہیں تسلی دے دیتی، امید دکھا دیتی۔"

"اوہو..... تسلی..... امید..... ہاں بھئی خزانے بھرے پڑے ہیں آپ کے پاس تسلیوں کے، امیدوں کے بھی انبار لگے ہیں لیکن صرف زبانی کلامی امداد سے کچھ بننے والا نہیں۔ بات تو جب ہے کہ عملی طور پر کوئی قدم اٹھائے۔ اگر آپ ابی جان کو ان کا فیصلہ تبدیل کرنے پہ مجبور

کر سکیں تو مانیں۔" اس نے چیلنج کر دیا۔ ظاہر ہے مہ ناز بھابی سے زیادہ ابی جان کی تابعداری اور جی حضوری کرنے والا اور کون تھا۔

"کیا فیصلہ، فیصلہ لگا رکھا ہے۔ کون سا فیصلہ میرے منے بھیا؟ بھلا فیصلہ بھی کبھی یک طرفہ ہوتا ہے؟" وہ پُراسرار طریقے سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"کیا مطلب؟ ارے اتنے سالوں سے آپ جان نہیں پائیں۔ یہاں تمام فیصلے یک طرفہ ہوتے ہیں۔ اولاد کو پراپرٹی سمجھ کر بڑی آسانی سے تمام معاملات نمٹائے جاتے ہیں۔"

"ہاں مگر اپنی اولاد کے..... کسی اور کی اولاد پہ کیا زور؟"

"ہیں..... یعنی..... کیا کہنا چاہ رہی ہیں آپ؟" وہ چونکا۔

"صاف اور سیدھی بات ہے، یہ ابی جان کا فیصلہ ہے لیکن اسے منظوری تو میرے ابا جی ہی دیں گے۔ تم بات آگے بڑھے تو دو..... تیل دیکھو اور تیل کی دھار۔" مہ ناز کی بادامی آنکھوں میں شرارت تیر رہی تھی۔

"یعنی آپ دو بدو آنے کے بجائے پسِ پردہ رہ کر میری مدد کریں گی۔" وہ پُرجوش ہو کر اٹھ بیٹھا۔

"ہاں لیکن اگر ضرورت پڑی تو..... ورنہ مجھے امید ہے کہ ابا جی خود ہی سمجھ داری کا ثبوت دیں گے۔ دراصل بہت سی باتیں ہیں جنہیں ابی جان اپنی جذباتیت میں نظرانداز کر رہے ہیں، یہ سب میرے اور تمہارے بجائے ابا جی انہیں بہتر طور پر سمجھا پائیں گے۔"

اس گفتگو کے بعد وہ وقتی طور پر مطمئن ہو گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ شیخ نواز حسین سے ابی جان کی بات ہونے سے پہلے اتنا پریشان ہونا قبل از وقت ہے۔

اس کی طبیعت پہ چھایا بکھرا دور کرنے میں کچھ ہی دیر بعد آنے والا معطر کا فون مزید مددگار ثابت ہوا لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے میں مخصوص بشاشت پیدا نہ کر سکا جسے معطر نے فوراً محسوس کر لیا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کچھ بجھے بجھے لگ رہے ہیں؟"

"خیریوں تو مت کہو۔ مکمل بجھا تو نہیں ہوں بس ذرا ٹمٹما رہا ہوں۔"

"خیریت؟ یہ کس نے مزاج شریف کے شعلے پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کی ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"میرے ابی جان نے اور کس میں اتنا دم ہے۔" وہ سنجیدہ ہوا تو معطر بھی چپ کر گئی، اس کے والد کا ذکر سن کر۔

"کہیں یہ سب میری وجہ سے تو نہیں ہوا مہران؟" وہ فکر مند ہوگئی تو اسے لب کھولنے ہی پڑے۔

"اوکم آن مظو۔" لاڈ میں آکر وہ اسے اسی نام سے پکارتا۔ "میرے اور ابی جان کے درمیان یہ سب چلتا ہی رہتا ہے۔ اب کوئی نہ کوئی تو گھر میں ایسا ہونا چاہئے جو آمریت سے ٹکر لے ورنہ حکمرانوں کی عادتیں مزید خراب ہوسکتی ہیں۔" اس نے لائٹ سے انداز میں کہا لیکن معظر کی حساس طبیعت اور بے چین ہوا تھی۔

"کیسی باتیں کررہے ہیں آپ اپنے والد کے بارے میں۔ ٹھیک ٹھیک بتائیں۔ کوئی زیادہ بدتمیزی تو نہیں کی ان سے۔"

"نہیں یار....."

"مجھے یار مت پکاریں۔" اس نے ناگواری سے ٹوکا۔ "ہاں اب آگے بتائیے۔"

"محترمہ..... بلکہ عزت مآب محترمہ ہمایوں صاحبہ! ناچیز نے اپنے والد بزرگوار سے کسی قسم کی کوئی گستاخی نہیں کی۔ بندہ صرف اقبال جرم کر بیٹھا ہے یعنی آپ کو پسند کرنے کا اظہار کیا ہے اور بس..... ظاہر سی بات ہے جس گھر میں اولاد کا چوں کرنا بھی ناممکن ہو وہاں اگر کوئی سپوت باقاعدہ چاں چاں کرنے لگ جائے تو ایک دم جھٹکا تو لگتا ہے ناں برسر اقتدار شخصیت کو۔"

اس کے انداز میں ہنوز لاپرواہی تھی۔ درحقیقت وہ دانستہ اس معاملے کی سنگینی ظاہر کرنا نہ چاہ رہا تھا۔

"کیا واقعی بات سیریس ہوگئی ہے۔" مہران کو اس کی آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ اس کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہوں گی۔

"نہیں بھئی، ایسی خاص پریشانی والی بات نہیں۔ دراصل تم تو ہو اپنے پیرنٹس کی اکلوتی صاحبزادی۔ تم نے یہ بھرے پُرے کنبوں والے مسائل کہاں دیکھے ہوں گے۔" "آج کیا پکے گا" جیسے روزمرہ کے مسئلہ پہ بھی ہمارے گھر میں دس دس آرا پیش ہوتی ہیں اور یہ بات بھی خاص الخاص ہے۔ جتنے لوگ ہیں اتنے ہی مشورے۔ خیر سے چار تو میری بھابیاں ہیں، امی جان کی پسند الگ اور ابی جان تو خیر ہیں ہی سب سے زیادہ نکتہ چیں۔"

"نہیں مہران مجھے ڈر لگتا ہے۔ آپ پلیز ایسی کوئی کوشش مت کیجئے گا جس کے نتیجے میں اتنے لوگ آپ سے خفا ہوجائیں۔ جو آپ سے ناراض ہوکر مجبوری کی حالت میں مجھے قبول کریں گے، ان کے دل میں بھلا میرے لئے کتنی گنجائش ہوگی۔ میری حیثیت تو کمزور اور

بودی ہی رہے گی۔ مجھے نہ عزت ملے گی نہ محبت۔ نہ جانے کیا کیا برداشت کرنا پڑے۔" اس کے آنسو چھلک پڑے۔

"بس یہی تو ساری بات ہے۔" وہ جھنجھلا گیا۔ "نہ تم میری فیملی کو اچھی طرح جانتی ہو نہ ہی وہ تمہیں۔ تم اپنے طور پہ اندازے لگا لگا کر ناامید ہورہی ہو مجھے اپنی پسند پہ غرور ہے کہ تمہیں کوئی ریجیکٹ کرہی نہیں سکتا اسی طرح اپنے گھر والوں پر بھی یقین ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرہی نہیں سکتے۔ ارے میرے ابی جان تو باقاعدہ سر پہ چڑھاتے ہیں بہوؤں کو۔"

"کوئی کھٹ پٹ، لڑائی جھگڑا..... کچھ نہیں ہوتا کبھی؟" وہ متجسس تھی، جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہنے والے لمبے چوڑے خاندانوں کے درمیان جاری فسادات اکثر سنتی رہتی تھی۔

"اوں..... ہاں ہوتے تو ہیں۔" کچھ سوچ کر اس نے ایمانداری سے جواب دیا۔ "بلکہ شاید ہر روز ہوتے ہیں لیکن ویسے ہی جیسے بہت سارے بہن بھائی اکٹھے رہتے ہوں تو گرمی سردی ہوجایا کرتی ہے لیکن بھائیوں میں یہ سب چلتا رہتا ہے۔ ہم روٹھتے ہیں، جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے کے لئے پریشان بھی ہوتے ہیں، سب چلتا ہے۔"

"ہاں یہی تو زندگی کا حسن ہے۔ گلے شکوے کہاں نہیں ہوتے۔ بس انہیں انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہئے اور آپ کی بھابیاں..... کیا وہ بھی اتنی ہی فراخ دل ہیں۔"

"ویسی ہی ہیں جیسے ہم بھائی ہیں، فراخ دل یا تنگ دل اس کا مجھے پتا نہیں۔ ایک ہماری بھابی ہیں مہ لقا صاحبہ۔ تم نے لقا کبوتری کا سن رکھا ہوگا۔ بس وہی کلف ان کی گردن میں بھی ہے اور یہی اکڑ ہے جو انہیں نقصان پہنچا رہی ہے ورنہ وہ ایک آئیڈیل قسم کی بہو، ماں، بہن اور بھابی ہیں بس ہوی اچھی نہیں بن پا رہیں اپنے شوہر کی نظر میں۔ عمر کا فرق اتنا زیادہ بھی نہیں اور نی زمانہ تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں کسی عورت کے لئے کہ وہ اپنی عمر میں سے چند سال حذف کرکے اور زیادہ کم عمر دکھائی دے لیکن اس میں شاید ان کی انا آڑے آتی ہے یا پھر گھر بھر کا بوجھ اور ذمہ داریاں تن تنہا نبھانے کا شوق راہ میں رکاوٹ ہے۔ اتنے سارے کام ذمے لے رکھے ہیں کہ خود پہ توجہ دینے کا وقت ہی کہاں بچتا ہوگا ان کے پاس۔ اس لحاظ سے دیکھوں تو کبھی کبھار بھیا کی تلخی جائز بھی لگنے لگتی ہے۔

دوسری بھابی مہ پارہ ہیں، لقمان بھیا کی بیوی۔ شیخ چلی کا زنانہ روپ سمجھ لو۔ منصوبے بنوا لو ان سے جتنے مرضی اور ان پہ پانی بھی پھروا لو۔ آرام کرنا اور کرتے رہنا ان کا محبوب مشغلہ ہے، جس طرح خیالی پلاؤ پکانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں، اسی طرح ساری بھابیوں

میں اولاد کے معاملے میں بھی وہ سب سے بڑھ کر خود کفیل ہیں اور دو بار تو اپنا ریکارڈ بہتر بنانے کی غرض سے انہوں نے جڑواں شاہکار بھی پیش کیے۔"

معطر کی ہنسی سن کر مہران کو تسلی ہوئی، وہ یہ سارا غائبانہ تعارف اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے ہی تو کر رہا تھا۔

"اور ہاں یاد رہے کہ مہ پارہ بھابی کا پارہ بہت جلدی اور بہت معمولی باتوں پہ ہائی ہو جاتا ہے اور تیسرے نمبر پہ ہیں بھابی مہ جبیں۔ اپنے نام کے کچھ گن ان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کچھ اس کا زعم اور کچھ یہ کہ سسر جن صاحب کی اہلیہ ہیں۔ میرے ان بھیا کو خدا نے اب تک اولاد کی نعمت سے بھی محروم رکھا ہوا ہے اور ہاں ان والی بھابی کے لئے ایک احتیاطی تدابیر ذہن نشین کر لو۔ انہیں تنقید، چاہے وہ جائز ہی کیوں نہ ہو پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں نہ صرف وہ گھر کی خواتین میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ خوش مزاج، خوش شکل، خوش لباس اور خوش ذوق بھی ہیں۔ ویسے سوچنے والی بات یہ ہے کہ اپنی ذات میں اتنے "خوش" جمع کر لینے کے بعد بھی نہ جانے کیوں وہ خوش نہیں رہتیں۔"

"اور لاسٹ نمبر والی بھابی؟" معطر کو بھی اس ذکر سے دلچسپی ہو گئی تھی۔

"ہاں..... وہ تو میری جگری یار ہیں..... مہ ناز بھابی..... یوں تو انہیں ناز پرور پھر نازک مزاج وغیرہ ہونا چاہئے تھا لیکن انہوں نے اپنے نام کا الٹا اثر لیا۔ ان کی زندگی کا مقصد بس دوسروں کے ناز نخرے اٹھانا ہی ہے۔ جتنا جبران اِدھر کی اُدھر لگانے میں ماہر ہے، اتنا ہی یہ صلح کروانے میں، ماحول سازگار بنائے رکھنے میں پیش پیش۔ میں کہتا ہوں کہ خدا نے جبران کی ذات کے ازالے کی صورت میں یہ بھابی اس گھر میں بھیجی۔" وہ ہنسا، حالانکہ جبران بے چارہ کوئی اتنا بھی ماسی مصیبتے نہیں تھا لیکن سب کچھ بتاتے بتاتے مہران اپنے بارے میں یہ انکشاف کرنا تو بھول ہی گیا تھا کہ اس سے بڑھ کے مبالغہ آمیز کوئی اور نہیں۔

"تو میرے پیچھے پیچھے ہی لگا رہا کر، کسی دن ایسے ہی پیروں تلے آ کر کچلا جائے گا بد بخت۔" ابی جان کی شہد میں ڈوبی ڈانٹ دور سے ہی سنائی دے رہی تھی۔ ساتھ ہی ڈونالڈ کی منت بھری قیں قیں جیسے کہہ رہا ہو۔

"سانوں دی نال اپنے لے چل وے۔"

اسے ابی جان کے دائیں بائیں آگے پیچھے گھومنے کا بڑا شوق تھا لیکن اس کے اس شوق کی خاطر خواجہ صاحب کو چلنے میں اتنی احتیاط کرنی پڑتی گویا کیچڑ بھرے راستے سے اینٹوں پہ پاؤں دھر دھر کے گزر رہے ہوں۔ اس وقت بھی چلنے کے اسی اسٹائل کی وجہ سے اور ڈونالڈ کو

پڑنے والی جھاڑ سن کر مہران پہلے سے محتاط ہو گیا۔ اس نے معطر کو الوداعی کلمات کہے اور ریسیور رکھ کر بڑا مؤدب سا ہو کے خبر نامہ دیکھنے لگا۔ نیوز ریڈر اس وقت موسم کے حالات سنا رہا تھا۔

"یہ تم کیا لگا کر بیٹھے ہو جھوٹ کا پلندہ، وہ ذرا اسٹار پلس تو لگانا۔" دونوں پاؤں اوپر کھینچ کر خواجہ خلیق الرحمان بڑی فرصت کے ساتھ صوفے پہ جم گئے۔ وہ جز بز ہو کر رہ گیا۔ ESPN پہ میچ لگنے والا تھا اور وہ باہر جانے کا پروگرام کینسل کرتے ہوئے صرف یہ میچ دیکھنے کے لئے بیٹھا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ گھر میں صرف ایک ٹی وی تھا۔ بھوئیں اپنے جہیز میں بھی ٹی وی لے کر آئی تھیں لیکن ایک گھر میں بیٹیاں دینے کا شیخ صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ ان کی سفید پوشی کا بڑی آسانی سے نباہ ہو گیا تھا۔ مہ لقا اور مہ پارہ کو ایک ہی ٹی وی ملا تھا اور ایک ہی واشنگ مشین۔ کافی عرصہ دونوں بہنیں مل کر کپڑے دھوتی رہیں اب دو تین سالوں سے الگ الگ دھل رہے تھے لیکن ایک ہی مشین استعمال ہوتی، ایک دن مہ لقا لگا لیتیں، دوسرے دن مہ پارہ۔ یہی طریقہ ٹی وی دیکھنے کے لئے بھی رائج تھا۔

فرقان اور لقمان کو ملنے والے کمروں کے آگے مختصر سی لابی تھی اس میں ٹی وی رکھ دیا۔ مہ جبیں اور مہ ناز دونوں کو بھی ایک ہی ٹی وی، ایک ہی فریج اور ایک ہی واشنگ مشین میں نمٹا دیا گیا۔ بیڈ روم فرنیچر البتہ سب کو الگ ملے تھے۔ ان کے ذاتی استعمال کے فرنیچر کے علاوہ خواجہ صاحب نے مزید لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ تو یوں بھی جہیز کے خلاف تھے۔ ضرورت کا سب سامان گھر میں موجود تھا۔ بڑے لاؤنج میں ان کا اپنا ٹی وی رکھا ہوا تھا جو کہ ان کے اور مہران کے درمیان وجہ تنازعہ تھا۔ انہیں لمبی لمبی قسطوں تک چلنے والے ڈرامے بہت پسند تھے اور وہ نیشنل جیوگرافکس، سپورٹس چینل یا پھر کبھی کبھار HBO پہ کوئی فلم دیکھنا پسند کرتا جو کہ ابی جان کو سخت ناگوار گزرتا اب بھی مسلسل بڑبڑا رہے تھے۔

"ایک تو کیبل والے کو بول بول کر اسٹار پلس کھلوایا ہے، کم بخت رات کو چند گھنٹوں کے لئے لگاتا ہے ورنہ اس وقت لگنے والے سارے ڈرامے سکون کے ساتھ دوپہر کو دیکھ لیا کروں، تمہارے ساتھ چخ چخ نہ کرنی پڑے۔"

"جب حکومت کی طرف سے بھارتی چینلز دیکھنے پہ پابندی ہے تو کیا ضرورت تھی کیبل آپریٹر کو ورغلانے کی۔ یہ ایک قانونی جرم ہے۔ آپ کا کیا جائے گا، کسی نے شکایت کر دی تو اس غریب کا لائسنس ضبط ہو جائے گا۔ وہ بے چارہ کیا کرے، آپ جیسے کسٹمر دھمکیاں دے دے کر یہ سب کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔" اسے تو یوں بھی ان چینلز سے خار تھی، بند ہونے پر

سکون کا سانس لیا تھا۔

''میری سمجھ سے باہر ہے صرف ان چینلز کو بند کرنے سے کیا حاصل؟ یہ فرنگی اور یہو
کون سا مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں، ان کی اوٹ پٹانگ فلمیں تو بڑے شوق سے دیکھتے ہ
انہوں نے اعتراض کیا۔

''ان کی فلمیں زیادہ تر تصوراتی ہوتی ہیں جب کہ یہ ڈرامے سیدھا ہماری گھریلو زند
پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان ڈراموں کے ذریعے وہ ہمارے کلچر پہ وار کر رہے ہیں۔''

''خاک وار کر رہے ہیں، میں تو کہتا ہوں سدھار رہے ہیں۔ اپنے ڈرامے اٹھا کر
لو، اسمگلنگ، قتل و غارت، خاندانی دشمنیاں، جرگے اور ان کے ڈرامے، سیدھی سادی گھ
کہانیاں، بڑوں کا ادب سکھا رہے ہیں، مل جل کے رہنا سکھا رہے ہیں، لگاؤ تم جلدی سے
وہ بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

''ابھی آپ کے پسندیدہ ڈرامے میں کافی وقت ہے۔ وہی ہے ناں'' کیونکہ ساس
کبھی بہو تھی.....''

''اوہو، تم لگاؤ تو سہی اس سے پہلے وہ ''کہانی گھر گھر کی'' لگتا ہے۔'' ان کے با
کے اصرار پہ زچ آتے ہوئے اس نے اپنا ناپسندیدہ چینل لگا ہی دیا۔ سکرین پہ بنارسی سا
میں ملبوس ایک سانولی سی عورت فل میک اپ کے ساتھ ہنڈیا میں ڈوئی ہلا رہی تھی، اس
اِدھر اُدھر دیکھا اور پہلو میں چھپا کے رکھی زہر کی شیشی کھانے میں انڈیل دی۔

''ہائے ہائے، کمینی، ٹھگنی، تیرا بیڑا ہی غرق۔'' امی جان بھی افسوس سے ہاتھ
آ بیٹھیں۔ انہیں ہر سین پہ بے لاگ تبصرہ اور وہ بھی لائیو کرنے کی عادت تھی۔

اگلے سین میں بڑی بھابی کے کسی جذباتی سین کی داد دیتے ہوئے خواجہ صاحب
جمائیاں لیتے مہران کو مخاطب کیا۔

''کیوں؟ یہ بے راہ روی سکھائی جا رہی ہے؟ یہ بھارتی ڈرامے خاندانوں کو مل
سکھا رہے ہیں، قربانیوں کا درس دے رہے ہیں۔'' وہ بہت بڑے فین تھے ان سیریلز کے
اب بیٹے کو بھی متفق کرنا چاہ رہے تھے۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ ہندو معاشرہ ہم سے بہتر ہے
جو باتیں ہمیں اپنانی چاہئیں، ہم سے سیکھ کر وہ اپنا چکے ہیں۔''

''جی نہیں، آپ کا تجزیہ اتنا درست بھی نہیں، الٹا ہم ان کا اثر لے رہے ہیں۔ یہ ا
کلچر ہے وہی مہا بھارت والا اور رامائن والا۔ مہا بھارت میں کیا ہے، خاندانی چپقلشوں
فسادات سے بھری پڑی ہے، پانڈوں نے کیا کیا نہیں کیا اپنے ہی خون کے ساتھ ا

رامائن، سوتیلی ماں کی سازشیں، بھائیوں کے آپسی اختلافات، یہ تو حال ہے ان کی مذہبی
کتابوں کا۔ صدیوں سے یہی کچھ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایک چھت تلے رہتا ہے اور ایک
دوسرے کی جڑیں کاٹتا ہے۔ یہی سب کچھ ان ڈراموں میں ہوتا ہے۔ پورے گھرانے میں
کوئی ایک فرد بے چارہ سا ہوتا ہے، باقی سب اس پہ کمر کس کے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ جو آپ کا پسندیدہ سیریل ہے جس کے انتظار میں آپ بیٹھے ہیں۔ کئی کئی دیورانیاں،
جیٹھانیاں آگے سے ان کی بھی بہوئیں، کئی نسلیں اکٹھی رہ رہی ہیں لیکن ہر قسط میں کیا دکھاتے
ہیں، سازشیں، چغلیاں، عناد، بغض وغیرہ وغیرہ اس سے تو بہتر تھا کہ یہ سب الگ رہتے، کم از
کم گناہوں سے تو بچتے۔'' اس نے مفصل لیکچر دیا۔ ابی جان نے جوابی گھوری ڈالی۔

''برخوردار! میں سب سمجھتا ہوں یہ سب کہنے سے تمہارا مقصد کیا ہے۔ تم بھی اپنی نسل
کے دیگر لوگوں کی طرح ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کے حق میں ہو۔ والدین کے حقوق
سرے سے فراموش کر کے جوائنٹ فیملی سسٹم کے خلاف مظاہرے کرتی ہے یہ نسل۔ سب وین
سے دوری کا نتیجہ ہے۔'' یہ طعنہ وہ برداشت نہ کر سکا۔ مزید بحث سے احتراز کرتا ہوا وہ اٹھ
کے اپنے کمرے میں جانے کو تھا کہ پھر سے جم گیا۔

''میں اور کسی کی بات نہیں کرتا لیکن کم از کم میں والدین کے حقوق سے بے بہرہ نہیں۔
حقوق العباد کی اسلام میں بڑی وضاحت ہے لیکن کہیں دیورانی کے حقوق، جیٹھانی کے
فرائض، دیور کے حقوق اور بہو کے فرائض نہیں بیان ہوئے بلکہ میرے ناقص علم کے مطابق تو
اسلام میں مشترکہ خاندانی نظام کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ وضاحت کر دوں کہ میں والدین کے
ساتھ رہنے کو مشترکہ خاندانی نظام نہیں سمجھتا، وہ تو خاندان کا ہی ایک حصہ ہیں بلکہ بنیاد، جب
دو سگے بھائی یا دو سگی بہنیں شادی کر کے گھر بساتے ہیں، اپنے اپنے گھروں کی بنیاد رکھتے ہیں،
ان کے بال بچے ان کا خاندان ہوتے ہیں اور ہر شخص اپنے خاندان کی کفالت کا ذمہ دار
ہے۔

محمود انکل سعودیہ اٹھارہ سال رہ کر آئے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ وہاں بیٹے کی شادی
کرتے ہی الگ کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اسلام میں سسر، جیٹھ، دیور سب نامحرم ہیں اور عورت کو
ان سے پردے کی ہدایت ہے اس کے ساتھ ساتھ گھر کی چار دیواری میں عورت کو پردے
سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اس کا کیا مطلب؟ ظاہر ہے ایک شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو
نامحرموں سے الگ، خود مختار گھر مہیا کرے۔ سارے عرب ممالک میں بھی یہی سسٹم ہے۔
اماں بھی ساس، بہو وغیرہ کا مسئلہ نہیں اٹھا۔''

"دین ہم سب کا بے شک ایک ہی ہے لیکن کچھ اثر کلچر کا بھی تو ہوتا ہے۔ عربوں یہی معاشرت....." خواجہ صاحب اس کے مدلل بیان کے باوجود ہار ماننے پہ تیار نہ تھے۔

"دیکھا.....دیکھا.....بات معاشرت کی آہی گئی۔ یعنی آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ا بات کا تعلق مذہب سے نہیں معاشرہ سے ہے اور رہا کلچر تو سب جانتے ہیں، ہندوؤں ساتھ صدیوں رہنے کے بعد ان کا کلچر ہم میں رچ بس گیا ہے۔ رہی سہی کسر سٹیلائٹ پوری کر دی۔ جن رسموں سے نئی نسل ناآشنا تھی وہ بھی رائج ہو گئیں۔ میں تو ان ڈراموں دکھائے جانے والے کلچر اور رجحان کی بالکل بھی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ یہ انسان کو کھل جینے اور فیئر ہو کر جینے کے بجائے ایک دوسرے کے ساتھ زبردستی منسلک رہ کر جینا سکھا ہیں۔ لڑو، مرو، سب اکٹھے رہو۔" اس نے بات مکمل کر کے ابی جان کی طرف دیکھا، خلا توقع وہ خاموش بیٹھے تھے۔ چہرے کی چمک ماند تھی اور نظریں تھکی تھکی۔

"شاید جوش جذبات میں آ کر میں زیادہ ہی بول گیا۔" اسے افسوس ہوا۔ سا بھائیوں میں بس وہی ان کا سرچڑھا تھا اور کبھی کبھار بحث ومباحثے میں حد سے بڑھ بھی تھا۔ اب بھی اس کا مقصد انہیں چپ کرانا نہیں تھا نہ ہی وہ خاندانی سسٹم کا اس قدر مخالف تو بس یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ ان کی سوچ انتہا پسندانہ ہے، زور زبردستی کے ذریعے چاہے بندھنوں میں باندھ کر، اولاد کی مرضی اور خواہش کو پس پشت ڈال کر بنائے گھروندے اتنے بابرکت نہیں ہوتے۔ بس زور بیاں میں کچھ زیادہ ہی شدت آ گئی۔ خاتون نے بھی بیٹے کو ملامتی نظروں سے نوازا۔

"تو تم مل کر رہنا نہیں چاہتے، کھل کر جینا چاہتے ہو، فیئر ہو کر.....ہم سب تو بد ہیں۔ اکٹھے رہ کے ایک دوسرے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ سازشی ماحول ہے ا کا.....ہوں۔" انہوں نے جلد ہی اپنی کیفیت پہ قابو پالیا اور کڑک دار لہجے میں بیٹے استفسار کیا۔ اس کی ساری طراری ہوا ہو گئی، ابی کے اس موڈ کے آگے اس کی ایک نہ چلتی بے چارہ گھگھیانے لگا۔

"ابی جان.....مم.....میرا مطلب یہ تو نہ تھا.....میں تو بس.....بس مثال د تھا.....جنرل سی بات ہے۔"

"اپنی مثالیں سنبھال کر رکھو۔ تمہاری تقریروں سے میرا ارادہ متزلزل نہیں ہو میں نے جو سوچ رکھا ہے، خدا کے فضل سے ہو کر رہے گا۔ میں ماہ نور کی برسی کے انتظا کہ گزر جائے تو بات بڑھاؤں لیکن تمہارے ارادے نیک نہیں برخوردار..... مجھے عملی

اٹھانا ہوگا.....بیگم.....میرا گرتا شلوار تو نکالنا۔" ماں بیٹا دونوں گھبرا گئے۔

"کیا کر رہے ہیں خواجہ جی، رات بہت ہو گئی ہے۔ ایسے وقت کسی کے گھر جانا اور وہ بھی اس مقصد سے.....کچھ نامناسب ہے۔" امی جان نے بات بنائی۔ انہوں نے بھی وال کلاک پہ ایک نظر ڈالی اور ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔

"ہاں یہ تو ہے لیکن کل صبح دس بجے مجھے ہر حال میں وہاں جانا ہے۔ فرقان کو بتا دینا، مجھے لیتا ہوا جائے۔"

☆======☆======☆

صبح مہران کی بے چینی اس کے ہر عمل سے ہویدا تھی۔ مہ ناز بھابی کی تسلی تشفی کے باوجود اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کسی طرح ابی کو انکل نواز کے گھر جانے سے روک دے۔ اوپر سے ابی کی تیاری اور اس کی جان جلا رہی تھی۔ سفید دودھ کلف زدہ شلوار کے ساتھ چمچماتی سیاہ چپل اور تو اور کلائی میں وہ گولڈن اسٹریپ والی گھڑی بھی باندھ رکھی تھی جو کہ تقریبات اور اہم مواقع کے لئے مخصوص تھی۔ انہیں ڈائننگ چیئر گھسیٹ کر احتیاط سے گرتے کا دامن اٹھا کے بیٹھتے دیکھا تو اس نے اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لئے اخبار پھیلا کر چہرے کے آگے کر لیا لیکن شاید ان سے یہ انداز برداشت نہ ہوا۔ اخبار کی پشت پہ ٹھک ٹھک ہوتے سن کر بادل نخواستہ اپنے چہرے کے تاثرات ٹھکانے پہ لاتے ہوئے اس نے اخبار نیچے کیا۔

"جی ابی!" حتی الامکان برخورداری لہجہ پیدا کرتے ہوئے جیسے ہی نظر اٹھائی، ڈونالڈ ڈائننگ ٹیبل پہ چڑھا اپنی چونچ سے اخبار پہ دستکیں دے رہا تھا۔ ابی کے آگے پراٹھا رکھتی مہ ناز بھابی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ انہوں نے آملیٹ کا تنقیدی جائزہ چھوڑ کر بہو کو گھورا۔

"تمہیں کیا ہوا؟"

"جج.....جی کچھ نہیں۔"

"اور تم....." اب سامنے ٹیبل سے بیٹھے بیٹے کو گھورا۔ "تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

"نہیں.....میں تو کچھ بھی نہیں....." آئیں بائیں شائیں کرتا وہ ڈونالڈ کو کینہ توز نظروں سے گھورنے لگا، جس کی مداخلت بے جا نے یہ سچویشن پیدا کی تھی۔

"کیا کچھ نہیں.....ابھی ابھی تو تم نے مجھے پکارا۔"

"میں سمجھا تھا آپ نے مجھے پکارا ہے۔" اس نے بمشکل بہانہ گھڑا، اب کیا بتاتا بے خیالی میں وہ اس بطخے کو.....

"سبحان اللہ، کیا عالم بے خودی ہے، خیر میاں ہمیں بھی ہوش ٹھکانے لگانے آتے

ہیں۔" پراٹھے اور آملیٹ کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے انہوں نے کہا پھر فرقان کو ناشتے سے اٹھ کر بریف کیس سنبھالتے دیکھ کر کہنے لگے۔

"رکو فیقے، مجھے بھی تمہارے ساتھ چلنا ہے۔"

"لیکن گرمیوں میں تو آپ گھر پہ ہی رہا کرتے ہیں۔" لفظ "فیقے" پر بھیا جی بھر کے بدمزہ ہوئے۔

"تو کوئی آئین تو نہیں بن گیا کہ سال کے آٹھ مہینے میں نظر بند ہی رہا کروں گا اور بالفرض ایسا ہے بھی تو آئین میں ترمیم کی گنجائش تو بہرحال رہتی ہے۔"

(یہ ابی بھی کس قدر بحث کرنے لگ گئے ہیں) مہران نے غور کیا۔

"ابی جان! مجھے بھلا کیا اعتراض ہے آپ کے جانے پر۔ ویسے بھی مجھے آج ایک میٹنگ کے لئے قصور جانا ہے، اچھا ہی ہے آفس خالی نہیں رہے گا، آیئے آپ کو ڈراپ کرتا جاتا ہوں۔"

"آفس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، سالوں پر کھ لینے کے بعد ہی عملہ تمہارے حوالے کیا تھا، بے شک بے فکر ہو کر کہیں بھی چلے جایا کرو۔ مجھے تو تمہارے سسرال جانا ہے۔"

"وہاں پہ کیا....." وہ چونکے پھر کچھ خیال آیا۔ "اچھا..... اچھا..... اچھا لیکن اتنی صبح..... خیر..... میرے لئے تو مشکل ہے۔ آفس تو رستے میں پڑتا ہے لیکن وہاں آپ کو ڈراپ کر کے پھر قصور جانے کے لئے نکلنے میں میرا پورا ایک گھنٹہ ضائع ہو جائے گا۔ شہر کے دوسرے کونے میں ڈھونڈ نکالا تھا آپ نے میرا "سسرال"۔ عمران سے کہہ دیں، آپ کو چھوڑ آئے۔" بڑی عجلت میں کہتے وہ سلام کرتے ہی باہر کی طرف بھاگے۔

جبران نے خاصے معنی خیز انداز میں بھیا کو دیکھا۔ ابی بھی بڑے بیٹے کے صاف جواب پہ پہلے حیران اور پھر غضب ناک ہو گئے لیکن اتنی دیر میں وہ ان کی پہنچ سے نکل چکے تھے۔

"دیکھا..... دیکھا اسے..... اس فیقے کو..... کیسے منہ اٹھا کے نکل گیا ہے۔ شادی سے پہلے اتنی ہی افراتفری اسے سسرال جانے کی ہوتی تھی، اب مجھے جانا ہے تو سسرال دور پڑنے لگا ہے۔"

"نئے نئے سسرال کی اور بات ہوتی ہے ابی!" جبران نے پُراسرار انداز میں کہا۔ "نیا سسرال دور نہیں پڑتا۔ بھلے شہر کے دوسرے کونے پہ ہو یا پھر شہر سے باہر۔"

"کیا مطلب؟" نیلی پہ موجود تینوں نفوس اس کے سادہ الفاظ کے پیچھے چھپے مفہوم کو بھانپ کر بولے۔ ویسے بھی جبران سادہ بات تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔

"مطلب یہ ابی کہ قصور کے آئے روز کے پھیرے کوئی اور کہانی سنا رہے ہیں۔"

"تم نہ باز آنا ہوائیاں چھوڑنے سے۔ ارے قصور میں تو ہمارے کئی کسٹمر ہیں۔ بزنس ڈیلنگز کے لئے جانا ہی پڑتا ہے۔ میں خود بھی جاتا رہتا تھا۔"

"لیکن آپ ہفتے میں دو دن تو وہاں نہیں گزارتے تھے اور آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں ابی کہ اس قسم کی ڈیلنگز میرا کام ہے۔ بھیا کے ذمے تو آپ نے آفس کے اندرونی معاملات لگا رکھے ہیں۔" جبران کا اٹھایا نکتہ ٹھک سے خواجہ خلیق الرحمان کے دل پہ لگا۔ انہیں سوچ میں پڑتا دیکھ کر وہ اور پُرجوش ہو گیا۔

"میرے علم میں آج تک ان کی ایسی کوئی ڈیلنگ یا میٹنگ نہیں آئی جس کا ذکر کر کے وہ سارا دن آفس سے غائب رہتے ہیں۔"

"ہوں..... ہے تو یہ مینا ہی..... بچپن کی عادت ہے چھپ چھپاتے کارنامے انجام دینے کی۔ جتنا زمین سے باہر ہے اتنا ہی اندر..... خیر تم پتا لگاؤ اور خبردار کوئی شیطانی نہیں۔ تمہیں ٹھیک ٹھاک صاف دال میں بھی کالا دانہ ڈالنے کی عادت ہے۔" ہمیشہ کے وہمی اور شکی طبیعت رکھنے والے خواجہ صاحب کھٹک ضرور گئے تھے لیکن جبران کی لگائی بجھائی کی عادت سے بھی واقف تھے، اس لئے تنبیہہ کرنا نہ بھولے۔

☆======☆======☆

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں خواجہ صاحب؟"

شیخ نذیر حسین صرف اتنا ہی کہہ پائے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات پکار پکار کر کہہ رہے تھے۔

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"آپ سٹھیا تو نہیں گئے؟"

"آپ پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں؟"

"کیا آپ کی مت ماری گئی ہے؟"

"کہیں آپ کو باؤلے کتے نے تو نہیں کاٹ لیا؟"

ان کے چہرے پہ ان سارے سوالوں کی جھلک اتنی واضح تھی کہ خود خواجہ صاحب گڑبڑا گئے۔

"بھئی، صاف صاف الفاظ میں کہہ رہا ہوں کہ ماہ نور کی جگہ میں ماہ گل کو دینا چاہتا ہوں یعنی اپنے چھوٹے بیٹے کے لئے اب بھی آپ ہی کے گھرانے کے آگے طلب گار

ہوں۔"

"یہ تو آپ کی محبت ہے خواجہ صاحب....." وہ متوحش تھے۔ "لیکن دیکھیں جی، محبت اس قدر اندھی بھی نہیں ہونا چاہئے۔"

"ہیں؟ کیا مطلب؟"

"مطلب تو صاف ظاہر ہے۔ ایک تو مہران بیٹے اور ماہ گل کی عمر میں آدھو آدھ (دگنا) فرق اور دوسرا خود ماہ گل کی عمر..... وہ تو ابھی ساتویں جماعت چڑھی ہے، گڑیوں سے کھیلنے کی عمر ہے اس کی۔ شادی تو بہت دور کی بات ہے۔"

"مثلاً..... کتنی دور کی؟" وہ تحمل سے پوچھنے لگے۔

"تقریباً آٹھ، دس سال تک۔"

"تو ٹھیک ہے، ہم انتظار کرلیں گے، آٹھ چھوڑیں بارہ سال تک کرلیں۔ اب تو آپ کا یہ اعتراض دور ہونا چاہئے کہ اس کی گڑیوں سے کھیلنے کی عمر ہے۔ بارہ سال بعد تو یقیناً آپ اس کا یہ شوق چھڑوا ہی چکے ہوں گے۔" ہلکے پھلکے انداز میں اپنی دانست میں انہوں نے بڑا نفیس مذاق فرمایا تھا لیکن شیخ صاحب کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

"آپ نے میرے دوسرے اعتراض پہ غور نہیں کیا خواجہ صاحب۔ مہران اور ماہ گل کی عمروں کے درمیان موجود کئی سال..... یہ فرق بارہ سال بعد بھی جوں کا توں برقرار رہے گا۔ آج مہران کے مقابلے میں ماہ گل کا جوڑ ایک بچکانہ سا خیال لگ رہا ہے تو کل ماہ گل کے سامنے مہران مضحکہ خیز لگے گا۔ دس سال بعد آپ کا بیٹا چالیس سال کا ہو رہا ہوگا۔ میرا اعتراض تو تب بھی یہی ہوگا۔"

"یعنی..... آپ کو یہ رشتہ..... آپ انکار کر رہے ہیں۔" بڑی بے یقینی سے کہتے ہوئے انہوں نے شکست خوردہ انداز میں پوچھا۔ لہجے میں شکستگی اور آنکھوں میں حسرت اتنی نمایاں تھی کہ برہم سے شیخ نذیر حسین بھی پسیج گئے۔ وہ خواجہ صاحب کی اس خواہش کے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھے۔ پہلے سے ہی جانتے تھے کہ اپنے بیٹوں کے لئے ان کی بیٹیوں کا انتخاب کرنے کی وجہ کیا تھی لیکن یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ اس حد تک آگے چلے جائیں گے۔ ان کا مقصد نیک سہی لیکن یہ فیصلہ انتہا پسندانہ تھا۔

"میں معذرت کر رہا ہوں..... آپ سے اتنے برسوں کے تعلقات ہیں۔ اگرچہ آپ سے رشتہ بڑا نازک سا ہے، بیٹیوں کا سمدھیانہ وابستہ ہے آپ سے لیکن سالوں پرانی دوستی کے

ناطے اتنا کہنے کی ہمت کروں گا کہ ذرا جذبات سے باہر نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ کے دیکھیں۔ آپ نے کس قدر آرام سے کہہ دیا کہ آٹھ تو کیا بارہ سال انتظار کرلیں گے۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں خواجہ صاحب؟ یہ انتظار آپ کو نہیں کرنا، آپ کے بیٹے کو کرنا ہے۔ ہمیں شکر کرنا چاہئے۔ اس دور میں بھی ہماری اولادوں نے اپنے مستقبل کی ڈوریں ہمارے ہاتھوں میں تھما رکھی ہیں لیکن اس اختیار کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ نیک، تابعدار اولاد خدا کا عطیہ ہوتی ہے، کیا اس عطیے کو صرف اپنی ذاتی خواہشوں کی تکمیل کے لئے ضائع کر دینا چاہئے؟ اس بارے میں ضرور سوچئے۔"

وہ خواجہ صاحب پہ سوچ کے کئی در وا کر گئے، وہ مہران کو اچھی طرح جانتے تھے اور ماہ گل سے اس کی انسیت سے بھی واقف تھے۔ اس لئے صرف انکار پہ اکتفا نہ کیا بلکہ دوستی کا استحقاق استعمال کرتے ہوئے تھوڑی بہت گرد بھی صاف کی، جو خواجہ خلیق الرحمان نے اپنی خود پسندی اور اختیار پسندی کے زعم میں اپنے دل و دماغ پہ پھیلا رکھی تھی۔

☆======☆======☆

اگلے چند روز خاموشی سے گزرے۔ اگرچہ خواجہ خلیق الرحمان نے آنے کے بعد کوئی بات کی، نہ کسی نے کریدنا چاہا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سب لاعلم تھے۔ وہ جہاں سے ہو کر آ رہے تھے وہاں کی "چار کھٹ کیاں" خواجہ ہاؤس میں کھلتی تھیں جنہوں نے ایک ایک منظر سب کو دکھا دیا، لیکن مصلحتاً سب خاموش رہے۔

مہران کو جہاں اس سلسلے کے ختم ہونے کا احساس اطمینان بخش رہا تھا وہاں ابی کی خاموشی اور اضمحلال خلش میں مبتلا کئے دے رہا تھا۔ شفیقہ خاتون بھی ہمدردی سے شوہر کو دیکھ کے رہ جاتیں۔ سب چپ چاپ منتظر تھے کہ کب ان کے لبوں کا قفل ٹوٹے۔ آخر تیسرے روز شام کی چائے پہ وہ باہر نکلے۔ مہ لقا بھابی جوان کے لئے ٹرے میں چائے اور جلیبی رکھ رہی تھیں، انہیں لان میں آتا دیکھ کر جھٹ پٹ ٹرے خالی کرنے لگیں۔ مہ ناز بھابی بھی اندرامی جان کو اطلاع دینے بھاگیں۔ وہ بھی ان کی آمد کا سنتے ہی وظیفہ مختصر کرنے لگیں۔ ابی کے بیٹھتے ہی سکوپی ڈوگیٹ کی رکھوالی چھوڑ کر کیاریوں کے نزدیک آ بیٹھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر دُم ہلانے لگا۔

باگڑو نے بھی جست لگائی اور ان کی گود میں براجمان ہو گیا۔ پورے تین روز بعد وہ کمرے سے نکلے تھے۔ چائے کے دوران ہی امی بھی تسبیح پڑھتی ان کے برابر بیٹھ گئیں اور مہ جبیں بھابی جو تھکن کی وجہ سے اکثر چائے اپنے کمرے میں منگوا لیا کرتیں، اپنا کپ ہاتھ میں

تھامے لان میں نکل آئیں۔ مہران ٹٹولتی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا لیکن کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ ان کے چہرے پہ ایک سپاٹ سا تاثر تھا۔

''ددو ددو!'' رضی بھاگتا ہوا آیا اور پیچھے سے اپنے دادا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''ددو! آپ بیمار ہیں؟''

''نہیں بیٹا۔'' انہوں نے پوتے کا ماتھا چوما۔

''تو پھر آپ دن رات آرام کیوں کرتے رہتے تھے۔ میں جب بھی آپ کے پاس جانے لگتا تھا، بڑی ماما روک دیتیں کہ ددو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' وہ تائی کو بڑی ماما کہتا تھا۔

''انہیں کیا پتا کہ آپ کے ددو کی طبیعت اچھی ہے یا بری۔ آپ آجاتے میرے پاس۔ آپ ہی تو میرے ڈاکٹر ہو۔'' انہوں نے باگڑو کی چھٹی کرائی اور رضی کو گود میں بٹھالیا۔

''اور میں نرس۔'' آئینہ نے چھوٹا دوپٹہ سر پہ جمایا۔ وہ ابھی ابھی قاری صاحب سے سپارہ پڑھ کے آرہی تھی۔

بچوں کی ہلکی پھلکی باتوں نے وہ کرب دکھایا جو وہ سب کرنا چاہ رہے تھے مگر کر نہیں پا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد خواجہ صاحب پہلے جیسے موڈ میں آگئے اور سب نے اطمینان کی سانس لی لیکن پھر بھی کسی کو اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی یہ ذکر چھیڑ دیں گے۔ اس لئے اس وقت سب ہی دنگ سے رہ گئے جب رات کے کھانے پہ سرسری سے انداز میں انہوں نے بڑی بہو کو مخاطب کر کے پوچھا۔

''منہ لگا! چھوٹے سے پوچھو، کون ہے وہ لڑکی، کس خاندان سے ہے، ذات برادری، اتا پتا سب کچھ.....''

''ابی.....'' کچھ توقف کے بعد مہران نے کھنکھار کر کہنے کی ہمت کی۔

''ابی.....وہ راحت کی کزن ہے۔''

''راحت.....کون راحت؟''

''جی وہ راحت، اسی کے گھر میں پہلی بار.....میرا مطلب ہے، وہیں دیکھا تھا میں نے اسے۔''

''بہت خوب۔'' خواجہ صاحب کا چہرہ تمتمانے لگا۔ ''مجھے معلوم نہ تھا، آپ اتنے دل پھینک ہیں۔ پہلے محترمہ راحت سے راہ و رسم بڑھائی پھر ان کی کزن پہ فدا ہو گئے۔ میں پوچھتا ہوں اس بے چاری کا کیا ہوگا، کیا گزرے گی اس بدنصیب پہ جسے چھوڑ کر اب تم اس کی کزن

پہ لٹو ہو گئے ہو۔''

''کون بے چاری، کون بدنصیب؟'' وہ ہونق تھا۔

''وہی راحت، جو اس سے پہلے تمہاری منظور نظر تھی۔''

''لاحول ولا.....'' اس کا جی مکدر ہو گیا۔ ''راحت میرا پرانا دوست ہے ابی! کئی بار یہاں آیا ہے بلکہ اس کی بہن کی شادی کی دعوت دینے پوری فیملی بھی آئی تھی۔ امی آپ کو تو یاد ہے ناں؟''

''ہاں ہاں، بڑی بھلی خاتون ہیں۔''

''ان ہی کی بھانجی ہے معطر۔''

''معطر.....واہ بڑا مہکا مہکا سا تر و تازہ سا نام ہے۔'' چھوٹی بھابی نام پہ ہی خوش ہو گئیں۔

''اب تر و تازہ ہو یا باسی، کیا فرق پڑتا ہے۔ چلو میاں! تم نے جو نعمتیں مان رکھی تھیں، پوری ہوئیں۔ تڑکے اٹھ کے چڑھاوے چڑھا دینا شکرانے کے۔ میری مرضی نہ تو ماہ نور تھی نہ ہی ماہ گل، میں تو صرف یہ کڑی خون کے رشتوں سے جوڑنا چاہتا تھا لیکن جب یہ نہیں ہو سکا تو پھر معطر آئے یا چلتر، ایک ہی بات ہے۔'' بڑی بے نیازی کے ساتھ انہوں نے مہران پہ جتا دیا کہ وہ بادل نخواستہ اس کو پسند کو اپنانے پہ تیار ہو رہے ہیں۔ اس نے بھی ابی کا یہ احسان جی جان سے اپنے سر لے لیا۔

☆======☆======☆

اس سے اگلا مرحلہ بغیر کسی بدمزگی کے طے ہو گیا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ آناً فاناً طے ہو گیا۔ شفیقہ خاتون راحت کی والدہ کے توسط سے ان ہی کی ہمراہی میں یہ رشتہ لے کر گئی تھیں، اس لئے روایتی تکلفات کا دور نہ چلا۔ لڑکی کے ماموں نے ضمانت دی اور بغیر کسی پس و پیش کے میجر ہمایوں جعفر نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ اب تک خواجہ خلیق الرحمان کے کسی رویئے سے نہ لگ رہا تھا کہ وہ اس رشتے پہ دل و جان سے راضی ہیں۔ مہران ان کے چہرے پہ حقیقی مسرت تلاشتا ہی رہا لیکن وہاں فقط اندیشے تھے.....ہراس تھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ معطر پہ پورا بھروسہ تھا کہ وہ جلد ہی ابی کو اس خود ساختہ خوف سے آزاد کر دے گی۔ اسے بس آنے والے وقت کا انتظار تھا۔ وقت جو خود سب ثابت کر دے گا، لیکن اس سے پہلے جبران نے ثابت کر دیا کہ.....

ہوا یوں کہ ابی تو اسے فرقان کی سرگرمیوں پہ نظر رکھنے کا کہہ کر خود بھول بھال گئے بلکہ

تازہ رُونما ہونے والے واقعات نے یہ بات ان کے ذہن سے یکسر مٹا ڈالی۔ دیگر افراد بھی اس سرسری سے ذکر کو یاد نہ رکھ پائے، یوں بھی جبران کی تو عادت تھی اِدھر سے اُدھر کی پھیلانا.....لیکن اب.....اب اس نے جس وثوق سے یہ دھماکا کیا اس نے سب ہی کو ہلا کر رکھ دیا، ویسے بھی وہ لاکھ گپی ہو۔ اتنی بڑی بات بے پَر کے تو نہیں اُڑا سکتا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ اگر جبران نے مفروضات کا پہاڑ کھڑا بھی کیا ہوگا تو کہیں نہ کہیں تہہ میں رائی ضرور ہوگی اور اس ذرے کی چبھن ہی اتنی شدید تھی کہ سب بے چین ہو گئے۔ سب سے بری حالت بڑی بھابی کی تھی، وہ جلے پیر کی بلی کی طرح شوہر کے انتظار میں پھرنے لگیں ان کی بھنچی ہوئی مٹھیوں، کپکپاتے لبوں، شرر لپکاتی نگاہوں سے سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ آج بڑے بھیا کی کیا درگت بنے گی اور ان سے بھی بڑھ کے تلملا رہے تھے خواجہ صاحب۔ مہران بھی باقی سب کی طرح حیرت زدہ تو تھا لیکن دم بخود نہیں کیونکہ نہ جانے کیوں.....بھیا کی کمی اداپہ وہ پہلے ہی کھٹک سا گیا تھا۔

بھابی سے انہیں لاتعلق دیکھنا تو معمول کی بات تھی لیکن اب کھلم کھلا بے زاری کا اظہار یہ اعلان بہت پہلے کر گیا تھا کہ اب ان کی نظروں میں کوئی اور چبھنے لگا ہے۔

''بڑے بھیا قصور میں سبرینہ فیکٹری کی سپروائزر فریدہ مقبول عرف فیری میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ موصوفہ بیوہ مشہور ہیں۔ یہ الگ بات کہ چھبیس ستائیس سال سے اوپر نہیں لگتی اور رنگ ڈھنگ سولہ سترہ سال والی دوشیزاؤں کے ہیں۔ ایک معمولی سی پوسٹ پہ چھ ہزار تنخواہ کے ساتھ ٹھاٹ باٹھ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں جو اس بات کا اشارہ ہے کہ بھیا یا بھیا کی طرح ہی کچھ اور قدر دان خاصا نواز تے رہتے ہیں محترمہ فیری کو۔ ہفتے میں دو یا پھر ایک چکر تو ضرور ہی لگتا ہے بھیا کا قصور میں۔''

یہ انکشاف کر دینے کے بعد وہ ایک طرف بیٹھا گنڈیریاں چوسنے لگا۔ مہ جبیں بھابی شانے پہ بیگ لٹکائے جانے کو تیار تھیں، اب ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے صوفے پہ براجمان ہو گئیں، مہ پارہ بھابی بھی اپنے اسٹوڈنٹس کو چھ کا پہاڑہ رٹنے کے لئے دے کے اٹنک سمیت ہی آ کر ان کے برابر ٹک گئیں۔ دونوں نے پہلی فرصت میں فون کر کے اپنے اپنے میاؤں کو بھی بلوا لیا تھا تاکہ وہ اس تھرل سے محروم نہ رہیں۔

مہ ناز تاسف سے اپنے کھلنڈرے مزاج شوہر کو تکنے لگیں جسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس تھا نہ معاملے کی نزاکت کا۔ اگر یہ بات سچ بھی تھی تب بھی اسے یوں سرِ عام بھانڈا پھوڑنے کے بجائے صرف ابی کو مطلع کرنا چاہئے تھا، وہ خود ہی اپنے ڈھنگ سے اسے نمٹا

لیتے۔ اس طرح بات کھل جانے کا خوف بھی اگر بڑے بھیا کے سر سے اُتر گیا تو وہ مزید دلیر ہو جائیں گے۔

لقمان اور عمران تقریباً آگے پیچھے گھر میں داخل ہوئے۔ دونوں کو اصل قصہ سننے کی بے تابی تھی اور دونوں کی مشترکہ تسلی وتشفی مہ پارہ بھابی نے بصد شوق احسن طریقے سے کرائی۔ ابھی وہ مکمل تفصیلات سے فیض یاب ہو ہی رہے تھے کہ بڑے بھیا کی آمد ہو گئی۔ سب الرٹ ہو کے بیٹھ گئے، بڑی بھابی کے متحرک قدم رک گئے۔ ابی نے بھی مونچھوں کو تاؤ دینے کا شغل ترک کیا۔ فقط امی جان تھیں جن کی سرگرمی پہ کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ حسبِ معمول چپ چاپ تسبیح کے دانے گرائے جا رہی تھیں، اب اور زیادہ خشوع وخضوع سے دانے گرنے لگے۔ ہال کے سناٹے میں پچھلے برآمدے سے آتی آدھ درجن بچوں کی آواز بیک گراؤنڈ سکور کا م دے رہی تھی۔

چھ دونی بارہ

چھ تیا اٹھارہ

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے بھیا کا پہلا قدم جیسے ہی اندر پڑا، تمام اہلِ خانہ کو ایک ہی تاثرات سجائے دیکھ کر تھم سا گیا۔

''السلام.....علیکم.....'' الجھے ہوئے سے انداز میں سلام کرتے انہوں نے پھر سے نظروں نظروں میں سب کو جانچا۔

''اوہو.....میں تو بھول ہی گیا، آج اپنے مہرو کی تاریخ رکھنے جانا تھا ناں.....چچ چچ.....آپ سب شاید میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بس دس منٹ اور.....میں شاور لے کر چینج کر لیتا ہوں۔ واقعی بہت دیر ہو گئی لیکن آپ سب بھی تو کمال کرتے ہیں، مصروفیت میں میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی تو آپ میرے موبائل پہ رنگ کر لیتے۔''

بڑی عجلت کے ساتھ کہتے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگے کہ ابی کی سرد آواز نے ان کے قدم اور اعصاب دونوں منجمد کر دیئے۔

''صاحبزادے! پہلی بات تو یہ کہ مہرو کے دن رکھنے آج نہیں اتوار کو جانا ہے اور دوسری بات یہ کہ جب تم بی بی فریدہ کے ساتھ ہوتے ہو تو اپنا موبائل بند رکھتے ہو، ایسے میں اگر تمہارا باپ بھی مر جائے تو تمہیں اس کی اطلاع نہ ہو سکے گی اور ہونی بھی نہیں چاہئے، ہفتے بھر کی جدائی کے بعد تم سوجنوں کے ساتھ، بیوی کی وفاؤں کا مذاق اُڑاتے ہوئے، جوان ہوتی اولاد کے سامنے ڈھٹائی دکھاتے ہوئے اور بوڑھے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے

ہوئے اس سے ملنے جاتے ہو، کسی کا کیا حق کہ وہ تمہاری خلوت میں دخل دے سکے۔''

خواجہ فرقان ایک جھٹکے کے ساتھ پلٹنا چاہتے تھے لیکن چھوٹے بھائیوں اور بھاوج کی موجودگی میں بھید کھل جانے کی خجالت نے انہیں منہ پھیرے رکھنے پر مجبور کیا۔ ان کا کترایا کترایا پشیمان سا انداز دیکھ کے مہ لقا ڈھے گئیں۔ نہ جانے کیوں اس قدر طیش کے عالم میں بھی انہیں امید تھی کہ وہ اس الزام پر بھڑک اٹھیں گے، جبران کو ڈانٹ ڈپٹ کر یہ کہلوالیں گے وہ مذاق کر رہا تھا اور یہ امید تو شاید سب ہی کے دلوں میں تھی جب ہی بھیا کا خاموش اعتراف سب کو ملال دے گیا۔

''مجھے تجھ سے یہ امید نہ تھی فرقان..... تُو تو..... تُو تو میرا سب سے سیدھا سادا سا بیٹا بچہ تھا۔'' امی جان پھپک کے رو دیں۔ بھابی کے آنسوؤں کو بھی راہ مل گئی۔ ساس کے شانے پہ سر ٹکا کر وہ سسکنے لگیں۔ بچے آوازیں سن کر پریشان سی شکلیں لئے اس طرف آ گئے۔

''کیا ہوا بڑی امی..... ماما..... آپ دونوں کیوں رو رہی ہیں۔'' ندا پوچھنے لگی لیکن بھابی ہر چیز سے بے خبر تھیں۔

''ہائے..... میں بھروسے میں ہی ماری گئی۔ مجھے کیا پتا تھا فرقان آپ اس عمر میں مجھے یہ غم دکھائیں گے۔''

ندا اور نادر نہ سمجھنے کے سے انداز میں باپ کو دیکھنے لگے جو پہلے ہی بیٹی کی آواز پہ تڑپ کے نزدیک آ گیا تھا اور اب ملتجی نگاہوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ مہ ناز بھابی بچوں کا ہاتھ تھام کے اوپر اپنے کمرے میں لے گئیں۔

بچوں کے منظر سے غائب ہوتے ہی فرقان بھیا کی شرمندگی بھی دھیرے دھیرے دبکنے لگی اور ابی کی لعنت ملامت کے جواب میں ہلکی ہلکی سرکشی نمودار ہوتی گئی۔ سب ہی حیرت اور افسوس کے ساتھ ان کی بودی دلیلیں سن رہے تھے، جو ہر دو منٹ کے بعد اپنا رنگ بدل رہی تھیں۔

''آپ سب کو شدید غلط فہمی ہو رہی ہے بلکہ بلکہ..... یہ سب فساد اس خبیث کا پھیلایا ہوا ہے۔'' جبران کی طرف خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے انہوں نے پہلا وضاحتی بیان دیا تھا۔ ''میں تو فیکٹری کے کام سے قصور گیا تھا، کسی فیری ٹیری کو میں ہرگز نہیں جانتا۔'' جواباً ابی نے قصور کی اس فیکٹری کو ہرگز نہ جاننے کا اعلان کیا جہاں سے ہو کر وہ آ رہے تھے۔ (بقول ان کے)

''اوہو آپ کیا جانتے ہیں بھلا، کئی سال سے برائے نام چند گھنٹوں کے لئے آفس

آتے ہیں وہ بھی مہینے میں ایک دن، نئی نئی ڈیلنگز کرنا میرا کام ہے آپ کا نہیں۔'' اب جوابی کارروائی کے طور پہ جبران نے یاد دہانی کرائی کہ آؤٹ آف اسٹیشن ڈیلنگز اس کا ڈیپارٹمنٹ ہے ان کا نہیں۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں۔ میں بزنس کے سلسلے میں نہیں گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ضرور کسی عورت کا ہی چکر ہوگا۔ میرا بڑا اچھا دوست ہے وہاں۔ اس کے ساتھ دن گزارا ہے۔ آخر ہفتے بھر کی ٹینشن کے بعد کچھ ریلیکس کرنا میرا بھی حق ہے۔'' یہ ان کا اگلا بیان تھا۔

''تو اتنا چھپ چھپا کر ریلیکس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' ابی گرجے۔

''اور میں پوچھتی ہوں، بیوی بچے اور بھرا پُرا گھر ہوتے ہوئے باہر، کسی غیر کے پاس دن گزارنے میں کیا آرام ملتا ہے انہیں؟ یہ سب بہانے ہیں، جھوٹ ہے۔'' بھابی سرے سے کسی ''مردانہ دوست'' کے وجود سے انکاری تھیں۔

''جب کسی کو گھر میں آرام نہ ملے، سکون میسر نہ آئے تب ہی وہ باہر کی خاک چھانتا ہے۔'' آہستہ آہستہ بھیا کھلنے لگے۔

''کیوں صاحبزادے! تمہیں کیا دفتر سے آنے کے بعد بچے نہلانے پڑتے ہیں، بیوی کے پیر دابنے پڑتے ہیں، آٹا گوندھنا پڑتا ہے، جھاڑو لگانا ہوتا ہے یا پھر دیگ دم دینی ہوتی ہے۔'' ابی نے جواب طلبی کی۔

''ان محترمہ کا بس چلے تو یہ سب بھی کروالیں مجھ سے۔ آپ نے بیوی نہیں ہیڈ ماسٹرنی میرے سر پہ بٹھا رکھی ہے ابی۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس کی زیر ہدایت زندگی گزار گزار کے۔ یہ مجھ سے بڑی ہے، مانتا ہوں، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہر وقت ہی اپنا بڑا پن ثابت کرنے پہ تلی رہے۔ میں نے ہزار بار اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ بیوی ہو بیوی بن کے رہو، اماں مت بنو لیکن اس نے ہمیشہ میری بات مکھی کی طرح اُڑا دی، اب بھگتے۔ اسے اماں بننے کا شوق ہے، اپنا شوق پورا کرتی رہے۔ مجھے بیوی کی ضرورت ہے..... میں.....'' طیش میں کھلتے کھلتے وہ سب کچھ کہہ گئے۔ ہوش آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اتنی دیر سے جو بودے بہانے گھڑے جا رہے تھے۔ سب منہ کے بل گر گئے۔

''تو..... کیا آپ نے..... آپ نے دوسری شادی کر لی؟'' بھابی صدمے سے سفید پڑ گئیں۔ ابی بھی پہلے خوب گرج چمک رہے تھے لیکن اب بیٹے کی ڈھٹائی کے مظاہرے پہ ڈھیلے پڑ گئے۔

''نہیں۔'' فوراً تردید کی گئی لیکن کسی کو یقین نہ آیا۔ ان کے جھوٹ سچ کی حقیقت ابھی کچھ دیر پہلے سب ہی نے دیکھ لی تھی۔

''میں نے دوسری شادی ابھی تک کی تو نہیں لیکن اگر بات کھل ہی چکی ہے تو اتنا بتا دوں کہ میرا ارادہ یہی ہے۔'' علی الاعلان اپنا ارادہ ظاہر کر دینے کے بعد وہ منظر سے غائب ہونا ہی چاہتے تھے کہ خواجہ صاحب کی ''پدرانِ شفقت'' پھر سے جوش میں آ گئی۔ فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر چھڑی کے ذریعے ان کا راستہ روکا۔

''کیا کہا؟ کیا ارادہ ہے تمہارا؟ ذرا پھر سے کہنا تو؟''

''جی..... وہ میں.....'' ابی کو پھر سے فارم میں آتے دیکھ کر وہ اپنی فارم کھونے لگے۔

''دوسری شادی.....؟ ہوں..... یہی کہہ رہے تھے تم؟''

''دوسری شادی کرنا کوئی گناہ تو نہیں ابی؟ میں کوئی ناجائز کام تو نہیں کر رہا ہوں۔ آخر اسلام میں.....'' وہ اپنی پوزیشن سنبھالتے ہوئے دفاع میں کچھ کہنا چاہ ہی رہے تھے کہ ابی نے بات کاٹ دی۔

''خبردار جو اسلام کا نام لیا۔ کیا میں جانتا نہیں تمہارا اسلام کہاں سے کہاں تک ہے۔ اتنی عمر ہوگئی، اب بھی میری سو باتیں سن کر ہی مارے بندھے بس جمعہ کی نماز پڑھنے جاتے ہو۔ رمضان کا سارا مہینہ بیمار پڑ کے روزے سے بھی جان چھڑا لیتے ہو۔ ڈاڑھی تم نے نہیں رکھی، سونا تم پہنتے ہو، موسیقی، فلمیں سب چلتا ہے۔ تب اسلام یاد نہیں آتا۔ خبردار جو تم نے منہ کھولا۔ مجھے چار شادیوں والی دلیل دینے کی کوشش بھی مت کرنا۔'' چھڑی کی نوک ان کے سینے پہ ٹھونک کر وہ یوں گرجے کہ بے چارے فرقان منہ ہی منہ میں بدبدا کر سہم گئے۔ بھابی بھی انہیں کمزور پڑتا دیکھ کر سنبھل گئیں۔

''چلو اپنے کمرے میں۔ اب تمہاری کوئی شکایت نہ سنوں میں، سمجھے اور رہی تمہاری وہ فیری شیری تو..... ایسی حسیناؤں کی حقیقت میں اچھی طرح جانتا ہوں اور تم پہ بھی عیاں کر دوں گا۔ جبران!''

''جی ابی!'' وہ آخری گنڈیری کی باقیات منہ سے نکال کر الرٹ ہو گیا۔

''دو دن کے اندر اس چمک چھلو کا سارا کچا چٹھا کھول کر اس کے سامنے لاؤ۔ ذرا اس کے عشق کا بخار تو اُترے۔''

اور جبران کے لئے کسی کا پول کھولنے کے لئے دو دن بھی بہت زیادہ تھے۔ اگلی رات وہ تمام ثبوت سمیت موجود تھا۔

''نام تو اصل ہی ہے یعنی فریدہ، البتہ بیوہ نہیں ہیں۔ دو بار کی طلاق یافتہ ضرور ہیں۔ پیروائزر کی معمولی سی پوسٹ کی بھی اہل نہیں یعنی صرف مڈل پاس ہیں۔ صرف اپنے تعلقات کی بناء پر پیکنگ گرل سے ڈائریکٹ اس سیٹ تک آئیں۔ ان کی بڑی ہمشیرہ رشیدہ عرف روشنی اپنی ان ہی خاندانی حرکات وسکنات کی وجہ سے جیل میں ہیں۔ والد صاحب ابھی کچھ روز قبل بڑی دختر سے ملاقات کر کے آئے ہیں۔ ان کی یہ ملاقات تقریباً چار سال جاری رہی، جرم منشیات کی فروخت تھا۔ مس فیری ہماری ہی کمپنی کے اسسٹنٹ منیجر اور اکاؤنٹینٹ کو بھی اپنی زلفوں کا اسیر بنا چکی ہیں۔''

اس نے مختلف کاغذات ثبوت کے طور پہ سامنے پھیلا دیئے۔ چند اخبارات بھی تھے۔ ایک میں اس کا باپ ہتھکڑی لگائے اکڑوں بیٹھا تھا، دوسری میں بڑی بہن کا خوفناک کلوز اَپ تھا ''بلیک میلر حسینہ'' کے کیپشن کے ساتھ اور ایک دو پہر کے سستے سے اخبار میں وہ بذات خود براجمان تھیں اپنے سابقہ شوہر کے الزامات کے ساتھ جن کے مطابق مس فیری کا کام ہی شادی کے بعد مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے شوہر کی دولت ہتھیا لینے کے بعد طلاق پہ مجبور کرنا ہے۔ فرقان بھیا کا سر شرم اور افسوس سے جھک گیا۔

''باپ کی پسند پہ بڑا اچھل اچھل کر اعتراض کر رہے تھے۔ یہ ہے تمہاری پسند۔ جرائم پیشہ گھرانے کی بدنام، نکی بدمعاش عورت۔''

وہ چپ چاپ اٹھ کے اپنے کمرے میں چل دیئے۔

''چلو اٹھو، تم سب بھی اپنے اپنے کمرے میں جاؤ۔ تماشا ختم ہو چکا اور مہ لقا..... تم رکو بیٹی۔''

سب کے جانے کے بعد انہوں نے بڑی بہو کو قریب بلایا اور کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے جیسے بولنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہے ہوں۔

''بیٹی! تماشا واقعی ختم ہوا لیکن..... کچھ کہہ نہیں سکتا کہ دوبارہ یہ تماشا کب لگے۔''

''نہیں ابی! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے ہوتے میں کبھی کمزور نہیں پڑوں گی۔ آپ میری طاقت ہیں اور میرا سائبان بھی۔''

''اور میرے بعد؟ خود اپنی طاقت آپ بنو بیٹی۔ تم سے بہتر تمہاری حفاظت کوئی اور نہیں کر سکتا۔ میں بھی نہیں۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ فیقے کا ہاتھ غلط جگہ پڑا۔ کھسیاہٹ اور شرمندگی سے اس کی ہمت کمزور پڑ گئی ہے۔ اس کی ہمت دوبارہ پیدا ہونے سے پہلے پہلے اسے سنبھال لو، قابو میں کر لو۔ تمہارے پاس یہ بڑا اچھا موقع ہے۔ بس تمہیں خود کو بدلنے کی

ضرورت ہے۔"

"جی میں سمجھی نہیں۔"

"تمہاری سمجھ بھی اس فیتے کے ساتھ رہ رہ کر کم ہوگئی ہے۔ ویسے تو یہ گر تمہیں بتانا تمہاری ساس کی ذمہ داری ہے لیکن انہیں آنسو بہانے اور تسبیح کے دانے گرانے سے ہی فرصت نہیں۔ یہ بس اتنی سی مدد کرسکتی ہیں کہ شانے سے لگ کے ہمدردی کے آنسو بہالیں یا ساری رات مصلے پہ بیٹھ کر دعائیں مانگ لیں۔ خیر دعا تم ان سے لے لو اور دوا دارو میں بتلائے دیتا ہوں۔ فرقان اب کوئی لونڈا لپاڑا نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ تم اس پہ توجہ دینا ہی چھوڑ دو۔ ارے عمر تو جیسے جیسے بڑھتی جائے، مرد زیادہ توجہ مانگتا ہے اور ایک تم ہو کہ سارا سارا دن گھر اور گھرداری میں الجھی رہتی ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ گھر کی ذمہ داریاں اپنی جگہ.....لیکن زائد اور دوسروں کے حصے کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر تم ان کا حق مارتی ہو جو تم سے وابستہ ہیں۔ ان میں تمہارا شوہر بھی ہے اور تمہارے بچے بھی۔

تمہارا شوہر اندر کمرے میں اکیلا بیٹھا ہوتا ہے۔ تم بھانجے، بھتیجوں کو نہلا رہی ہوتی ہو۔ وہ دفتر سے تھکا ہارا آتا ہے، تم مشین پہ دھڑا دھڑ بہن کے کپڑے سیئے جارہی ہو۔ ذرا خود کو بدلو، اپنی ذات پہ توجہ دو۔ کام کی زیادتی نے تمہارے چہرے کی رونق تباہ کردی ہے۔ اپنی بہنوں کی طرف ہی دیکھ لو۔ وہ مہ پارہ چار چار بچے پھر کی بنائے رکھتی ہے، انہیں سکول بھیجنے کے بعد مزے سے گھنٹوں سوئی رہتی ہے، دودھ جوس پیتی ہے۔ وہ آدھی ڈاکٹرنی کیسے ٹپ ٹاپ سے رہتی ہے اور چھوٹی بہو، تمہاری طرح اسے بھی کام کا ہوکا ہے لیکن خود سے لاپرواہ نہیں رہتی۔"

ابی کی ساری ہدایتیں مہ لقا بھابی نے بڑے دھیان سے سنیں اور ان پہ عمل کرنے کا مصمم ارادہ بھی کرلیا۔ اس سے پہلے بھی اکثر کوئی نہ کوئی انہیں اس بات کا احساس دلاتا رہتا تھا لیکن وہ ہمیشہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتیں۔ اس بار سنجیدگی سے غور کیا، ٹھوکر ہی ایسی لگی تھی کہ وہ محتاط ہوگئیں۔

☆======☆======☆

"دمی.....دمی بٹر۔"

خواجہ صاحب آوازیں دیتے اندر آئے۔ ڈونالڈ حسب عادت ان کے پیروں کے آگے پیچھے پھدک رہا تھا۔

"جی، دودو!" وہ سنتا ہوا چمچہ لے کر سامنے آیا۔

"یہ نمک پارے اور گلگلے لے جا کر اپنی چچی کو دے آؤ، شام کی چائے کے لئے۔ وہ وہیں کچن میں ہوگی۔ چائے کا وقت ہو چلا۔" گھڑی پہ وقت دیکھتے وہ شفیقہ خاتون کے برابر آبیٹھے۔ ان کی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر ٹھٹکے۔

"مہ جبیں چچی تو کچن میں نہیں، میں لفافے رکھ آیا ہوں۔" وہ اطلاع دے کر بھاگنے لگا۔

"ارے تو جاؤ، ذرا دروازہ کھٹکھٹاؤ، چھ بجنے کو ہیں، کب ملے گی چائے۔"

"میں؟ میں دودو؟" وہ سہم کر اپنے کمرے کے بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ خواجہ صاحب کی سمجھ میں اس کا تردد نہ آیا۔

"وہی!" بند دروازے کے پیچھے سے مہ پارہ کی غضب ناک آواز آئی اور وہ تیر کی طرح اپنے کمرے میں گھس گیا۔

"کس قدر نامعقول بچہ ہے۔ میں نے کہا چچی کو جگاؤ، اپنے کمرے میں بھاگ گیا۔" وہ بڑبڑانے لگے۔ شفیقہ خاتون پیروں میں چپل اڑسنے لگیں۔

"بچہ بے چارہ کیا کرے۔ ماں کا حکم نہیں ہے چچی کے کمرے کی طرف رخ کرنے کا۔ میں خود مہ جبیں کو آواز دیتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "خیر نکلنے والی تو وہ بھی نہیں۔ خود ہی اٹھ لیتی ہوں چائے۔"

"کیا ہوا ہے؟ میں پوچھتا ہوں۔ ہوا کیا ہے؟ یہ حد بندیاں..... یہ کمرہ بندیاں..... یہ سب کیا ہے؟" وہ سخت متوحش تھے۔

"نیا معرکہ.....خواجہ صاحب! تبدیلیاں تو آپ پچھلے ایک ہفتے سے دیکھ ہی رہے ہیں گے۔ یہ کایا پلٹ ہے، کایا پلٹ۔"

"تبدیلیاں؟" وہ سوچ میں پڑ گئے۔ مہ لقا سے گفتگو کے اگلے دن تبدیلی تو نظر آنا شروع ہوگئی تھی لیکن انہوں نے نوٹس نہ لیا۔ ظاہر ہے، اتنے سال یہ گھر ایک عورت کے ہاتھ میں تھا، سارا انتظام، سارا نظام۔ کچھ وقت تو لگے گا باقی سب کو اپنے حصے کی ذمہ داری سنبھالنے میں۔

صبح کا آغاز ہی مہ لقا کو متحرک کردیتا۔ ناشتے کی ذمہ داری ان کی تھی۔ سب کو فرداً فرداً اپنی پسند کا ناشتہ کرانا۔ بچوں کے سکول کے لئے لنچ باکس تیار کرنا، دودھ ابال کر رکھنا، ناشتے کے ڈھیروں برتن خود دھونا کہ برتن دھونے والی ماسی دن میں ایک بار آتی تھی یعنی صبح کے، رات کے برتن ہوتے یا دوپہر کو استعمال ہونے والے بڑے برتن دیگچی، ڈونگے

وغیرہ۔ وہ ناشتہ سے پہلے آتی اور مہ لقا بھابی کی نفاست پسند طبیعت کو گوارہ نہ تھا کہ ناشتے کے برتنوں کا ڈھیر اگلے چوبیس گھنٹوں تک کھیاں بھنکاتا رہے، وہ سہ پہر کو کچن میں آکر دوپہر کے برتنوں میں سے بھی گلاس پلیٹیں وغیرہ دھو جاتیں۔

دوپہر کے کھانے کی ذمہ داری مہ پارہ بھابی کی تھی۔ وہ بس ہانڈی میں چمچہ ہلا کر نام کرلیتیں کیونکہ سبزی وغیرہ کاٹ کرتی کرتا دھو کر بھابی تیار کر چھوڑتی تھیں کہ بچوں کو سکول بھیجنے کے بعد مہ پارہ بھابی اپنی نیند ضرور پوری کرتی تھیں۔ گیارہ بجے بستر چھوڑنے کے بعد چائے ناشتے سے فارغ ہوکر جب وہ ساڑھے بارہ بجے کچن کو رونق بخشتیں تو ان کے پاس صرف آدھ گھنٹہ ہوتا تھا کیونکہ ابی اور امی دونوں ایک سوا ایک بجے کھانا کھا لیتے تھے۔ اگر بڑی بھابی پہلے کچن کا چکر نہ لگا چکی ہوتیں تو انہیں پتا چلتا کہ آدھ گھنٹے میں اتنا ڈھیر کھانا کیسے تیار ہوتا ہے۔

سلاد، چٹنی، فریج میں تیار پڑی ہوتی۔ پیاز کٹی ہوئی، لہسن چھلا ہوا اور ادرک پسی ہوئی پیالیوں میں رکھی ہوتی۔ سبزی بھی بنانے کے بعد دھو کر الگ تسلے میں بھگوئی ہوتی۔ اگر کوفتہ یا کباب بننے ہوں تو قیمے میں پہلے سے مسالے مکس کر دیئے جاتے کبھی کبھار تو گوشت مسالے سمیت کُکر میں چڑھا دیا جاتا۔ آٹا گوندھا رکھا ہوتا۔ یوں بڑی آسانی کے ساتھ وہ آدھ گھنٹے میں اس معرکے کو سر کرلیتیں۔

سہ پہر کی چائے مہ جبیں بھابی کے ذمے تھی۔ وہ تقریباً اس ٹائم گھر آتیں، اس لئے خالی چائے ہی بنانے کا ٹائم مل پاتا، چائے کے ساتھ جو دوسرے لوازمات پیش ہوتے، وہ عموماً مہ لقا بھابی یا مہ ناز کی کارگزاری ہوتی۔ آج کل چونکہ مہ لقا نے شوہر کے آنے کے بعد کچن کے پھیرے لگانا بند کر دیئے تھے اس لئے دو ایک دن مہ ناز ہی مہ جبیں کا ساتھ دیتی رہی لیکن اس کی طبیعت کی گرانی کے سبب پچھلے چند روز سے خواجہ صاحب بازار سے کچھ نہ کچھ لے آتے۔ مہ ناز ایک بار پھر ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔

رات کے کھانے کی ڈیوٹی بھی اسی کی تھی جسے وہ آج بھی پہلے کی طرح بہ حسن وخوبی ادا کرتی تھی۔ رات کے کھانے پہ اہتمام بھی زیادہ ہوتا کیونکہ تمام افراد موجود ہوتے۔ چپاتیاں ڈالنے کی ذمہ داری مہ جبیں کی تھی جسے سردیوں میں تو وہ ادا کرلیتیں لیکن گرمیوں میں اکثر بازار سے نان آتے جسے سب چپ چاپ کھا لیتے۔ ہاں ابی اور امی جان کے لئے وہ تین پھلکے گھر پہ بنا لیتیں۔

اب جب سے مہ لقا بھابی نے اضافی ذمہ داریوں سے ہاتھ کھینچا، سارا نظام درہم برہم

ہوگیا۔ ناشتے کی میز پہ ہی وہ ہڑبونگ مچتی کہ توبہ ہی بھلی۔ بھابی کا تو بس نہ چلتا تھا کہ نوالے بنا بنا کر اپنے سرتاج کے منہ میں ڈالیں۔ اب سرتاج تو خوشی سے پھولے نہیں سمارہے ہوتے اتنی توجہ اور محبت پا کر لیکن باقی سب کے منہ پھولے ہوتے۔ لقمان کو فرائی انڈہ پسند نہ آتا۔

''اُفوہ مہ پارہ! ساری زردی کچی ہے، اٹھاؤ اسے۔ میرا تو جی متلا رہا ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ میں فل فرائی انڈہ کھاتا ہوں۔''

اب مہ پارہ کے فرشتوں کو بھی کیا خبر کہ ان کے میاں فل فرائی کھاتے ہیں یا ہاف فرائی۔ اتنے سالوں سے وہ یہ وقت جمائیاں لے لے کر اخبار پڑھتے گزار رہی تھیں۔ یہ بھی ان کی عنایت کہ وہ جاگ جاتی تھیں اور بچوں اور میاں کی تیاری میں مدد بھی کر دیتی تھیں۔ ناشتے کے وقت تو بس ان کا کام یہ ہوتا کہ اخبار بینی کے ذریعے وقت کچھ آگے کھسکاتیں۔ بچوں کے سکول جانے اور لقمان کے آفس جانے کا انتظار ہوتا تاکہ باقی ماندہ نیند پوری کی جائے۔ مہ جبیں بھی اس وقت اپنی تیاری میں مگن ہوتیں انہیں عمران کے ساتھ ہی نکلنا ہوتا تھا۔ ایسے میں خود پہ توجہ دے یا شوہر کو ناشتہ کرائے۔

''یہ ابلا انڈا اور چائے کا کپ؟ میں یہ کھا کر ہاسپٹل جاؤں گا۔ بھابی نے مجھے پراٹھے اور آملیٹ کی عادت ڈال دی ہے، اب مجھ سے یہ ہلکا ناشتہ کھا کر دن نہیں گزارا جاتا۔''

''کمال ہے۔ ڈاکٹر ہوکر آپ نہیں جانتے کہ آئلی اور ہیوی بریک فاسٹ کتنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ آملیٹ میں تو ویسے بھی انڈے کے ساتھ پروٹین برن ہوجاتے ہیں۔ بوائل ایگ ہی اصل غذا ہے۔'' وہ دلیل دیتیں۔

حالانکہ اصل وجہ یہ تھی کہ بل والے پراٹھے بنانے اور آملیٹ کے لئے پیاز کاٹنے میں اتنا وقت لگتا کہ وہ ڈھنگ سے تیار نہ ہو پاتیں۔ جس وقت مہ ناز بہلو کے لئے انڈہ ابالنے لگتی، یہ چپکے سے کھولتے پانی میں دو انڈے ڈال دیتیں۔ چائے تو تیار مل ہی جاتی تھی۔

ہمیشہ کی طرح بارہ بجے کے بعد کچن کا رخ کرنے والی مہ پارہ چڑتیں جب سارا کچن منہ کھولے ان کا منتظر ہوتا۔ مہ لقا بھابی بھی فرقان بھیا کے جانے کے بعد اپنی بہنوں کا پھیلاوا سمیٹتیں۔ انڈوں کے چھلکے، بریڈ کا چورا، چائے کے نشانات، پیاز کے چھلکے وغیرہ وغیرہ۔ برتنوں کا ڈھیر دھونے کے بعد وہ اپنے کمرے کا رخ کرتیں۔ اب ماہ پارہ کو الف سے یے تک کھانے کی ساری تیاری خود کرنا پڑتی۔

صفائی والی ماسی سے اپنی نگرانی میں کام کروانا مہ ناز کی ڈیوٹی تھی۔ اس لئے وہ بھی مصروف ہوتی پھر بھی مہ پارہ کہہ سنا کر زبردستی اس سے مدد لے ہی لیا کرتیں اور وہ مارے

مروت کے کر بھی دیتی لیکن پھر صفائی اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو پاتی، اس لئے اس نے بھی معذرت کر لی۔

یوں ہفتہ دس دن بعد یہ نوبت آ گئی کہ دوپہر کے کھانے پہ نہ سلاد ہوتا نہ رائتہ۔ اکثر و بیشتر روٹی بازار سے منگوائی جاتی یہ کہہ کر کہ آٹا گوندھنے کا ٹائم نہیں ملا۔ کل رات کے بچے ہوئے سالن اور دال کے ساتھ آملیٹ بنا دیا گیا تھا اور پرسوں ڈھیلی سی کھچڑی بنا کر بغیر کسی چٹنی اور سالن کے سجا دی گئی۔

ساس سسر کے ناک بھوں چڑھانے کی قطعاً پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ دوپہر کو ہلکا پھلکا لنچ لینے کی افادیت گنوانے لگیں۔ انہوں نے بھی نظر انداز کرتے ہوئے بادلِ نخواستہ کھچڑی کے ملغوبے کو حلق سے اتارا۔ خواجہ صاحب یہ رعایت صرف اس لئے دے رہے تھے کہ رفتہ رفتہ سب کی روٹین سیٹ ہو جائے گی۔ سر پہ پڑے تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ قصداً اپنی مچلی بہوؤں کی لاپروائی اور سستی سے سمجھوتہ کرتے رہے۔ چھوٹی بہو کی حد درجہ مروت سے بھی واقف تھے اس لئے اسے سختی سے تنبیہہ کر دی کہ وہ اپنی بڑی آپا کی سیٹ سنبھالنے کی ہرگز کوشش نہ کرے۔

دھان پان سی مہ ناز دوسری بار امید سے تھی اور کمزوری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ سہ پہر کو باہر نکلتے اور شام کی چائے کے لوازمات لے آتے کیونکہ مہ جبیں سے تو اس قسم کی امید رکھنا عبث تھا اور وہ جانتے تھے کہ مہ ناز گھر والوں کی زبان کا چسکا پورا کرنے کے لئے خود کچن میں جا گھسے گی جب کہ رات کے کھانے کی تیاری بدستور اس کے ذمے تھی۔ پچھلی بار اس کی حالت کے پیشِ نظر اس کی بڑی آپا نے یہ ڈیوٹی اپنے سر لے لی تھی لیکن اس بار وہ کسی اور ہی مشن میں سرکھپا رہی تھیں۔

شانوں سے ذرا نیچے آتی باریک سی چٹیا اب اسٹیپ کٹنگ کی صورت میں چہرے کے کئی سال کم کر رہی تھی۔ کبھی کبھار مہندی سر پہ تھوپ لیتی تھیں اب ڈارک براؤن ڈائی بالوں کی چمک ہی اور تھی۔ میک اَپ سے سدا بے نیاز رہنے والے چہرے پہ گلوزی لپ اسٹک، بلیک مسکارا اور بلش آن لگا ہوتا۔ لباس پر بھی توجہ ہوئی۔ پہلے پہل انہیں ذرا سی جھجک محسوس ہوئی۔

"سب کیا سوچیں گے؟"

"سارے باتیں نہ بنانے لگ جائیں۔"

لیکن پھر انہوں نے سر جھٹک کر اس شرم و جھجک کو پرے دھکیلا۔

"کون سارے؟ کون لوگ؟ یہ سب غیر تھوڑے ہی ہیں۔ یہ میری صرف دیورانیاں ہی تو نہیں، میری ماں جائیاں ہیں۔ میرا اتنا احترام کرتی ہیں۔ یہ بھلا کیسے میرا مذاق اُڑا سکتی ہیں۔ سب تو یہی چاہتے ہیں کہ میری گرہستی سلامت رہے اور میری اپنی ترجیح کیا ہونی چاہئے؟ ظاہر ہے میرا شوہر..... نہیں..... بہت عرصہ میں نے دوسروں کو اولیت اور ترجیح دے دے کر اپنا معاملہ خراب کیا ہے۔ اب یہ غلطی نہیں دہرانی۔ مجھے ان سب سے بھی محبت ہے، سب کا خیال ہے لیکن فرقان کے جذبات کا احترام سب سے پہلے۔ ابی ٹھیک ہی تو کہتے ہیں میں نادانی میں ان کا حق مارتی رہی۔ سب کا دل جیتنے کی دُھن میں شوہر کے دل سے اُترتی رہی۔"

انہوں نے اس دل تک جانے والے ہر راستے پہ اپنا جال بچھانا شروع کر دیا اور فرقان کوئی فطرتاً آوارہ، دل پھینک یا عیاش شخص تو تھے نہیں، یونہی ذرا سا نظر انداز ہو جانے کی وجہ سے بھٹکنے لگے تھے، اب بیوی کی بھرپور توجہ ملنے پر جیسے گھر سے باہر کے تمام رستے ہی بھولنے لگے۔ یہ احساس ہی کتنا خوش کن ہوتا ہے کہ کوئی آپ کے لئے، صرف آپ کے لئے خود کو سرتاپا بدل رہا ہے۔ وہ جان گئے تھے کہ مہ لقا میں دن بدن رُونما ہونے والی خوش آئند تبدیلیاں صرف ان کے لئے ہیں ورنہ خود وہ کہاں اپنی ذات کے لئے اتنے جتن کرنے والی ہیں۔

یوں میاں کو راضی کرتے کرتے سب کی چہیتی بڑی بھابی اور بڑی آپا، لاڈلی بہنوں کو ناراض کرتی گئیں۔ یہ ناراضی پچھلے دو چار دنوں سے بڑی واضح صورت اختیار کر گئی تھی۔

اب جو شفیقہ خاتون نے خواجہ خلیق الرحمان کی توجہ نئی تبدیلیوں کی طرف دلائی تو ان کا دھیان اسی تبدیلی کی طرف گیا۔ مہ جبیں کی جبیں پہ شکنیں مستقل ہو گئی تھیں اور مہ پارہ کا پارہ ہر وقت سوا نیزے پر رہنے لگا تھا لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ حالات اتنے خراب ہو سکتے ہیں کہ ایک اپنے بچوں کا داخلہ تک دوسری کے کمرے میں جانا بند کروا دے گی۔

"کایا پلٹ۔" انہوں نے شفیقہ خاتون کی بات دہرائی۔

"واقعی یہ کایا پلٹ ہے لیکن ہوا کیا؟ مجھے پوری بات بتاؤ؟ آخر بات اتنی آگے کیسے بڑھی۔ ان دونوں میں معمولی کھٹ پٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے آخر اوپر تلے کی ہیں اور پھر مزاج بھی الگ الگ لیکن اتنی رنجشیں۔"

"بات صرف ان دونوں تک ہی تو محدود نہیں رہی۔ مہ لقا بھی لپیٹ میں آ گئی۔ نہ چھوٹنوں نے آپس میں کوئی کسر باقی رکھی نہ ہی بڑی کے بڑے پن کا لحاظ کیا۔" ان کے لہجے میں افسوس ہی افسوس تھا۔

''کیا؟ مہ لقا بھی..... ناقابلِ یقین..... آخر تم پوری بات بتاتیں کیوں نہیں۔'' وہ حقیقت جاننے کے لئے بے چین تھے۔

''کام سر پہ پڑنے کی وجہ سے مہ پارہ الجھ تو خاصے دنوں سے رہی تھی۔ آپ نے محسوس کیا ہی ہوگا۔ اس نے تو بچے بس پیدا ہی کئے تھے، پالے تو بڑی اور چھوٹی بہن نے تھے۔ اب مہ ناز تو اپنی حالت سے خود مجبور تھی، اس کا حوصلہ ہے جو کمزوری اور لو بلڈ پریشر کے باوجود اپنے ننھے سے بچے اور گھریلو ذمہ داریاں بہ حسن وخوبی نبھا رہی ہے لیکن ایسے میں دوسرے بچوں کے بھی..... اور مہ لقا کو تو آپ نے خود ہدایت کی تھی پھر بھی ایسی بات نہیں کہ اس نے بالکل ہی ہاتھ کھینچ رکھا ہو۔ آخر نند کی طرح آمنہ اور آئینہ بھی اس کے ہاتھوں پلی ہیں۔

اب بھی روز صبح اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ وہ ان چاروں کے لنچ باکس بھی تیار کرتی ہے لیکن مہ پارہ کو تو وہ دن یاد آتے ہیں کب اس کی بچیوں کی چٹیا تک تائی گوندھتی تھی اور چھوٹی رائمہ کے ڈائپرز تک وہی بدلتی تھی۔ بس جب تک وہ بے دام کی غلام بنی رہی، اچھی تھی۔ بڑا آگے پیچھے پھرتی تھی بڑی آپا، بڑی آپا کہتے ہوئے اب جو بے چاری کی خود پہ بن آئی ہے، ہاتھ پاؤں مار کے اپنی زندگی سنوار رہی ہے تو بری لگنے لگی اور رہی مہ جبیں تو آپ جانتے ہیں، وہ ہمیشہ سے اپنے کام سے کام رکھنے والی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں ایک بری عادت ہے کہ کسی کا ادھار نہیں رکھتی نہ ہی لحاظ مروت ہے اس میں۔ منہ پہ جواب دے مارتی ہے۔ بس اس کی زبان کھلی تو مہ پارہ نے بھی حد کردی۔''

''تم اصل قصہ مت سنانا۔ اپنے تجزیے پیش کرتی رہنا۔'' اب تو خواجہ صاحب کا تجسس اور تفکر دونوں ہی انتہا کو جا پہنچے۔

''دراصل بات آج سے نہیں کل شروع ہوئی تھی۔ مہ جبیں روز کی طرح سرِ شام ہی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی۔ اس کے کمرے کی کھڑکیاں باہر ٹیرس پہ کھلتی ہیں جہاں اس وقت مہ پارہ سے محلے کے بچے پڑھنے آتے ہیں۔ بس ہوا یہ کہ بچوں کے شور سے تنگ آ کر اس نے باہر نکل کر اسے یہ کلاس اپنے کمرے میں لگانے کو کہہ دیا۔

''کمرے میں اتنی جگہ کہاں ہے کہ میں ان سات بچوں کو وہاں بٹھاؤں۔'' اس کے اپنے چاروں بچوں کے علاوہ ایک ندا تھی اور بس محلے کے دو بچے۔

''تو پھر نیچے لاؤنج میں چلے جائیں یا پھر برآمدے میں۔''

''لاؤنج میں تو اس وقت مہران اور جبران کا رخ ہوتا ہے۔ وہ ٹی وی بند کریں گے نہ ہی میوزک اور برآمدے میں ابی بیٹھے ہوں گے۔''

''کہیں بھی لے جائیں انہیں، مگر خدارا کم از کم میرے سر پہ تو سوار نہ کریں۔ سر میں اس قدر شدید درد ہو رہا ہے۔ تھکے ہارے کام سے آؤ اور دو گھڑی کا چین میسر نہیں ہوتا۔''

''اوہو تو وہ تمہارے سر پہ کب بیٹھے ہیں؟ تم جاؤ اپنے کمرے میں اور جی بھر کے آرام کرو۔''

''کیسے آرام کروں۔ پین کلر کھا کر ذرا آنکھ لگی تھی کہ شور سے جاگ گئی۔''

''تو تم بھی تو بے وقت سوتی ہو۔ بچوں پہ بگڑنا ناحق ہے۔ اگر بھری دوپہر یا آدھی رات کو میں یہ کلاس لگاؤں تو تمہارا احتجاج کرنا بھی جائز ہے۔ ظاہر ہے یہ آرام کا وقت ہوتا ہے لیکن اس وقت سوائے تمہارے اور کون سوتا ہے۔ سب اپنے کام تمہاری نیند پہ قربان تو نہیں کر سکتے۔''

''آپ لوگ دو پہروں کو سو سکتے ہیں، میں تو نہیں۔ میڈیکل ریپ کو کس قدر تگڑل خوار ہونا پڑتا ہے اس کا اندازہ بھی ہے آپ کو؟ سیلز گرلز کی طرح سڑکیں ناپنی پڑتی ہیں۔ ابھی اس کلینک میں تو اب اس ہاسپٹل۔ رات کو میں عمران کی وجہ سے جلدی سو نہیں پاتی۔ ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ لے دے کر ایک شام ہی بچتی ہے، اس میں بھی آپ یہ اپنا استانیوں والا شوق لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔''

''مجھ پہ اپنی نوکری کا رعب جمانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ کتنی تحقیر سے تم مجھے استانی کہہ کر بلا رہی ہو۔ خود کون سا سرجن یا فزیشن ہو۔ ابی صحیح تمہیں آدھی ڈاکٹرنی کہہ کر بلاتے ہیں۔''

''میں کیا بات کر رہی ہوں اور آپ کیا ذکر لے بیٹھیں۔ میں نے کوئی طنز کیا ہے نہ ہی کسی قسم کا رعب ڈالا ہے۔ یہ محض آپ کا کامپلیکس ہے۔''

''خدانخواستہ مجھے کیوں کامپلیکس ہونے لگا۔ کامپلیکس کی ماری ہوئی تو تم خود ہو۔ کیا میں نہیں جانتی، تم ان معصوم بچوں سے اتنا کیوں چڑتی ہو۔''

''آپ حد سے بڑھ رہی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں کہ کس قدر تکلیف دہ اندازے لگا رہی ہیں۔'' مہ جبیں، مہ پارہ کی بات کی گہرائی تک جا کے تڑپ اٹھی۔

''ہونہہ، سچی بات کی تکلیف تو ہونی ہی ہے۔'' وہ تو کہہ کر چل پڑی لیکن مہ جبیں سلگتی رہی۔ اس کی شادی کو اتنے سال ہو رہے تھے لیکن اولاد کی کوئی امید پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ بیاہ کر آنے والی مہ ناز ہیلو کے بعد اب ایک اور مہمان کی تیاری کر رہی تھی۔ سب جاننے والے اس سلسلے میں اس سے سوال کرتے رہتے تھے، اپنے اپنے طور پر ہمدردانہ

مشوروں سے بھی نوازتے رہتے لیکن اسے توقع نہ تھی کہ اپنی ہی بہن اس کی بے اولادی کو طعنے کی طرح استعمال کرے گی۔ اس نے ذہن میں اس کا فقرہ دہرایا اور نئے سرے سے سلگ اٹھی۔ وہ تو بہتر ہوا مہ پارہ اپنی بات کہہ کر اندر چلی گئی ورنہ مہ جبیں اتنی بڑی اور نوکیلی بات آسانی سے سہہ جانے والی نہیں تھی۔

آج دوپہر کا واقعہ کل شام کے معرکے کو از سرِ نو زندہ کرنے کا باعث بنا۔ خلافِ معمول مہ جبیں شام سے کچھ پہلے ہی چلی آئی۔ جب کبھی وہ وقت سے پہلے آتی تو دیر سے ہی سہی دوپہر کا کھانا گھر پہ ہی کھاتی۔ آج بھی ساڑھے تین بجے آنے کے بعد اس نے کچن کا رخ کیا۔ فریج میں سے توری کی بھجیا اور قیمہ پیاز کا سالن نکالا۔ ہاٹ پاٹ چیک کیا، روٹی ندارد، سرد آہ بھر کے اس نے آٹا نکالنا چاہا حالانکہ روٹی پکانے کا ذرا موڈ نہ تھا لیکن بھوک زبردست لگی ہوئی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ آج جلدی فارغ ہو جائے گی، اس لئے آفس ٹائم میں جو ہلکا پھلکا لنچ لیتی تھی۔ وہ نہ لیا کہ ایک ہی دفعہ گھر جا کر کھانا کھایا جائے اور اب جب بھوک زوروں پہ تھی، روٹی پکی پکائی نہ ملی۔ ''خیر میں کون سا لنچ گھر پہ کرتی ہوں جو کوئی میرے لئے اہتمام کر کے رکھتا۔'' لیکن اس کا سکون غارت ہو گیا جب تلاش کرنے پہ بھی فریج میں گندھا آٹا نہ ملا اور تب تو کوفت کے مارے اس کا حشر ہو گیا، جب ڈبل روٹی کے پیکٹ میں آدھے سلائس کے سوا کچھ نہ نکلا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا، صبح سوائے اس کے سب نے بن اور میٹھی لسی کا ناشتہ کیا تھا۔ بچوں کے لنچ باکسز میں بھی آپا نے فرنچ فرائز رکھے تھے پھر رات کو لایا گیا بریڈ کا فل سائز پیکٹ ختم کیسے ہو گیا۔ خالی پیٹ غصہ بھی خوب آتا ہے اور شومئی قسمت ایسے میں مہ پارہ کی کچن میں تشریف آوری ہو گئی۔

''یہ تم کیا پوری کی پوری فریج میں گھسی ہوئی ہو؟''

''اور کچھ تو ہے نہیں۔ میں نے سوچا، میں ہی گھس جاؤں۔'' وہ جل کے بولی۔ ''نہ روٹی ہے نہ ہی آٹا، نہ کوئی بریڈ سلائس۔''

''ہاں، وہ آٹا تو آج میں گوندھنا ہی بھول گئی۔ کیا کروں۔ روٹین میں نہیں ہے ناں۔ ہمیشہ آپا ہی گوندھ دیتی تھیں لیکن اب تو انہیں اور بھی مصروفیات ہیں۔ بازار سے روٹی منگوائی تھی۔'' وہ سکون سے رائتہ کے لئے فیڈر بنانے لگی۔

''اور بریڈ؟''

''امی کے دانت میں درد تھا، بریڈ کے ساتھ کھانا کھایا اور رضی بھی تو توری نہیں کھاتا، قیمے میں مرچ زیادہ ہو گئی۔ میں نے ابلے انڈے مکس کئے اور سینڈوچ بنا لئے۔'' اس نے فخریہ

اعلان کیا لیکن مہ جبیں تو کلس کے رہ گئی۔

''ایک آدھ سلائس تو بچا دیتیں۔ گھر میں کچھ نہ کچھ تو موجود ہونا چاہئے۔ خالی فریج بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ایک انڈہ تک موجود نہیں۔ فروٹ کا ایک دانہ نہیں۔ بچے نہ ہوئے جن ہو گئے جو سب چٹ کر گئے۔'' اس نے زور سے فریج بند کیا۔ اونچی آواز سن کر مہ لقا بھی اس طرف آ گئیں۔

''زبان سنبھال کے بات کرو مہ جبیں۔ کیسے منہ پھاڑ کے میرے بچوں کو جن کہہ دیا جیسے تمہارے کچھ لگتے ہی نہیں۔ گھر کے باقی لوگوں کو تو جیسے پیٹ لگا ہوا ہی نہیں۔ بس میرے بچے ہی سب کھا جاتے ہیں۔ فروٹ تو سارا وہ چھوٹی ٹھونس جاتی ہے، بھلے شکل پہ اس کے بارہ ہی کیوں نہ بج رہے ہوں اور رہے انڈے تو ناشتے میں سے جو بچ جاتے ہیں، وہ بڑی آپا اپنے کمرے میں لے جاتی ہیں چہرے پہ تھوپنے کے لئے۔ انہیں نیا نیا خبط سوار ہوا ہے چہرے کی سلوٹیں دور کرنے کا۔ ہونہہ اب اس عمر میں چلی ہیں حسن میں نکھار پیدا.....''

سامنے مہ لقا کو دیکھ کر اس کی زبان لڑکھڑائی پھر ڈھیٹ پن کا مظاہرہ کرتی فیڈر سنبھال پہلو بچاتی نکلنے لگی لیکن مہ لقا نے راستہ روک دیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس مسئلے پہ اتنی زور و شور سے بحث ہو رہی ہے اور کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے کس سلسلے میں گھسیٹا جا رہا ہے؟''

''آپا! میں تو صرف اپنے کھانے کے لئے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ آ گئیں تو ان سے پوچھ بیٹھی، بس اتنی غلطی ہوئی مجھ سے۔ میرے ساتھ ساتھ آپ کو بھی گھسیٹ لیا۔''

''مہ پارہ! تم اس طرح کی باتیں بھی کر سکتی ہو۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ مہ ناز تم سے کتنی چھوٹی ہے۔ تمہیں اس کا اس حالت میں خیال رکھنا چاہئے اور تم اس کا کھانا پینا گن رہی ہو۔ میں نے تمہارے ان دنوں کیسے کیسے لاڈ اٹھائے ہیں، نوالے بنا بنا کے منہ میں ڈالے ہیں اور تم..... اور تو اور میرے بارے میں، اپنی بڑی بہن کے بارے میں ایسی بات تم نے کیسے کہہ دی۔ لہجے میں اتنا تنفر، انداز میں اتنی تحقیر..... میرے لئے.....'' وہ غم سے چُور چُور لہجے میں سوال کر رہی تھیں۔

''میرے ساتھ جو جیسا کرے گا میں ویسا ہی پیش آؤں گی۔ جب تک آپ نے لاڈ اٹھائے، میں نے بھی جی حضوری کی۔ جب تک منہ جبیں سیدھی رہی، میں بھی چپ تھی لیکن وہ منہ بھر کے میرے بچوں کو جن کہہ دے، ان کی خوراک کو ٹو کے تو کیا میں چپ رہوں۔ اپنے آپ کا کھاتے ہیں۔ کسی سے تو نہیں لیتے۔''

''ہونہہ، اپنے باپ کا؟ اس غلط فہمی سے نکل آیئے۔ سب جانتے ہیں وہ اپنے باپ کا کتنا کھاتے ہیں اور دوسروں کے باپ کا کتنا۔'' مہ جبیں نے فوراً حساب برابر کر دیا۔ ''جتنی لقمان بھائی کی آمدنی ہے اگر وہ محض اپنے بل بوتے پہ اولاد پالتے تو آپ کبھی پانچ پانچ بچے پیدا کرنے کی ہمت نہ کرتیں لیکن جب بغیر کچھ کیے ساری سہولتیں مل جائیں تو یونہی اولاد کے ڈھیر لگائے جاتے ہیں۔''

''چپ رہو تم مہ جبیں۔'' مدلقا کو اس کی زبان سے خوف محسوس ہوا۔

''بولنے دیں آپا! اسے بولنے دیں۔ پتا تو چلے کہ آخر اس کے اندر کتنا زہر بھرا ہوا ہے۔ آپ بھی دیکھ لیجئے، کیسے اس کا احساسِ محرومی باہر ابل رہا ہے۔ خود کے تو اولاد نہیں ہے، دوسروں کی بھی چبھ رہی ہے۔''

''آپا! اس نے دوسری بار مجھے یہ طعنہ دیا ہے۔ پوچھئے اس سے یہ میری سگی بہن ہے یا دشمن۔ اس کا دل نہیں کانپتا مجھے بے اولادی کا طعنہ دیتے ہوئے۔''

''اور تو خالہ ہے یاد ائن۔ تیرا کلیجہ نہیں پھٹتا بہن کی اولاد کو کوستے۔ ہم تو یہی سنتے آئے ہیں کہ خالہ ماں جیسی ہوتی ہے۔ اسی لئے تو اسے ماں کہا جاتا ہے لیکن تم نے یہ غلط کر دکھایا۔ ہاں ظاہر ہے جو ماں ہی نہیں وہ ماں سی کیسے ہو سکتی ہے۔ تمہارا دل ممتا سے خالی ہے، اس لئے خدا نے تمہاری گود بھی سُونی رکھی ہے۔''

''مہ پارہ! خدا کا واسطہ ہے، اپنی زبان کو لگام دو۔'' مدلقا نے مہ جبیں کے چہرے کو پہلے سفید پھر سرخ پڑتے دیکھا تو اس کی منتیں کیں۔

''آج مت روکیں اسے آپا! بہت زعم ہے اسے اپنے ماں ہونے پر۔ میری بے اولادی اس کی نظر میں خدا کی طرف سے دی گئی کوئی سزا ہے لیکن یہ نہیں جانتی۔ کبھی کبھی اولاد بھی عذاب اور سزا کی طرح ہی نازل ہوتی ہے۔'' پھنکارتی ہوئی وہ تیر کی طرح کچن سے نکل گئی اور مہ پارہ فیڈر پھینک کر سینہ پیٹنے لگی۔

''ہائے ہائے کو کھ جلی بددعا دے کر گئی ہے مجھے۔ مجھے..... اپنی ماں جائی کو۔''

''تم نے کون سا بہنوں والا حق ادا کیا ہے۔ غصے میں ہی سہی، اس نے سخت ناروا حرکت کی ہے لیکن اگر وہ اپنے ذہن اور زبان سے اختیار کھو بیٹھی ہے تو اسے اس حد تک لانے والی بھی تم ہی ہو۔''

''آپ کیوں میرا ساتھ دینے لگیں۔ آپ کو تو ہمیشہ سے میرا وجود کھٹکتا ہے۔ یہ سب مصیبتیں شروع ہی آپ کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ نہ آپ اچھا بھلا چلتا گھر کا نظام تبدیل کرتیں

نہ ہی کام کے بوجھ اور دباؤ سے میرا دماغ خراب ہوتا۔''

''واہ بہت خوب۔ اتنا عرصہ میں تن تنہا یہ بوجھ اور دباؤ اپنے شانوں پہ لئے رہی۔ میرا ذہنہ دماغ خراب ہوا نہ میں نے کوئی فساد برپا کیا۔''

''آپ کو شوق جو ہے لیڈری کرنے کا۔ آپ تو خوش تھیں باس بن کر لیکن میرے ساتھ یسا نہیں ہے۔ جان کھپانے کے بعد بھی میں باس تو نہیں بن جاؤں گی، وہ تو آپ ہی رہیں گی۔ جب نمبرون پوزیشن پہ آپ نے ہی رہنا ہے تو مجھے محنت کرنے کا کیا فائدہ۔ میں تو باپ کے گھر بھی نمبر دو تھی اور یہاں بھی نمبر دو۔ آپ اپنے سے آگے کسی کو بڑھتا دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ خصوصاً مجھے..... مجھ سے زیادہ اہمیت تو آپ اس چھوٹی کو دیتی ہیں۔ اسے بھی گُر سکھا دیجئے ہیں لوگوں کو مٹھی میں کرنے کے۔''

مہ ناز جو مہ جبیں کو روتا دھوتا سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر یہاں چلی آئی تھی، فوراً پلیٹ میں آ گئی۔ ہکا بکا وہ دونوں بڑی بہنوں کے چہرے دیکھنے لگی۔ ایک کا چہرہ صدمے سے زرد پڑ چکا تھا تو دوسری کا غصے کی تپش سے بھبھوکا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا بڑی آپا..... بجیا! کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ سر جھٹکتے ہوئے واپس مڑنے لگیں۔ ''دماغ خراب ہو گیا ہے اس کا۔''

''ہاں ہاں کوئی بچی باتیں کرے اس کا دماغ خراب اور جو گھنا مینا ہو کر بیٹھ جائے وہ اچھا۔ جیسے یہ اور اس کا میاں۔'' مہ ناز کے ساتھ ساتھ اب اس کے شوہر جبران کو بھی گھسیٹ لیا گیا۔

''کیا جبران نے کچھ کیا ہے؟'' وہ رک کر پوچھنے لگی۔

''کسی نے کچھ نہیں کیا، میں نے کہا ناں، اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے تم کچھ دیر اور یہاں رکو گی تو تمہارے بھی پر نچے اُڑا دے گی۔ چلو نکلو یہاں سے۔ پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

☆======☆======☆

''ناممکن..... یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔ خواجہ ہاؤس میں اتنا سب ہو گیا۔ کیسے.....؟ اتنی لمبی لمبی زبانیں میری بہوؤں کی.....''

خواجہ صاحب بے یقینی کے سے عالم میں بیٹھے افسوس سے سر ہلاتے رہے۔ بیگم سے ساری بات سن کر بھی وہ یہ حقیقت ہضم نہ کر پا رہے تھے۔ جب مہ پارہ کا دیا ہوا بے اولادی کا طعنہ یاد آتا تو جیسے کلیجہ مسلا جاتا۔

''ہائے کیسا برا لگا ہوگا مہ جبیں کو۔ بے چاری کے دل پہ کیا نہ گزرتی ہوگی۔''

اور جب اس کی دی بددعا یاد آتی تو وہی مہ جبیں مظلوم سے ظالم بن جاتی۔

''اتنی پتھر دل کیسے ہوسکتی ہے وہ کہ اپنی ہی بہن کو اولاد کی بددعا دے ڈالی۔''

اتنے میں مہ ناز چائے کی ٹرے لئے چلی آئی۔ ساتھ ہی مہران بھی اندر داخل ہوا۔

خواجہ صاحب سے کچھ پہلے وہ چھوٹی بھابی سے ساری روئیداد جان چکا تھا۔

''وہ نہیں آئیں؟'' خواجہ صاحب نے صرف نظر اٹھا کے دیکھا تھا لیکن شفیقہ خاتون نے سوال کر ڈالا۔

''اونہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''بڑی آپا تو اس وقت سے روئے چلی جارہی ہیں۔ مہ جبیں کے پاس سمجھانے گئی تو الٹا مجھ پہ بگڑ گئی کہ میں اسے غلط سمجھ رہی ہوں اور دوسروں کی حمایت کررہی ہوں حالانکہ میرا تو یہی خیال ہے جتنی غلطی اس کی ہے اتنی ہی بجیا کی بھی لیکن غلطی تو بہرحال دونوں کی ہے۔ دونوں میں سے کوئی دوسرے کو اس بدمزگی کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود کو بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ بجیا نے تو خیر میری شکل تک دیکھنے سے انکار کردیا۔ ان کے خیال میں تو میں بڑی آپا کی چمچی ہوں۔''

''دیکھتا ہوں، کب تک کمرے میں بند رہتی ہیں۔ کہہ دو سب سے رات میرے کمرے میں حاضر ہوں اپنے اپنے شوہروں سمیت۔ سب کے دماغ درست ہونے والے ہیں۔ گھر کو محاذ جنگ سمجھ رکھا ہے۔ اپنے اپنے مورچے سنبھالے بیٹھی ہیں۔ آج رات میں یہ قصہ ختم کرکے رہوں گا۔''

غم کی وقتی کیفیت سے نکلتے ہی خواجہ صاحب نے اپنی ازلی دہشت پھیلاتے ہوئے ہنگامی میٹنگ کا اعلان کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے ذرا گھرکنے کی دیر ہے، سب سیدھے ہوجائیں گے۔ جیسے فرقان کے کس بل درست کئے تھے ویسے ہی مہ پارہ اور مہ جبیں کی طبیعت بھی صاف ہوجائے گی۔ آئندہ ایسی محاذ آرائیاں کرنے کی جرأت نہ کرپائیں گی۔ یہ چیلنج پورے اعتماد کے ساتھ ان کے چہرے پہ روشن تھا جسے پڑھ کر مہران نے چپکے سے دعا کی۔

''اگرچہ میں آپ کے اس اصول کے خلاف ہوں کہ ڈنڈے کے زور پہ سب کو اپنی مرضی پہ چلایا جائے پھر بھی ابی! میری دعا ہے آپ کا یہ بھرم کبھی نہ ٹوٹے۔ اپنی اولاد پہ آپ کا یہ اعتماد یونہی قائم رہے۔''

☆======☆======☆

''میں کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھوں گا نہ ہی وضاحت طلب کروں گا صبح والے واقعے کی۔ میں صرف وارننگ دے رہا ہوں کہ آئندہ اس چھت کے نیچے ایسا کوئی تماشا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔''

باری باری تمام بیٹوں اور بہوؤں کے تنے ہوئے چہروں کی طرف کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے ابی نے سخت ترین انداز میں وارننگ دی۔

''یہ کیا بات ہوئی ابی! گھر میں اتنی بڑی بات ہوگئی اور آپ بجائے قصوروار کو تنبیہہ کرنے کے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے ہیں۔ وضاحت کیوں نہیں طلب کریں گے آپ۔ آپ کو ضرور وضاحت طلب کرنی چاہئے، سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجانا چاہئے۔ پتا چلنا چاہئے کہ تماشا کس نے شروع کیا اور کیوں کیا؟'' عمران بھیا کو ابی کی ڈانٹ ڈپٹ ذرا پسند نہ آئی۔ وہ تو اپنے طور پہ بیوی کی وکالت کرنے آئے تھے اور انہوں نے مقدمہ کی سماعت کے بغیر ہی فیصلہ سنا دیا۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں یہ ابی! اچھا ہوا یہ مطالبہ خود انہوں نے کیا۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ قصوروار کو سزا ملے بجائے اس کے کہ سب ہی کو ایک لائن میں کھڑا کر کے لعنت ملامت کی جائے۔'' لقمان بھیا بھی پورے پورے بیوی کے سکھائے ہوئے لگ رہے تھے۔

''میں سب سن چکا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں۔ کون کتنا قصوروار ہے۔ تم سب کو ایک ہی لائن سے ہانکنے کی وجہ بھی یہ ہے کہ تم میں سے کوئی کسی سے کم نہیں۔ لاتوں کے بھوت ہو تم سب۔ جب تک میرے ہاتھ تمہاری گردنوں تک تھے، سب تیر کی طرح سیدھے تھے۔ اب تمہارے بچوں نے قد نکالنے شروع کئے تو میں نے ڈھیل دے دی لیکن میری نرمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم نے گھر کو میدان جنگ بنا ڈالا۔''

''لاحول ولا..... ابی تو ایسے بات کررہے ہیں جیسے ہم لوگ میٹرک میں برا رزلٹ لانے کے بعد ان کے آگے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔'' عمران بھیا بڑبڑائے۔

''اور کیا؟ بات عورتوں کے درمیان ہوئی ہے اور آپ ہمیں ڈرا دھمکا رہے ہیں۔ ہم نے بھلا کیا کیا ہے؟'' جبران کو بھی یہ ہیڈ ماسٹروں والی زبان پسند نہ آئی۔

''تم لوگوں نے یہ کیا ہے کہ اپنی عورتوں پہ کنٹرول رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ بات مجھ تک پہنچنی ہی نہیں چاہئے تھی، یہ مسئلہ تو تم لوگوں کو خود حل کرنا چاہئے تھا۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں تمہاری بیویوں کے یوں دو بدو لڑنے کی نوبت ہی نہیں آنا چاہئے تھی۔ میرا خیال تھا کہ خون کے رشتے کچھ لحاظ کرلیں گے لیکن یہ تو دیورانی جیٹھانی بنتے ہی بہن کا رشتہ بھول گئیں

اور.....اور تم لوگ.....تمہیں کیا ہوا ہے..... تمہارے رشتے کو بھی کیا دوسرا کوئی نام مل گیا ہے؟''

''ابی! عمران ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ کو سب کا مؤقف سننا چاہئے۔ کیونکہ سب کا خون سفید نہیں ہوا۔'' مہ لقا جو بڑی دیر سے چپ تھیں، دزیدہ نگاہوں سے مہ پارہ اور مہ جبیں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''ہمارے رشتے کو نیا نام آج سے نہیں ملا۔'' اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ''کئی سال ہو گئے ہیں اس نئے رشتے کو بندھے ہوئے۔ کیا آپ کو پہلے کوئی شکایت ہوئی۔ اگر آج آپ کو شکایت ہے تو پہلے ہماری بھی تو سنیئے۔ وہ وجہ تو جان لیجئے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ پھر شاید آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ کون قصوروار ہے کون نہیں۔ کیونکہ کم از کم میں تو یہ الزام اپنے سر نہیں لے سکتی۔ اتنے سالوں تک میں نے کیا نہیں کیا اس گھر کی خوشی کے لئے اور آج.....آج میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے تو.....''

ان کی آواز بھرا گئی تو مہ پارہ کو کہنے کا موقع ملا۔

''ہاں ہاں۔ آپ نے کیا نہیں کیا.....لیکن اس گھر کی خوشی کے لئے نہیں محض اپنی خوشی کے لئے۔ اپنی حاکمانہ فطرت کی تسکین کے لئے۔ جب تک آپ کا دل چاہا آپ نے من مانی کی اور جب اوروں پہ زور چلا چلا کر دل بھر گیا تو اپنے شوہر کی خبر لی۔ آپ نے مجھے دبا دبا کر اتنا مشتعل کر دیا کہ اب مجھ میں برداشت کا مادہ بالکل نہیں رہا۔''

''واہ یہ اچھا جواز پیش کیا آپ نے اپنی زیادتیوں کا۔ برداشت کا مادہ تو آپ میں پیدائشی طور پر مفقود تھا۔'' مہ جبیں نے حملہ کیا۔

''اگر جانتی ہو تو پھر بار بار آزماتی کیوں ہو۔'' تنگ کر جواب دیا گیا۔

''دیکھ لیا ابی! آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے تماشا کس نے شروع کیا۔'' عمران نے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے فیصلہ طلب کیا۔

''عمران! تم جانتے نہیں تمہاری بیوی نے اپنی بہن کو کتنی سخت بددعا دی ہے، تمہارے بھتیجوں کے حوالے سے۔'' لقمان نے غیرت دلانے کی کوشش کی۔

''اور آپ بھی شاید انجان ہیں کہ آپ کی بیگم نے اپنی چھوٹی بہن کو ''کوکھ جلی'' کہہ کر بانجھ ہونے کا طعنہ دیا۔''

''بس!'' ابی کھڑے ہو گئے۔ ''میں نے جھگڑا ختم کرنے بلوایا ہے نہ کہ مزید بڑھانے کو۔ غضب خدا کا، تمہیں اب ماں اور باپ تک کا لحاظ نہیں رہا۔ ختم کرو اس بے ہودہ قصے کو۔''

''ختم کرنے ہی تو آئے ہیں ابی۔'' عمران نے مضبوط لہجے میں کہا۔ اب تک چپ چاپ سب سنتے مہران نے چونک کر بھائی کے چہرے پہ کچھ کھوجا اور جو اسے ملا اس نے اسے عمر بھر تک دہلا دیا۔ وہ دہل گیا تھا ابی کے اعتماد کو دھندلاتا دیکھ کر۔

''پچھلے دو سال سے میں مسلسل کوششیں کر رہا تھا کہ کسی طرح اپنا کلینک سیٹ کر لوں۔ دو وہ جگہ جاب کرنے کے بجائے صبح کا ہاسپٹل پریکٹس کرتا اور شام کو اپنے کلینک۔ بہترین طریقہ تو یہ ہی تھا کہ رہائش گاہ کے ساتھ ہی کلینک کھول لیا جاتا تاکہ آنے جانے میں زیادہ مشکل نہ ہو لیکن ہمارا گھر جس علاقے میں ہے وہاں اتنے بڑے اسکیل پہ کلینک نہیں بنایا جا سکتا۔ میرا ارادہ کلینک کے اوپر رہائش گاہ تعمیر کرنے کا تھا لیکن مہ جبیں نہیں مانی۔ وہ یہ سلسلہ گھیٹر کر گھر میں کسی قسم کی کوئی بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی میں بھی چپ ہو گیا۔ جانتا تھا آپ کتنے ضدی ہیں اس بارے میں لیکن کیا ملا ہم دونوں کو اس چپ کے بدلے میں۔ کھلم کھلا سارے ساتھ زیادتی ہوئی اور آپ کوئی سدِ باب کرنے کے بجائے لاتوں کے بھوت والی تسلی دے کر ٹرار رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک ہماری عزتِ نفس اور خواہشات کی کوئی قدر ہی نہیں۔ آپ کو صرف اپنے خواب مقدم ہیں۔''

''عمران!'' ابی بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگے۔

''لڑو، مرو بس ایک ساتھ رہو، یہ ہے آپ کا فلسفہ۔'' ان کے ذہن میں کچھ عرصہ پہلے عمران کا کہا فقرہ گونجا۔

''تو تم کیا چاہتے ہو؟'' ان کے انداز میں حد درجہ شکستگی تھی۔

''آزادی۔'' وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کے کھڑے ہو گئے اور سب نے ان کی طرف چونک کے دیکھا۔ لقمان اور مہ پارہ سٹپٹا کے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر مہ پارہ ریلیکس سی ہو گئی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں شوہر کو تسلی دی۔

''آزادی.....؟ کیا میں نے تمہیں قید کر رکھا ہے؟ بولو.....'' نہ جانے ابی کا سارا کروفر کہاں چلا گیا تھا۔

''آپ نے ہمیں اپنے خواب میں جکڑ رکھا ہے، کس رکھا ہے۔ جب تک حالات نے مہلت دی، ہم نے مقدور بھر آپ کے جذبات کا احترام کیا لیکن اب حالات اختیار سے باہر ہو رہے ہیں۔ خود اپنی نظروں سے گر کر اپنے ہی بہن بھائیوں کے ہاتھوں ذلیل ہو کر جینا بھی کوئی جینا ہے۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ ویسے تو میں کلینک کے لئے پلاٹ دیکھ ہی رہا تھا لیکن اتنا وقت نہیں ہے کہ تعمیر کے جھنجھٹ میں پڑا جائے۔ میں جلد از جلد کوئی بنگلہ دیکھ کر وہاں

منتقل ہوجاؤں گا۔ کم از کم میرے اور مہ جبیں کے وجود سے کسی کو کوفت ہوتی ہے تو وہ اب دور ہوجائے گی۔'' وہ اپنا فیصلہ سنا کر چلتے بنے، مہ جبیں مزید کسی سوال جواب سے بچنے کی خاطر شوہر کے پیچھے پیچھے ہی ہولی۔ ابی اور امی کی طرح فرقان اور بڑی بھابی کے لئے بھی ان کا یہ فیصلہ حیران کن تھا۔ وہ تو ہکا بکا دونوں کو دیکھتے رہے۔ مہ پارہ بھابی نے لقمان بھیا کو ٹہوکا دیا۔ وہ کھنکھارے۔

''یہ اچھی بات ہے کہ نکلنا خود ہے اور الزام دوسروں کے سر ڈال دیا۔ ہمیں بھلا کیا تکلیف کسی کی ذات سے اور دیدۂ دلیری دیکھو ہم پہ الزام لگایا جارہا ہے عزتِ نفس کچلنے کا۔ اس سے پوچھتا تو تھا کہ میری کم آمدن کا طعنہ کس نے دیا تھا اور میرے بچوں کو دوسروں کی کمائی پہ پلنے کا دعویٰ کس کا تھا۔ میں تو خوش تھا کہ بھائی بھائی کو ڈھانپ رہا ہے۔ مل کر کھا رہے ہیں جیسے چٹنی سے کھائیں چاہے مرغی سے لیکن پتا نہیں تھا کہ اس طرح کا طعنہ سننے کو ملے گا۔ عزتِ نفس اس اکیلے کی نہیں، میری بھی ہے۔ ذلیل ہوکر میں بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ چلا گیا ہے تو کیا ہوا۔ کل کو ان میں سے دوسرا اٹھ کر اپنے پیسے کی دھونس جمائے گا۔ بھئی ہماری اتنی پسلی تو نہیں کہ ان کی طرح بنگلے خریدتے پھریں پھر بھی یہی سوچا ہے کہ اپنی چھت الگ کرلیں۔ عزت سے گزارا ہوگا۔ بچے کسی احسان کے بغیر، کوئی بددعا لئے بنا زندگی گزار لیں گے۔''

اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے ڈرتے ڈرتے ابی کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہیوا ڑے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ امی منہ میں دوپٹہ دبائے سسکیاں لے رہی تھیں۔ مہ پارہ بھابی نے آنکھ کے اشارے کے ذریعے انہیں وہاں سے غائب ہونے کے لئے کہا۔ مبادا وہ کسی اموشنل بلیک میلنگ کا شکار نہ ہوجائیں۔

''بس کرو شفیقہ..... کیا سارے آنسو ابھی بہالوگی۔'' ابی نے ان کے جانے کے بعد سرد آہ بھر کے شریکِ حیات کو ٹوکا۔ جواباً ان کے رونے میں اور شدت آگئی۔

''ابھی بڑے موقع آئیں گے۔ شوق سے روتی رہنا۔ ہاں بھئی صاحبزادے! آپ نے بھی کوئی محل دیکھ لیا ہے یا میں آپ کی مددگروں اور جبران، تم بھی جلد ہی اپنا بندوبست کرلو، شاید آج کل مکان کوڑیوں کے مول بک رہے ہیں، تب ہی ہر کوئی اپنا اپنا لینے بھاگ رہا ہے۔ جاؤ میاں! تم کیوں پیچھے رہو..... اور مہران..... تم..... خیر تمہیں کیا کہوں..... تمہیں تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ تمہارے اپنے نظریات بھی تو یہی ہیں۔ تم تو کھلا کھلا میرے خواب کا مذاق اُڑا چکے ہو۔ اس وقت مجھے غصہ آیا تھا..... شدید غصہ..... لیکن اب سوچتا

ہوں۔ تم ٹھیک کہتے تھے۔ شاید میں ہی غلط تھا..... شاید میری خواہش ہی ناجائز تھی۔'' ہمیشہ گرجنے برسنے والے خواجہ خلیق الرحمان کا لہجہ نہایت مدھم اور الفاظ بکھرے ہوئے تھے۔ مہران تڑپ اٹھا۔ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔

''میں نے کبھی آپ کے خوابوں کا مذاق نہیں اُڑایا ابی۔ اس وقت اگر میں نے کچھ الٹا سیدھا کہا بھی تھا تو وقتی جھنجلاہٹ کے زیرِ اثر تھا۔ میں صرف آپ کی شدت پسندی کے خلاف تھا۔''

''میں اب بھی سمجھ نہیں پارہا یہ سب ہوا کیسے؟ اگر واقعی میرا اقدام غلط تھا تو اس کے نتائج اتنی دیر سے کیوں ظاہر ہوئے۔ آخر اتنا عرصہ یہ گھر میری خواہش ہی تو چلتا رہا ہے۔''

''وہ اس لئے کہ تب تک آپ کی خواہش ان کی خواہش سے ٹکراتی نہیں تھی۔ سب اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔ جس کو ساتھ رہنا ہو وہ بغیر کسی غرض کے، بغیر کسی مفاد کے بھی رہ لیتا ہے، اگر کسی کا ساتھ منظور ہو تو اس کی سو زیادتیاں بھی سہہ لی جاتی ہیں لیکن جن کے دلوں میں گنجائش نہ ہو انہیں ہزار کوششوں کے بعد بھی اکٹھا نہیں رکھا جاسکتا۔ عمران بھیا کی ترقی کی راہ میں یہ گھر اور اس کا فرسودہ ماحول رکاوٹ تھا یہ جھگڑا اس رکاوٹ کو دور کرنے کا جواز بنا اور لقمان بھیا جو عزت اور خودداری کا راگ الاپتے گئے ہیں، درحقیقت پارٹنر شپ سے بیکٹر ونکس کا کاروبار شروع کرنے والے ہیں۔ وہ اور ان کی بیگم شروع سے ہی مل بیٹھ کے رہنے کے حامی نہیں۔ وہ تو مالی حالات اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لئے چپ چاپ اتنے سال گزار دیئے۔ اب جو معاشی حالت سدھرنے کے امکان پیدا ہوئے تو جھٹ اپنا ٹھکانا الگ کرنے کی سوچی۔''

''اپنا کاروبار شروع کرنے والا ہے؟ کمال ہے اتنی بڑی بات اور میں بے خبر ا..... اسی لئے تو کہہ رہا ہوں تم لوگ بھی اب اچانک کوئی دھچکا دینے کے بجائے ابھی فیصلہ لو، کب اور کس دن رخصت ہونا ہے۔'' انہوں نے دل پتھر کرلیا۔

''ابی..... آپ..... آپ ہمیں نکال رہے ہیں گھر سے؟'' مہ ناز قریب چلی آئی۔ اس کی پلکوں پہ ستارے جگنے لگے تھے۔ وہ اپنی سب سے چہیتی بہو کے آنسو نہ دیکھ پائے، منہ پھیر کے ٹہلنے لگے۔

''میں کون ہوتا ہوں کسی کو نکالنے والا۔ وہ سب بھی تو خود اپنا فیصلہ سنا گئے۔ تمہیں تو میں وقت دے رہا ہوں۔ ہاں اگر اس گھر میں رہنا زیادہ پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ میں ہی کہیں اپنا

بندوست کرلوں گا۔"

"ابی..... ابی پلیز۔" وہ سسکنے لگی۔ "ہمیں خود سے الگ مت کیجئے۔ ان کی سرکشی کی سزا ہمیں مت دیں۔ وہ جانا چاہتے تھے، چلے گئے، کم از کم میں اس گھر کو، آپ کو اور امی کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"اور میں بھی نہیں۔" مہ لقا بھی اٹھ کے قریب چلی آئیں۔ "اگر مہ ناز کو میری حاکیت پہ اعتراض نہ ہوتو۔"

"کیسی باتیں کررہی ہیں آپ بڑی آپا۔ آپ میری ماں کی جگہ ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو عزت دی ہے۔ مان دیا ہے اور ان شاء اللہ دیتی رہوں گی۔" دونوں بہنیں خواجہ صاحب کے گھٹنوں پہ ہاتھ دھرے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ فرقان بھیا اور جبران ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

"یہ سب تمہاری جذباتیت ہے۔ خیر میں زبردستی کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ پہلے ہی مجھ پہ زیادتیاں کرنے کا الزام ہے۔ تمہاری مرضی..... دیکھتا ہوں یہ بھائی چارہ اور کتنے دن قائم رہتا ہے۔ مجھے تو اب کسی سے کوئی امید نہیں۔"

"امید ہمیشہ زندہ رکھنی چاہئے ابی۔" مہران نے تسلی دینا چاہی۔

"تم تو خیر مجھ سے کلام ہی نہ کرو۔ یہ تو سگی بہنیں تھیں۔ تمہاری بیوی جو کچھ کرنے والی ہے، وہ میں ابھی سے دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ ڈولی سے نیچے اس گھر کی دہلیز پہ پاؤں بھی دھرے گی اس لئے یہ لمبے چوڑے دعوے رہنے دو۔" کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے اسے مزید دلاسے دینے سے باز رکھا۔

"یہ دعوے نہیں ابی، میرا عزم ہے کہ آپ کے چہرے پہ اعتماد کی وہی جگمگاہٹ لا کے رہوں گا۔" اس نے دل ہی دل میں ارادہ کیا۔ اگر وہ معطر کی فطرت سے اس طرح آگاہ نہ ہوچکا ہوتا تو یہ دعویٰ کرنے سے واقعی باز رہتا کیونکہ کسی کی بھی مرضی اور فطرت کے بغیر اس کا تعاون حاصل کرنا اس کے نزدیک جبر تھا اور وہ جبر کے ذریعے بیوی سے قربانیاں مانگ کر پھر سے وہ کہانی دہرانا نہیں چاہتا تھا لیکن..... معطر..... اس کے اعتبار کے سہارے ہی تو اس نے اتنا بڑا ارادہ کیا تھا۔

☆======☆======☆

اور یہ چھ مہینے کی بات ہے۔

صرف چھ مہینے۔

کہنے کو تو صرف چھ مہینے ہیں لیکن کیا کچھ نہیں بدل چکا۔

خواجہ ہاؤس کے بہت سے پرانے مکین یہاں سے جاچکے ہیں۔ کچھ نئے مکینوں کا اضافہ بھی ہوچکا ہے۔ تین ماہ قبل معطر ہمایوں، معطر خواجہ بن کر اس کے آنگن میں اتری تو ڈیڑھ ماہ پہلے ٹوئیٹی مہ ناز کی گود میں آئی۔

عیدالفطر کی یہ صبح ہنگامہ خیز تھی۔ امی جان الماری سے بیڈ کور نکال رہی تھیں۔ بڑی بھابی ڈرائنگ روم میں گھسی دھلے ہوئے پردے ٹانگ رہی تھیں۔ یہاں کی تفصیلی صفائی وہ کل ہی کرچکی تھیں جس کا اندازہ چم چم کرتی چیزوں کو دیکھ کے ہی ہورہا تھا۔ ندا اور آمنہ اپنے اپنے ہاتھوں پہ لگی مہندی کے رنگ کا مقابلہ کررہی تھیں جو کل رات ہی چھوٹی چچی نے بڑی محنت سے ننھی منی ہتھیلیوں پہ لگائی تھی۔ انہیں مہ لقا بھابی کی طرف سے بار بار جلد تیار ہونے کی ہدایت مل رہی تھی۔ مہ ناز بھابی جو ہمیشہ ہی اس موقع پہ سب سے متحرک ہوا کرتی تھی، اب ریں ریں کرتے ہلو اور چیں چیں کرتی ٹوئیٹی میں الجھی ہوئی تھیں۔ تین سالہ ہلو ننھی بہن کو ماں پہ قبضہ جمائے دیکھ کر احتجاجاً بلک اٹھتا تھا۔ معطر کچن میں شیر خرما سے سجے بلوریں پیالوں پہ بادام اور پستہ کی ہوائیاں چھڑک رہی تھی جب شفیقہ خاتون اندر داخل ہوئیں۔

"بیٹی! تمہاری پہلی عید ہے۔ سسرال میں اور تم کچن کی ہوکر بیٹھ گئی ہو۔ چلو شاباش جلدی سے نہا دھو کر تیار ہوجاؤ۔ تمہارے ابی نماز پڑھ کے آنے والے ہی ہوں گے، اس طرح دیکھ کے خفا ہوں گے۔ چلو چھوڑو سارے کام..... خیر سے تمہاری بھابیاں ہیں ناں۔" وہ پہلے بھی ایک بار اسے تیار ہونے کا کہہ کر گئی تھیں۔ اب اسے وہیں براجمان دیکھا تو ذرا سختی سے ڈپٹ کر بولیں۔

"بس امی! یہ رہ گیا ہے۔ مہ ناز بھابی نے ہی بنایا ہے شیر خرما، بچے سور ہے تھے تو انہیں بھی موقع مل گیا، صبح سویرے ہی شروع ہوگئیں، اب دودھ پلانے گئی ہیں تو میں نے سوچا، کم از کم ٹھنڈا کر کے پیالوں میں ہی نکال لوں، نماز پڑھ کے آنے والے ہوں گے سب۔" اس نے حسب عادت دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کیا۔

"اُف تو یہ بچیاں بھی بس..... کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں کہ تیار ہوجاؤ تیار ہوجاؤ۔ کان پہ جوں ہی نہیں رینگتی۔ اب زبردستی باتھ روم میں دھکیل کے آئی ہوں۔ سوچا ان کے نہانے تک کچن کی خبر لوں۔" مہ لقا بھابی بھی اندر آگئیں۔ "آپ بیٹھیں امی، ناشتہ بناتی ہوں آپ کا، باقی کام تو بچیوں کو تیار کرنے کے بعد ہی ہوگا۔"

"میں تو اپنے کمرے میں جارہی ہوں بھابی! وہ دونوں نہالیں تو وہیں بھیج دیجئے گا۔

میں تیار کردوں گی۔ آپ دوپہر کے کھانے کا کام یمین، بھیا لوگ آگئے تو اچھا نہیں لگے گا کہ گھر والے کچن میں گھسے بیٹھے ہیں۔"

"ہاں ہاں، بس میں پلاؤ کے لئے گوشت کی یخنی رکھنے ہی والی ہوں۔ کباب تو رات کو بنا لئے تھے۔ وقت کے وقت تل لوں گی، مزائقل بھی مہ ناز نے تیار کردی تھی۔ ہاں وہ تم کیا بنا رہی تھیں رات کو مرغی کو سرکہ وغیرہ لگا کے.....اس کا کیا کرنا ہے۔"

"رات بھر کے لئے میری نیٹ ہونے رکھ دی تھی۔ اب کوئی کام ہی نہیں۔ بس کھانے سے آدھ گھنٹہ پہلے اوون میں روسٹ کردوں گی۔"

"عید مبارک.....عید مبارک۔"

باہر سے آتی آوازوں پہ معطر سرپٹ بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ نہانے کے بعد گیلے بال یونہی کلپ سے اکٹھے کر کے وہ کچن میں چلی گئی تھی۔ عید کا لباس سامنے ہی بیڈ پہ پھیلا تھا وہ اٹھا کے ڈریسنگ روم گھس گئی۔ جلدی جلدی لائٹ سا میک اَپ کیا، مہندی سے سجے ہاتھوں میں گہری سبز مقیش سے سجی کانچ کی چوڑیاں پہنیں۔ دوسری کلائی میں پہلے ہی دو منقش کنگن کسی حسین لمحے کی یادگار بنے کھنک رہے تھے۔ مہران کی طرف سے منہ دکھائی میں ملنے والا یہ تحفہ وہ کسی بھی وقت خود سے جدا نہیں کرتی تھی۔ گرین جارجٹ کے سوٹ پہ میچ کلر کے کنٹراسٹ کے ساتھ فل ایمبرائڈری کا بڑا سا دوپٹہ لئے وہ لاؤنج میں آئی۔ ابی کو سلام کر کے ڈھیروں دعائیں اور پیار سمیٹا، فرقان بھیا اور جہان بھیا کو بھی عید کا سلام کیا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مہران کہیں نہیں تھا۔

"مہ لقا، آؤ بیٹی، مہ ناز کو بھی بلاؤ.....اپنی اپنی عیدی لے لو۔" خواجہ صاحب نے سب بہوؤں کو پکارتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"خواجہ جی! ذرا رک جاتے.....میرا مطلب ہے دوسری بھی آنے والی ہوں گی۔ ساری بہوؤں اور پوتے پوتیوں کو اکٹھے ہی عیدی دے دیتے۔" شفیقہ خاتون نے ہچکچاتے ہوئے انہیں ٹوکا۔ جواباً خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ شاید موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے خاموش رہ گئے۔

"واہ بڑی لمبی عمر ہے بھیا آپ کی۔ ابھی یاد ہی کر رہے تھے ہم لوگ۔" جہران دروازے سے ہی نعرے مارتا پورچ کی طرف لپکا۔ لقمان اور عمران کی گاڑیاں آگے پیچھے ہی اندر داخل ہوئیں۔

"آئینہ! میں نے کہا تھا ناں کہ تم بھی میرے ساتھ یہاں رک جاؤ۔ اتنا مزہ آیا چاند

ملت کو۔ اپنی مہندی دیکھو ذرا کیسے تھوپی ہوئی ہے اور یہ دیکھو نئی چچی نے کیسا پیارا ڈیزائن بنایا ہے۔" آمنہ بہن کو چڑانے لگی۔ کچھ دن پہلے مہ لقا بھابی امی جان کے ساتھ بچیوں کو عید دینے گئیں تو وہ تائی کے ساتھ یہ یہاں رہنے چلی آئی۔

"جاؤ نادر! چچا کو بلا کر لاؤ۔ سب اکٹھے ہی ناشتہ کریں گے۔ لو بھلا بتاؤ ذرا پہلے فون کر کے بتا دیتے تم لوگ بغیر ناشتے کے نکل رہے ہو میں اہتمام ہی کر چھوڑتی۔" شفیقہ خاتون کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ "انہوں نے تو دوپہر کے کھانے کا کہا تھا مہ لقا کو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ امی۔ ہم کوئی مہمان ہیں؟" مہ پارہ کی شہد میں ڈوبی آواز پہ خواجہ صاحب نے چونک کر معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کہتی رہی۔

"بچے رات سے ہی اتنے ایکسائٹڈ تھے، صبح ہوتے ہی جانے کا شور مچا دیا اس لئے ناشتہ رہنے دیا۔"

"اور ہمارا تو دل ہی نہیں چاہا عید والے دن بھی اکیلے بیٹھ کے کچھ کھانے کو، اس لئے عمران نماز پڑھ کے آئے تو میں نے ساتھ ہی نکلنے کا کہہ دیا۔ آپ کیوں بڑی آپا کی پریڈ کروا رہی ہیں۔ مل جل کے کچھ ہلکا پھلکا ناشتہ کر لیتے ہیں۔" مہ جبیں نے مہ لقا کے پیچھے کچن جاتے ہوئے کہا۔

"جاؤ نادر! کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو، کہا ہے ناں چچا کو بلا کر لاؤ۔ بھائی سے کہو حلوہ پوریاں اور تمہاری لے کر آئے۔ میرے بچے آئے ہیں۔" خواجہ خلیق الرحمان کی خوشی سے سرشار آواز نے مہران کے کمرے تک سفر کیا۔ وہ طمانیت سے مسکرا دیا۔

"میں جاتی ہوں ابی۔" معطر ویسے ہی جانے کو بے چین تھی۔ موقع ملتے ہی کمرے میں چلی آئی۔

"یہ آپ اندھیرا کئے کیوں بیٹھے ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر دبیز پردے ہٹانے چاہے تاکہ روشنی ہو لیکن عقب سے اس نے جھٹکے کے ساتھ اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

"بتیاں بجھائی رکھ دی.....میں بتیاں بجھائی رکھ دی۔"

وہ شرارت سے ہولے ہولے گنگنایا اور وہ جھینپ گئی۔

"آپ یہ بات کبھی نہیں بھولیں گے.....ہے ناں۔"

"اج میری اک من لے تُو.....

اج میری اک من لے تُو....."

اس کی آواز میں شرارت اور زیادہ رچنے لگی تو معطر نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

''اچھا طریقہ ہے عید مبارک کہنے کا۔''

''ارے تمہیں سامنے پاکے تو میں سارے طریقے سلیقے بھول جاتا ہوں میرے میاں مٹھو۔ میں تو آج تک ڈھنگ سے تمہارا شکریہ تک ادا نہیں کر پایا۔

تم نے مجھے ابی کے سامنے سر اٹھا کر جینے کے قابل کر دیا۔ میں سوچتا تھا کتنا مشکل ہے اُن کا کھویا ہوا اعتبار لوٹانا لیکن تم نے کتنی آسانی سے یہ مرحلہ سر کر لیا اور ابی بھی جان گئے، جنہیں ساتھ رہنا ہو، ان کے لئے باز و وا رکھو اور جو جانا چاہے ان کے لئے دروازہ کھول دو۔ زبردستی کا ساتھ صرف بے زاری اور نفرت کو جنم دیتا ہے۔ دیکھ لو وہی بھابیاں جو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں پا رہی تھیں، آج ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اٹھی آئی ہیں۔ یہ تو دلوں کے سودے ہیں۔ اس میں زبردستی کیسی۔ ہوسکتا ہے ابی کی طرح انہوں نے بھی کوئی خواب دیکھ رکھا ہو اپنے گھر کے لئے..... ابی یہ بات سمجھ گئے ہیں بلکہ وقت انہیں سمجھا گیا ہے، اسی لئے انہوں نے کھلے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے۔ اب اچانک کچھ اور کھو دینے کا خوف ان کی آنکھوں سے دور جا چکا ہے۔ انہوں نے برسوں پرانے خوابوں کو تھپکنا چھوڑ دیا ہے۔''

''اونہوں..... چھوڑ دیا نہیں..... ملتا ہیں اب ہمارے ہاتھ میں تھما دی ہیں۔'' معطر نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

☆======☆======☆

شاید

محبت کو پا کر کھو دینا اتنا بڑا سانحہ نہیں ہوتا، اس کرب سے تو انسان گزر ہی جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اذیت ناک مرحلہ تب ہوتا ہے جب انسان پر اپنی محبت کو پا لینے کے بعد یہ انکشاف ہوتا ہے کہ جسے چاہا تھا وہ کسی اور کی طلب میں دیوانہ ہے.....

اس لڑکی کا قصہ جس نے ایک ''شاید'' کے خوف سے اپنی زندگی میں اندھیرے بھر لیے تھے مگر دوسروں کے ہاتھ میں ''شاید'' کا جگنو تھما کر ان کا راستہ روشن کر رہی تھی۔

وہ میری محبت کا پہلا چہرہ ہے۔ نہیں وہ میری محبت کا ہر چہرہ ہے۔ یا شاید وہ تو میری محبت کا وجود ہے۔

میں نے اس سے محبت تب کی تھی، جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔

یا نہیں، نہیں، میں تو اس سے بھی بہت پہلے سے اس سے محبت کرتا آیا ہوں۔

میں نے اسے ہر طرح سے چاہا ہے۔ میں نے اس سے ہر طرح کی..... ہر قسم کی محبت کی ہے۔

کیا محبت کی بھی قسمیں ہوا کرتی ہیں؟

شاید نہیں یا شاید ہاں۔

کہیں محبت عقیدت میں رنگی ہوتی ہے۔ کہیں جوگ کی بکل مارے ہوتی ہے۔ کہیں عبادت کے وضو سے پاک ہوئی ہوتی ہے تو کہیں پاکیزگی کے نور سے دمک رہی ہوتی ہے۔

اور کہیں محبت، غرض کے کالے بادلوں کے سائے میں دھندلائی ہوئی سی ہوتی ہے..... کہیں ہوس کی بدبو سے گھبرائی ہوئی ہوتی ہے۔ کہیں طلب کی تپش سے بھڑکی ہوئی تو کہیں خوابوں کی کرچیوں سے اندھی ہوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے چلاتی ہوئی۔

میں نے اس سے ہر طرح اور ہر قسم کی محبت کی ہے کیونکہ میں تو بس اس سے اور صرف اس سے محبت کرتے رہنا چاہتا تھا۔ اس سے ہانیہ پیرزادہ سے۔

☆======☆======☆

وہ میری فرسٹ کزن تھی۔ میری سگی تایا زاد مگر میں اپنی عمر کے آٹھویں برس اس سے متعارف ہوا۔ شاید بلکہ یقیناً اس سے پہلے بھی ایک آدھ بار اس سے ملا ہوں گا۔ مگر سرسری کیونکہ وہ اپنی ماما اور دادی جو کہ میری بھی دادی تھیں کے ساتھ ایبٹ آباد میں رہا کرتی تھی۔

دادی، پاپا کے بے حد اصرار پہ سال میں ایک آدھ بار چند روز کے لئے ضرور آیا کرتیں مگر..... اکیلی۔ ہم لوگ کبھی کبھی وہاں نہیں گئے۔ پاپا اپنے بزنس میں معروف اور ماما کے الگ معمولات۔ میں چھٹیوں میں اکثر نانا کے گھر کراچی ضرور جایا کرتا تھا۔ مگر دادی کے ہر بار بلانے پہ بھی ایبٹ آباد کبھی نہیں گیا۔ ضدی تو میں شروع سے تھا میری مرضی کے خلاف کوئی مجھے کسی بات کے لئے مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا لاہور جیسے ہنگاموں والے شہر سے اُٹھ کے میں ایبٹ آباد کیوں جاتا جہاں کی بوریت کے قصے میں ماما سے سن چکا تھا۔ دادی سے میری انسیت بس یونہی سی تھی۔ یوں بھی وہ کوئی قصے کہانیاں سنانے والی، لوری گا کے سلانے والی یا حلوے بنا کے کھلانے والی دادی تو تھیں نہیں، وہ تو ہر وقت دوائیں پھانکنے والی، چھڑی کا سہارا لے کر چلنے والی اور نمازیں وظیفے پڑھنے والی دادی تھیں۔ ان کا لاڈ بس یہی ہوتا کہ جہاں مجھے دیکھتیں، ہاتھ کے اشارے سے پاس بلا کر ذرا کی ذرا اپنی تلاوت یا تسبیح روک کر میرے چہرے پر پھونک مار دیتیں۔ ان کے لب ہمہ وقت حرکت میں رہتے چاہے تسبیح ہاتھ میں ہو یا نہیں ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ ان کے لبوں کو ہلنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ضرور سوتے میں بھی وہ ہلتے رہتے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا وہ اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت کسی نہ کسی ورد میں معروف رہتیں۔ اگر ان سے کچھ پوچھا جاتا تو آنکھیں موند کے اسی تواتر کے ساتھ وہ پہلے اپنا ورد مکمل کرتیں پھر جواب دیتیں اتنے میں چاہے سوال کرنے والا بور ہو کے واپس پلٹ جائے۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ آنٹی راحیلہ نے ان دادی جان کو کیا سوچ کر اپنی حفاظت کے لئے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ جب بھی وہ چند دن یہاں گزارنے آتیں، آنٹی کے فون پہ فون آتے.....

''اماں! جلدی لوٹ آیئے، بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے، اکیلے میں ڈر لگ رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔''

دراصل بڑے پاپا یعنی میرے تایا شادی کے دو سال بعد ہی وفات پا گئے۔ وہ شادی کے کچھ روز بعد لاہور سے ایبٹ آباد منتقل ہو گئے تھے۔ وہ فیملی بزنس سے ہٹ کر کچھ کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایبٹ آباد میں ایک بڑا عالیشان قسم کا ہوٹل قائم کیا، فائیو اسٹار کی طرز کا..... ان کا خیال تھا کہ اس ہوٹل کی تعمیر سے ایبٹ آباد بھی مری جیسی اہمیت اختیار کر لے گا اور ان کا ہوٹل باذوق سیاحوں کی پہلی پسند ٹھہرے گا لیکن وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے۔ ہوٹل تو ان کے خوابوں کے عین مطابق بنا مگر وہ اس کا نام اور اونچا ہوتا دیکھنے سے پہلے ہی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے۔ آنٹی راحیلہ نے اسی گھر میں زندگی کے باقی دن گزارنے کا فیصلہ کیا جہاں شوہر کی زندگی کے آخری دن گزرے تھے۔ پاپا نے ہوٹل کی

مینجمنٹ کی ذمہ داری اُٹھانے سے معذرت کر لی۔ لاہور میں ان کا اپنا اتنا پھیلا ہوا بزنس تھا۔ یوں بڑے پاپا کا وہ خواب تعبیر کی صورت لینے کے بعد بھی بکھر گیا۔ ہوٹل بک گیا، آنٹی کے لئے یہ رقم زندگی گزارنے کے لئے کافی تھی۔ گھر بھی تھا، دادی ان کی تنہائی اور بیوگی کا خیال کر کے ان کے پاس رہنے لگیں۔ پاپا کے اطمینان کو اتنا کافی تھا۔ اسی لئے ہمارا وہاں جانا نہ ہونے کے برابر تھا اور ہانیہ پیرزادہ کو جاننا بھی شاید نہ جاننے کے برابر تھا۔

اسے میں نے تب جانا، جب اسے پہلی بار دیکھا..... ہاں میں دیکھتے ہی اسے جاننے لگا تھا۔ شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے کہ ایک آٹھ سال کا بچہ اور کسی کو پہلی نظر میں ہی جاننے کا دعویٰ..... میں آٹھ سال کا ضرور تھا مگر بچہ نہیں تھا۔ میرے احساسات، میری سوچیں اور میرے جذبات شروع سے ہی بہت میچور رہے ہیں اور وہ ہانیہ پیرزادہ..... شاید وہ بھی میرے ہی جیسی تھی۔ اپنی عمر سے بہت آگے سوچنے والی اور اپنی عمر سے بہت بڑی شخصیت رکھنے والی۔ اسے دیکھ کے یہ بالکل نہ لگ رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے سانحے سے گزر کر آئی ہے۔

میں سکول سے واپس آیا تو یہ جاننا تھا کہ آج ماما اور پاپا ایبٹ آباد سے واپس آنے والے ہیں اور ان کے ساتھ ہی دادی اور ہانی بھی۔ آنٹی راحیلہ کی تدفین اور قل کے بعد وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لا رہے تھے۔ آنٹی راحیلہ پہلے ہی ہارٹ اٹیک میں جانبر نہ ہو سکیں۔

تیز دھوپ میں کار پورچ سے گزر کر جب میں وسیع لاؤنج میں داخل ہوا تو مجھے سب کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا..... پُرسکون سا محسوس ہوا۔ میں نے سامنے رکھے آف وائٹ صوفے پہ دادی کے کندھے پہ سر رکھے بیٹھی اس لڑکی کو دیکھا جس نے بلیک ڈریس پہن رکھا تھا۔ لاؤنج میں جلتی تین ٹیوب لائٹیں، پارہ قمقموں والا فانوس اور دو آرائشی لیمپ ٹمٹماتے دیے کی صورت ہو گئے، سیاہی ہر سُو پھیل گئی۔

''اِدھر آؤ سعد۔'' دادی نے مجھے گم صم کھڑے دیکھ کر دوسرا بازو وا کیا اور مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ یوں ہی اُن سے چپکی رہی۔ نظر اُٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ ویسے تو میں دادی سے دور دور ہی مل لیتا بہتر جانتا تھا لیکن اُس روز پتہ نہیں کیسے..... بیگ ایک طرف رکھ کے، مقناطیسی انداز میں ان کی طرف بڑھتا چلا گیا، انہوں نے بازو میں بھر کے مجھے اپنے دوسرے شانے سے لگا لیا۔ پاپا اور ماما بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں نے دادی سے لپٹے لپٹے پھر سے اسے دیکھا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور میرے چہرے سے کئی انچ کے فاصلے پہ تھا، اس کے باوجود مجھے اس کے آنسو اپنے گال بھگوتے محسوس ہوئے۔

میری آنکھیں جلنے لگیں۔ اس کی سسکیاں سن کر میرے گلے میں پھندے سے اٹکنے

لگے، مجھے تھوک نگلنا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ اچانک اس نے بھیگی پلکیں اُٹھا کے میری طرف دیکھا۔ کئی روز سے رو رو کے متورم ہوئی آنکھوں میں لال ڈورے تھے۔ میں نے اتنی اداسی اور کہیں نہیں دیکھی..... اب تک نہیں دیکھی جتنی اس وقت، اُس روز ان آنکھوں میں دیکھی تھی۔ میرے گلے میں لگا پھندا اچانک کھل گیا۔ میری ہچکی بندھ گئی..... میں رونے لگا..... پتہ نہیں کیوں..... شاید میں ان آنکھوں کی ویرانی سے خوفزدہ ہو گیا تھا..... شاید ماحول کی افسردگی مجھ پہ اثر انداز ہو گئی تھی۔

دادی نے میری کمر سہلائی، ہانیہ مجھے روتا دیکھ کے سیدھی ہوئی۔ اس نے اپنی نرم انگلیوں سے بہتے گال پہ آنسو صاف کئے، میرے بال پیار سے سہلائے..... مجھے اور رونا آ گیا..... یہ میں آج تک نہیں سمجھ پایا کہ آخر میں رویا کیوں تھا؟ آنٹی راحیلہ سے میری وابستگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ آٹھ سال کے عرصے میں اکا دکا سرسری ملاقاتیں یا پھر کبھی کبھار فون پہ ایک آدھ منٹ کی بات۔ اتنا زود رنج یا نرم دل میں بھی کبھی نہیں رہا کہ کسی کے دکھ پہ یوں رونے بیٹھ جاتا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو آنٹی کی ڈیتھ کی خبر میں نے خاموشی سے سنی تھی اور ماما اور پاپا کے ایبٹ آباد جانے کے بعد اکیلے گھر میں دندناتے ہوئے خوب عیش بھی کئے تھے۔ وہ، دادی کے پہلو سے اُٹھ کے میرے پاس آ گئی تھی، اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور میرا ماتھا چومتے ہوئے مجھے چپ کرا رہی تھی۔

''آنٹی! سعد بہت حساس بچہ ہے..... ہے نا؟'' اس نے کہا۔

میں ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہو گیا۔

''ہانی! سعد بہت مانٹڈ کرتا ہے اگر اسے بچہ کہا جائے تو۔'' ماما نے جیسے اسے خبردار کیا تھا۔ میں نے بھی وارننگ دیتی نظروں سے دیکھا۔ اس کی اداس گیلی آنکھوں میں تبسم کی ہلکی سی لہر آئی۔ میرا سر ایک بار پھر سہلا کے وہ کہنے لگی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ سعد کوئی بچہ تھوڑا ہی ہے۔ وہ تو بہت سمجھ دار ہے۔'' اور میں واقعی سمجھ دار تھا اس لئے بھانپ گیا کہ وہ مجھے بہلانے کے لئے یہ لالی پاپ تھما رہی ہے۔ ورنہ اس کا دیکھنے کا انداز، میرے بال سہلانا، پچکارتا ہوا لہجہ..... یہ سب ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجھے بچہ سمجھتی ہے۔ مگر میں احتجاج نہ کر سکا۔ یہ میری پہلی غلطی تھی، ہتھیار ڈالنے کی..... پھر زندگی بھر میں اس سے کوئی احتجاج نہ کر سکا۔ حالانکہ میں اس کا ہاتھ پرے جھٹک کے کہنا چاہتا تھا۔

''میری بزرگ بننے کی کوشش مت کرو۔''

لیکن کہہ نہ سکا کہہ بھی دیتا تو کیا ہوتا۔ میرے کہنے سے ہمارے درمیان موجود آٹھ

سال سمٹ تو نہ جاتے۔

ہاں وہ ہانیہ پیرزادہ، مجھ سے پورے آٹھ سال بڑی تھی۔

☆======☆======☆

وہ ایسی تھی کہ اس کو دیکھتے ہی میرا دل اس سے دوستی کرنے کو چاہنے لگا۔

حالانکہ میری آٹھ سال کی زندگی میں ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی کو دوست بنانے کی خواہش یوں یکا یک بھڑکی ہو۔ میں آدم بیزار تھا نہ تنہائی پسند، اس کے باوجود میرے دوستوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اپنے کلاس فیلوز کو میں ذہنی طور پہ خود سے بہت کم تر محسوس کرتے ہوئے گھبرا جاتا تھا اور شاید یہی گھبراہٹ ان پہ بھی طاری ہو جاتی تھی، جب وہ میرے منہ سے ایسی گفتگو سنتے جو ان کی عمر کے لڑکے شاید ہی کرتے ہوں۔

میرے پاپا کی عادت تھی کہ وہ ناشتہ کرنے ٹیبل پہ ہمیشہ سب سے لیٹ آتے، میں سکول ان کے ساتھ ہی جایا کرتا تھا اس لئے اپنا بریک فاسٹ کر کے مجھے ان کا انتظار کرنا ہوتا۔ انہیں دس پندرہ منٹ میں بریک فاسٹ بھی کرنا ہوتا، نیوز پیپر بھی پڑھنا ہوتا اور تب میں نے اس عمر میں انہیں نیوز پیپر پڑھ کے سنانے کی ڈیوٹی اپنے ذمے لے لی جب مجھے روانی سے پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ ایک دو ہفتے میں ہی میں بغیر اٹکے انہیں انگلش اور اردو کے اخبار پڑھ کے سنانے لگا، تب تک میرے دوسرے کلاس فیلوز حروف کو ملا کے پڑھنا ہی سیکھ رہے تھے۔

یوں میری اردو اور انگلش کی ریڈنگ سب سے بہتر ہو گئی۔ مجھے بھی اس کام میں مزہ آنے لگا۔ خود کو بڑا بڑا محسوس کر کے بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ ظاہر ہے میری عمر کا تو کوئی بچہ اخبار بینی کا عادی نہیں تھا۔ میرے نزدیک یہ بڑوں کے مشاغل میں شمار ہوتا تھا اور اگر میں یہ کرتا تھا تو ظاہر ہے کہ میں بڑا ہی ٹھہرا، دو ہی سال میں مجھے یہ تک پتہ چل چکا تھا کہ کون سی خبر اہم ہے اور کون سی غیر اہم، کیسی خبریں سیاسی کہلاتی ہیں اور کون سی تجارتی اور کن خبروں کو حالاتِ حاضرہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اب تو کبھی کبھی پاپا سے کسی خبر پہ ڈسکشن بھی کرنے لگا تھا اور سکول جا کر بھی کلاس فیلوز پہ تازہ پڑھی خبریں سنا کر اپنی قابلیت کا رعب جھاڑا کرتا۔ وہ رعب میں تو کیا آتے، مجھے عجیب و غریب جان کر دور ضرور ہو جاتے، البتہ ٹیچرز میری جنرل نالج سے خاصے متاثر تھیں اور مجھے سکول میں ہونے والے کوئز پروگرامز، ڈیبیٹ کمپی ٹیشن وغیرہ میں آگے کرتی رہیں۔ ان سرگرمیوں نے میرے اندر مطالعے کے شوق کو مزید ابھارا۔ اب میں نے پاپا سے کہہ کر اپنے لئے سٹوری بکس منگوانا شروع کیں۔ سنڈریلا، سلیپنگ بیوٹی، رابن ہڈ، ایلس ان ونڈر لینڈ ایک بار پڑھنے میں تو مزہ آیا لیکن اب وہ مجھے بور کرنے

لگیں۔ شاید انہیں پڑھنے سے میرے خود ساختہ "بڑے پن" کو ٹھیس پہنچتی ہو۔

میں حسن پرست بھی تو بہت تھا۔ مجھے تو ٹیچرز بھی وہ پسند تھیں جو خوش شکل اور خوش لباس ہوں۔ بھلے میں ان کی گڈ بک میں تھا یا نہیں۔ مس ماریہ سے میں سخت خار کھایا کرتا، حالانکہ وہ جنرل نالج کی ٹیچر تھیں اور میں اس سبجیکٹ میں بہت اچھا تھا۔ نتیجتاً مس ماریہ کا بھی فیورٹ سٹوڈنٹ تھا اور ساری کلاس میں سے وہ مجھ پہ ہی زیادہ مہربان رہا کرتیں، مگر مجھے ان کی مہربانی اور نرمی ذرا نہیں بھاتی تھی۔ قدرے سیاہ رنگت، باہر کو ابھرے گال، اندر کو دھنسی آنکھیں، ٹیڑھے میڑھے دانت اور موٹے موٹے ہونٹ جب وہ مسکراتیں تو میرا دل چاہتا اپنی آنکھیں زور سے بند کر لوں۔ اس کے برعکس مجھے مس لیلیٰ بہت پسند تھیں۔ جب کہ وہ میتھس کی ٹیچر تھیں اور یہ وہ واحد سبجیکٹ تھا جس میں، میں کمزور تھا اور اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کی خاص کوشش بھی نہیں کرتا تھا..... اگر کرتا تو کلاس میں فرسٹ پوزیشن میری ہی ہوتی۔

مس لیلیٰ کو میری ذہانت، حاضر جوابی، آئی کیو لیول اور اردو، انگلش کی ریڈنگ سے کوئی سروکار نہ تھا، ان کے سبجیکٹ کے لحاظ میں سے ایک غیر ذمہ دار، لاپرواہ اور خاصا ڈفر سٹوڈنٹ تھا۔ وہ میتھس کو سیریس نہ لینے کی وجہ سے مجھے اکثر ڈانٹتی ڈپٹتی رہتیں، لیکن ان کی تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود مجھے ان کی کلاس میں بیٹھنا اور انہیں دیکھتے رہنا پسند تھا اور یہ پسند بس بے ضرر سی تھی، معصوم سی تھی لیکن اس معصومیت کے باوجود میں کبھی کسی سے یہ نہ کہہ سکا کہ مجھے مس لیلیٰ کے گالوں میں پڑنے والے ڈمپل کتنے پسند ہیں۔ جو غصے میں لب بھینچ کر دیکھنے سے اور نمایاں ہونے لگتے ہیں اور جب کسی روز انہیں غصہ نہ آتا تو میں صرف ان ڈمپلو کو دیکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی فضول حرکت ضرور کیا کرتا۔ میرا کوئی دوست ایسا نہیں تھا جس سے میں یہ راز شیئر کرتا اور نہ ہی اب تک مجھے دوست بنانے کی کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی تھی حالانکہ میں اپنے پیرنٹس کی واحد اولاد تھا لیکن گھر میں اور سکول میں اپنی تنہائی سے مطمئن تھا۔ یہ میری خود ساختہ بردباری تھی اور میں اس میں کسی کی مداخلت برداشت کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ میری کتابیں، میرا ٹی وی، میرا کیمرہ، میری ویڈیو گیمز، میری سائیکل اور میں، سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ایسے میں وہ ہمارے گھر آ گئی اور میرے دل میں اس سے دوستی کی خواہش جاگ اٹھی۔

وہ ہانیہ پیرزادہ..... ایسی ہی تھی کہ اسے دیکھتے ہی میں نے اسے دوستی کے رشتے میں باندھنا چاہا۔ میں نے بتایا ہے نا کہ میں نے اس سے ہر طرح کی اور ہر قسم کی محبت کی ہے۔ تو یہ دوستی بھی شاید اس محبت کی تمہید تھی جو آنے والے سال مجھ پہ آشکار کرنے والے تھے۔

میرا جی چاہتا ہانی کا ہاتھ پکڑ کے اپنے کمرے میں لے جاؤں، اسے اپنی کتابیں دکھاؤں، اسے بتاؤں کہ اس کے پیر بالکل سنڈریلا کے پیروں جیسے نازک ہیں، اس کی رنگت بالکل سنو وائٹ جیسی ہے اور اس کی آنکھیں بالکل وٹر لینڈ کی ایلس کی طرح کھلی ہوئی روشن سی ہیں..... اس کے ساتھ ویڈیو گیمز، کیرم اور لوڈو کھیلوں اور اس سے ہارتا چلا جاؤں۔

وہ میرے کمرے کی صفائی، سلیقہ اور ڈیکوریشن سے خاصی امپریس ہوئی اور جب میں نے اسے بتایا کہ یہ سب میرا کارنامہ ہے تو وہ اور بھی حیران ہوئی۔

''زبردست، مجھے بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ تم اتنے ڈسپلنڈ ہو۔'' شاید وہ ایک بار پھر بچہ کہتے کہتے رکی تھی۔

میں نے ساری کاکس اس کے آگے ڈھیر کیں اور سنڈریلا اور سلیپنگ بیوٹی سے اس کی ایسی ایسی مماثلت تلاش کی، جو وہ خود بھی نہ جانتی ہوگی۔ خوش تو وہ خیر کیا ہوتی، البتہ حیران پریشان جی بھر کے ہوئی۔

''ہیں..... ہیں.....؟ یہ کیا کہہ رہے ہو سعد؟ آر یو جوکنگ؟'' اس کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کے میں قسم کھانے والے انداز میں اصرار کرنے لگا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں ہانی! آپ اتنی ہی خوبصورت ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔''

وہ ہنسنے لگی۔ میں پہلی بار اسے ہنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ ہنستی چلی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کی شفاف آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

''تو جناب..... جناب کو میں خوبصورت لگ رہی ہوں۔ بالکل سنڈریلا کے جیسی..... یا بالکل باربی ڈول کی طرح۔'' اس کے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا کہ مجھ پہ اچانک انکشاف ہوا، نہ صرف وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہے بلکہ میرا مذاق بھی اڑا رہی ہے۔ میرا دل بجھ کے رہ گیا۔ مرجھاتی ہوئی آواز میں، میں نے ایک بار پھر کہا۔

''یقین نہیں کرنا تو نہ کریں، میں تو پھر بھی یہی کہوں گا۔''

اسے ایک بار پھر ہنسی آئی، مگر میری سنجیدگی دیکھتے ہوئے اس نے ہنسی سے گریز کیا اور اپنا سر ہتھیلیوں پہ ٹکا کے بیٹھ گئی۔ میں اس کے بندھے ہوئے سیاہ ریشمی بالوں والے سر پہ پھیلی لانبی ملائم دودھیا انگلیوں کو دیکھنے لگا۔ جن کے سرے بے رنگ، مگر چمک دار تھے۔ میں نے ہولے سے ان ناخنوں کو چھوا۔

''آپ نیل پالش نہیں لگاتیں؟''

اس نے سر اٹھایا۔ مسکراہٹ اب بھی اس کی سیاہ آنکھوں میں جھولا جھول رہی تھی۔

''لگاتی ہوں..... مگر کبھی کبھار۔''

''آپ نماز پڑھتی ہوں گی شاید اس لئے۔'' میں نے قیاس کیا۔ اس کی آنکھیں ذرا سی پھیلیں اور ابرو بلند ہوئے۔ میں نے مزید وضاحت کی۔

''نیل پالش سے وضو نہیں ہوتا ناں۔''

''تمہیں کیسے پتا، آنٹی نے بتایا؟''

''میں نے ابھی پچھلے دنوں اخبار میں پڑھا تھا ایک کالم میں لوگ ایسے ہی سوال کرتے ہیں، نماز، وضو وغیرہ کے متعلق۔''

''اور تم وہ پڑھتے ہو۔'' اس نے سوال نہیں کیا تھا بلکہ خود سے کہا تھا۔ ''آئی کانٹ بلیو اٹ، آئی جسٹ کانٹ بلیو اٹ۔ تم اخبار پڑھتے ہو اور وہ بھی، مذہبی کالم سمیت۔''

''نہیں، ہمیشہ تو نہیں۔ میں زیادہ تر شارٹ اسٹوریز یا جوکس، یوٹمرز وغیرہ پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی پاپا کو کوئی کالم پڑھ کے سنا دیتا ہوں ان کے کہنے پر اور لاسٹ سنڈے دادی نے مجھ سے یہ کالم سنانے کو کہا تھا اس لئے یاد رہ گیا ہے اور پتہ ہے میں تو اکثر ماما کو مزے مزے کی ڈشز کی ریسپی بھی پڑھ کے سناتا ہوں، مگر ان کے پاس پکانے کا ٹائم ہی نہیں ہوتا اور صادقہ تو اتنی سڑیل ہے کہ میری کسی بات پہ کان ہی نہیں دھرتی، اپنی مرضی سے پکاتی ہے سب کچھ۔''

''انٹرسٹنگ، تم تو بڑے کام کے لڑکے ہو۔'' لفظ بچہ اس کی زبان کی نوک پہ پھسلنے کو تیار بیٹھا تھا، مگر شاید وہ میری خفگی کے خوف سے محتاط تھی۔

''میرا خیال تھا تم صرف کاکس پڑھتے ہو، لیکن لگتا ہے تمہیں مطالعے کا خاصا شوق ہے اور اگر تمہیں اچھی اچھی بکس گفٹ کی جائیں تو تمہیں اچھا لگے گا..... ہے ناں؟''

''کیا آپ مجھے بکس گفٹ کریں گی؟'' میں نے پوچھا۔ پھر اثبات میں جواب ملنے پر فوراً فی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں، پہلے میں آپ کو گفٹ کروں گا۔''

''وہ کیوں؟ اچھا تم بڑے ہو اس لئے۔'' وہ مسکرائی۔

''مذاق مت کریں۔'' میں نے ٹوکا تو پل بھر کے لئے اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ یقیناً وہ سوچ رہی ہوگی کہ آخر مجھ سے کس طرح کا برتاؤ کرے۔

''اچھا چلیں، آپ پہلے دے دیجئے گا۔'' میں نے مفاہمت اختیار کی۔

''آفٹر آل..... لیڈیز فرسٹ.....''

اس کی آنکھیں ایک بار پھر کھلیں۔ میں اسے خوش کرنے کے لئے یہاں لایا تھا لیکن یہ

دن اس کے لئے حیران ہونے کا تھا۔

''او کے جنٹل مین..... فرینڈ شپ؟'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے میں نے تھامنے میں دیر نہ لگائی۔

''مجھے بھی بکس پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ہماری خوب گزرے گی۔ میرے پاس ابھی بھی اپنی بچپن کی سب بکس محفوظ ہیں۔ میں وہ تمہیں پڑھنے کے لئے دوں گی۔''

''وہ کیوں؟ میں وہ بکس کیوں نہیں پڑھ سکتا جو آپ اب پڑھتی ہیں۔''

''وہ بکس..... اچھا ٹھیک ہے پڑھ لینا۔'' اس نے جان چھڑانے کو ہامی بھری، اس کے خیال میں مجھے ناصر کاظمی، پروین شاکر اور فرحت عباس شاہ کے شعری مجموعوں اور بشریٰ رحمٰن اور بانو قدسیہ کے ناولز میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور تب تک واقعی مجھے دلچسپی تھی بھی نہیں۔

اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ مختلف گیمز کھیلے اور جیسا کہ میں طے کر چکا تھا کہ اس سے ہار کے اسے خوش ہونے کا موقع دوں گا مگر اب تک میں اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دانستہ طور پہ اچھی خاصی بے وقوفیاں کرنے کے باوجود میں ہی ہر گیم جیت رہا تھا۔ میں الجھ کے رہ گیا۔ اُلجھن شاید میرے چہرے سے ہویدا تھی جسے بھانپ کے اس نے پوچھا۔

''کیا بات ہے سعد! بور ہو رہے ہو؟''

''نہیں..... ناٹ ایٹ آل۔'' میں نے اس خیال سے کہا کہ وہ پوری دلچسپی سے کھیل رہی تھی۔

''تو پھر منہ کیوں لٹکا رکھا ہے۔ کم آن یار، جیتتے چلے جا رہے ہو پھر بھی خوش نہیں ہو۔''

اس کے کہتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے بغور اسے دیکھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ کوشش جس میں میں ناکام ہو رہا ہوں، وہی کوشش وہ کامیابی کے ساتھ کر چکی ہے، یعنی جان بوجھ کر ہارنے کی.....

''اس لئے خوش نہیں ہوں کہ یہ جیت میری نہیں ہے آپ جان بوجھ کر ہار رہی ہیں۔''

وہ گھبرا گئی۔

''نہیں سعد! ایسی بات نہیں۔'' لیکن میں مزید کچھ سننے کے بجائے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے سخت غصہ آ رہا تھا۔

''پلیز سعد! دیکھو ناراض مت ہو۔ اچھا پرامس..... پرامس کرتی ہوں اب ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام کے مجھے کھینچا اور میں سعد رضوان، جو ایک بار منہ سے اکھڑ جائے تو اسے بہلانا، منانا ناممکن ہو جاتا ہے..... چپ چاپ گھٹنے ٹیک کے بیٹھ گیا۔

☆======☆======☆

''ہیلو سعد! کیا ہو رہا ہے؟''

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ میں دن کا زیادہ تر وقت کمرے میں ٹی وی دیکھتے ہوئے، گیمز کھیلتے ہوئے یا بکس پڑھتے ہوئے گزارتا۔ شام کو میرا ٹیوٹر آ جاتا، دو گھنٹے اسٹڈی کے بعد میں پاپا کے ساتھ جم چلا جاتا۔ وہ ٹینس کھیلتے، فرینڈز کے ساتھ کافی پیتے، میں سوئمنگ کرتا رہتا..... ہانی سے میری دوستی تو ہو گئی تھی مگر کوئی خاص پروان نہ چڑھ رہی تھی..... کم از کم میری نظر میں۔ میں اس سے جس درجہ توجہ کا متقاضی تھا، وہ دینے سے قاصر تھی۔ ایبٹ آباد میں وہ ٹیف ایس سی کے ایگزامز دے کر آئی تھی۔ یہاں آتے ہی اس کا رزلٹ بھی آ گیا۔ پری انجینئرنگ کے میرٹ پہ وہ پورا اُترتی تھی اور یہ اس کا جنون بھی تھا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے بعد وہ یوں پڑھائی میں جُت گئی جیسے اگلے ہی ماہ فائنل ایگزامز دے کر انجینئر بن جانے والی ہو۔ میں پڑھائی کے لئے اس کی سنجیدگی دیکھ کے حیران ہوتا اور ساتھ ہی خوفزدہ بھی..... کہ بڑی کلاسز میں جا کر مجھے بھی ایسی خوفناک نظر آنے والی موٹی موٹی کتابوں کو دن میں سولہ سولہ گھنٹے تک پڑھنا پڑے گا۔ اسٹڈیز کے علاوہ فی الحال اس کی اور کوئی مصروفیت نہیں تھی اور نہ ہی میرے سوا اور کسی سے دوستی تھی۔ جب بھی وہ فارغ ہوتی، میرے پاس آ جاتی۔ میں اس چند منٹ کی توجہ کے انتظار میں سارا سارا دن گزار دیتا۔ میں اس بار چھٹیاں گزارنے کراچی بھی نہیں گیا تھا اور شام کو پاپا کے ساتھ جانے میں بھی آنا کانی کیا کرتا تھا حالانکہ شام کو بلکہ سہ پہر کو دو گھنٹے وہ سو کر گزارتی تھی اور اس کے بعد نئے سرے سے تازہ دم ہو کر پڑھنے لگ جاتی، لیکن اس کے باوجود اس کے ساتھ چند منٹ گزارنے کے لالچ میں، میں گھر پہ رہنے کو ترجیح دیتا اور پھر ایک دن اس نے مجھے شام کی چائے پیتے ہوئے ٹوک دیا۔

''یار سعد! تم کس قدر ڈل ہو۔ سارا دن ٹی وی دیکھتے ہوئے بور نہیں ہوتے؟ کیا مارے خیال میں دن بھر میں صرف دو گھنٹے اسٹڈیز کے لئے کافی ہیں؟''

''جتنا ہمیں سکول میں پڑھایا جاتا ہے اس کے لئے تو دو گھنٹے بہت ہیں ہانی۔ کم از کم میرے لئے تو بہت ہیں۔ ایگزامز میں کچھ ایکسٹرا ٹائم دے دیتا ہوں مگر وہ بھی صرف پاپا ماما کی خوشی کے لئے، ویسے اس کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔''

''ہوں..... اوور کانفیڈینٹ..... کانفیڈینٹ ہونا اچھی بات ہے مگر اوور کانفیڈینٹ اور وہ بھی اسٹڈیز کے لئے..... یہ زیادہ اچھی بات نہیں۔ میرا سکول پیریڈ بھی اچھا رہا ہے، میں پوزیشنز لیتی رہی ہوں، لیکن کبھی یہ سوچ کر اسٹڈیز کو ایزی نہیں لیا کہ..... میں تو بس میں

ہوں، مجھے اتنا سر کھپانے کی کیا ضرورت؟"

"ہاں تو آپ کوئی فوتحہ اسٹینڈرڈ میں تو نہیں۔ اتنی تو موٹی موٹی بکس ہیں آپ کی، میری بکس تو ان کے آگے چنی منی سی لگیں گی، ان کے لئے دو گھنٹے کافی ہیں۔" میں اپنی بات پہ اڑا رہا۔

"پھر بھی..... تمہاری کوئی اور ایکٹویٹی بھی تو نہیں۔ جب دیکھو کشن یا بیڈ پہ اوندھے لیٹے ٹی وی دیکھ رہے ہوتے ہو۔ عینک لگ گئی نا تو انکل جیدی لگو گے۔" اس نے میرے بال اپنی انگلیوں سے بکھرا دیئے۔

"آؤٹ ڈور گیمز صحت کے لئے زیادہ بہتر ہوتے ہیں۔ ان ڈور گیمز سے مینٹل ایبلتھ ڈویلپ ہوتی ہے مگر فزیکلی بھی انسان کو فٹ رہنا چاہئے۔"

اس کے بعد میں نے چاہتے ہوئے بھی شام کو جم خانہ جانے کا ناغہ نہیں کیا۔ البتہ دن کا ابتدائی حصہ اب بھی میں اپنے طریقے سے ہی گزارا کرتا، ہائی تو یوں بھی گھر پہ نہیں ہوتی تھی، پاپا آفس اور ماما اپنے انسٹی ٹیوٹ میں، وہ کوکنگ، پینٹنگ، بیوٹیشن ٹریننگ، فلاور میکنگ وغیرہ وغیرہ جیسے آرٹ سکھانے والا ایک انسٹی ٹیوٹ کئی سالوں سے بڑی کامیابی سے چلا رہی تھیں اور اس وقت لاہور میں ان کے انسٹی ٹیوٹ کا بڑا نام تھا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں تو وہ دو شفٹوں میں کلاسز شروع کروا دیتیں، اس قدر رش بڑھ جاتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے ہر ڈیپارٹمنٹ کے لئے ٹرینڈ ٹیچرز رکھی ہوئی تھیں مگر پھر بھی وہ وہاں باقاعدگی سے جاتیں اور آفس ورک دیکھتیں۔

میں تو اب ان دونوں کی انتہا درجے کی معروفیت کا عادی ہو چکا تھا اور بالفرض اگر کسی روز وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک خلاف معمول کسی وجہ سے گھر پہ ہوتا تو مجھے عجیب بے چینی اور بے آرامی سی محسوس ہوتی۔ مگر ہائی کے سلسلے میں یہ بات نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ آج گھر پہ ہے مگر جیسے ہی وہ میرے کمرے میں آئی، میں کھل اٹھا۔

"ہیلو سعد! کیا ہو رہا ہے؟"

اس نے میرے برابر رکھا فلور کشن سیدھا کر کے ٹیک لگائی اور بیٹھتے ہوئے میرے شانے پہ ہلکی سی دھپ بھی لگائی۔

"کچھ بھی نہیں، یہ ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ آپ آج گھر پہ؟"

"ہاں، آج میری کلاس پکنک پہ جا رہی ہے۔ سو میں نے سوچا، آرام کیا جائے۔"

"کیوں آپ کو پکنک پسند نہیں؟ مجھے بھی بہت بور لگتی ہے۔ فضول میں اتنے سارے لوگ جمع ہو کر شور کرتے ہیں۔"

"خیر ایسی بات نہیں کہ مجھے پکنک پسند نہیں ہے یا لوگوں میں وقت گزارنا اچھا نہیں لگتا،

دراصل لمبے سفر سے میری جان جاتی ہے۔ وہ لوگ منگلا ڈیم جا رہے ہیں اور پھر شکر پڑیاں کا بھی پروگرام ہے۔ مائی گاڈ، پانچ گھنٹے جانے میں، پھر پانچ گھنٹے واپس آنے میں..... میں تو ایک ہی دن میں دس گھنٹے کے سفر کا تصور بھی نہیں کر سکتی ویسے بھی کالج بس انتہائی خراب حالت میں ہے، پانچ گھنٹے کا راستہ بھی بمشکل سات گھنٹے میں پورا ہوا ہوگا۔ اسی لئے صبح چار ساڑھے چار بجنے نکلنے کا پروگرام تھا۔"

"اوگاڈ، یہ صبح تھوڑا ہی ہے، یوں کہیں کہ آدھی رات کو جانے کا پروگرام تھا۔ اچھا ہوا آپ نہیں گئیں۔ ہم گھر پہ خوب انجوائے کریں گے آپ کی آج کی یہ چھٹی..... پکنک تو انتہائی فضول سا کام ہے۔"

"تمہیں ہر وہ کام فضول کیوں لگتا ہے سعد.....! جو اس کمرے سے باہر نکل کر کرنے والا ہو۔" اس کے اچانک سوال پہ میں سوچنے لگا کہ اس بات کا کیا جواب دوں۔ میرے کچھ کہنے سے قبل وہ بول اٹھی۔

"پرسوں سنڈے ہے اور آج کل ہفتے میں دو تین دن تو ضرور بارش ہوتی ہے۔ دعا کرو، پرسوں بھی موسم اچھا ہو۔ ہم دونوں جلو پارک چلیں گے پکنک منانے پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ پکنک بور کام ہے یا مزے کا کام ہے۔" اور میں نے ہامی بھر لی۔

☆======☆======☆

"اتنی دیر لگا دی آج بیٹا؟"

میں پاپا کے ساتھ سوئمنگ کر کے واپس لوٹا ہی تھا کہ کچھ دیر بعد وہ آ گئی۔ مجھے اسی وقت پتا چلا کہ وہ صبح کی یونیورسٹی کے لیے نکلی اب گھر لوٹی ہے۔ ماما نے اسے دیکھتے ہی تاخیر سے آنے کی وجہ پوچھی۔

"اور یہ کیا کچھ اٹھا رکھا ہے؟" انہوں نے اسے مختلف سامان اٹھائے دیکھ کر پوچھا۔

"یہ سب..... یہ آنٹی کل کی پکنک کی تیاری ہے۔ میں اور سعد کل پکنک منانے جلو پارک جا رہے ہیں۔ آپ چلیں گی؟"

"میں؟ سوری بیٹا، کل تو میرے انسٹی ٹیوٹ میں ون ڈش پارٹی ہے۔ یوں بھی چھٹی کا دن آرام کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ تم لوگ جاؤ، انجوائے کرو..... اچھا ہے چینج رہے گا..... لیکن یہ سب تم کیوں لائی ہو؟"

"آنٹی! پکنک کے لئے صرف پکنک پہ جانا ضروری نہیں ہوتا، پکنک کے دوسرے لوازمات بھی چاہیے ہوتے ہیں۔ صبح میں سب چیک کر کے گئی تھی اور صادقہ سے بھی پوچھ لیا

تھا۔ گھر میں نہ تو کوئی پکنک باسکٹ تھی نہ ہی کوئی چھوٹا موٹا واٹر کولر۔ اب اگر گرمیوں میں چند گھنٹے باہر گزارنے ہیں تو واٹر کولر کا ہونا تو ضروری ہے۔ ایک یہ پکنک باسکٹ لی ہے اور ایک یہ چٹائی۔ یہ ڈسپوزیبل واٹر گلاس، کپ اور پلیٹس۔''

''تم یونیورسٹی کے بعد مارکیٹ میں سر کھپاتی رہیں؟ کمال ہے بیٹا! کیا یہ تمہارے کرنے والے کام ہیں؟ مجھے فون کر دیتیں، ڈرائیور سے منگوا کر گھر بھجوا دیتا۔ خیر بتاؤ اور کیا کیا چاہئے؟ میرے شیر بچے کل پہلی بار اکیلے پکنک پہ جا رہے ہیں، تیاری شاندار ہونی چاہئے، لسٹ بنا دو ابھی رشید سے منگوا دیتا ہوں۔''

پاپا کی آفر پہ اس نے تسلی سے بیٹھ کے لمبی چوڑی لسٹ بنائی۔ ان میں سے کئی چیزوں کے بارے میں تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ ان کا کیا کیا جائے گا۔ رشید اس کا مطلوبہ سامان لے آیا تھا اور وہ سارے دن کی تھکن اتارنے کے بجائے کچن میں جا کر کل کی تیاری کر رہی تھی۔ ماما نے اس سے کہا بھی کہ وہ صادقہ سے بنانے کا کہہ کر خود آرام کرے مگر دادی نے منع کر دیا۔

''رہنے دو نازیہ! میں دیکھ رہی ہوں کہ کتنے روز بعد وہ اپنے رنگ میں لوٹی ہے۔ آج لگ رہا ہے جیسے وہ اپنے گھر میں ہے، اپنے لوگوں میں..... اسے یہ اپنائیت جی بھر کے محسوس کر لینے دو۔ ہانی بہت سمجھ دار بچی ہے، اسے اپنے آنسو پونچھنے کا سلیقہ ہے، دیکھو، کس طرح وہ خود کو یتیمی کے دکھ سے باہر نکالنے کے لئے خود ہاتھ پیر مار رہی ہے۔''

دادی کم ہی لمبی بات کیا کرتیں، مگر میں ان سے متفق نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہانی خود کو بہلانے کے لئے خوشیوں کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ مجھے خوش کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔

میں نے بتایا تو ہے کہ میں اسے پہلی نظر میں جاننے لگا تھا، پہچاننے لگا تھا اور اسی پہچان نے تو مجھے اس کے قریب جانے پہ مجبور کیا تھا۔ وہ بہت اچھی تھی..... بہت ہی اچھی..... بلکہ گزرے سالوں نے یہ ثابت کر دیا کہ میرا ہانیہ پیرزادہ بنت سلیمان علی پیرزادہ کے بارے میں اندازہ صد فی صد درست تھا۔

پاپا کی پجارو پہ ہماری سواری نکلی..... شاہانہ سواری، آگے رشید کے ساتھ والی سیٹ پہ ہانی کے ہاتھ کی بنی گئی مزیدار چیزوں سے بھری ہوئی باسکٹ اور ہاٹ پاٹ رکھے تھے۔ پچھلی سیٹوں پہ ہم دونوں کے علاوہ اور بہت سا سامان رکھا تھا۔ مجھے دو لوگوں کی پکنک پہ اتنے ساز و سامان کو دیکھ کر کفر سی آ رہی تھی۔ مگر وہاں جا کر اندازہ ہوا کہ ان میں سے کوئی چیز بھی فالتو نہیں تھی۔

موسم خاصا خوشگوار تھا۔ صبح کے وقت ہلکی بوندا باندی ہوئی تھی، مگر اس نے حبس پیدا نہیں

کیا تھا بلکہ آسمان پہ چھائے سرمئی بادلوں کی موجودگی میں چلتی ٹھنڈی ہوائیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ ہم لوگ ناشتے کے فوراً بعد تقریباً نو بجے گھر سے نکلے تھے اور آدھ پون گھنٹے میں وہاں پہنچ گئے تھے۔ چھٹی کا دن تھا اور وہ بھی ایسا سہانا، اس لئے خاصی فیملیز آئی ہوئی تھیں۔

''ارے، یہ کیا بارش۔'' اچانک پھوار پر اس نے چونک کر کہا۔

''لو ساری پکنک کا مزہ خراب۔ اب کیا گاڑی میں بیٹھ کے پکنک منائیں گے۔'' میں نے ایک منٹ قبل بھجائی چٹائی تہہ کرتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

''کیوں؟ اس چھتری کو بھول گئے کیا؟'' اس نے رشید کو واپس پلٹنے کا اشارہ دیا۔

بڑی سی رنگین چھتری کے نیچے خود کو گھسائے ہم دونوں سرسبز گھاس پہ ٹہلتے ہوئے دنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنے بچپن کے قصے اور ایبٹ آباد کی یادیں سنا رہی تھی۔ میں سکول میں آئے روز رُونما ہونے والے اپنے اور دیگر کلاس فیلوز کے معرکے سنا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ آگے کر کے بارش کی تیز پھوار کو اپنی ہتھیلی پر جمع کرتی اور پھر جھٹک دیتی۔ دو تین بار اس کی یہ حرکت دیکھنے کے بعد میرا بھی دل چاہا یہ تجربہ کرنے کو، اب جب وہ ہاتھ آگے کرتی، میں بھی کر دیتا۔ ساون کی یہ پھوار بس دس بارہ منٹ تک برسی اور موسم کو مزید خوبصورت کرنے کے بعد غائب ہو گئی۔ ہم دونوں کو ہی بھوک ستا رہی تھی۔

ہانی نے چٹائی بچھائی، فروٹ باسکٹ، ہاٹ پاٹ اور ڈسپوزیبل گلاس اور پلیٹیں نکال کر سجائیں۔ ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور ہم اپنا شاندار لنچ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد میرے اصرار کرنے پہ وہ بونگ کرنے پہ بھی تیار ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے وہ پانی سے خوفزدہ تھی اور اسی لئے بونگ کرنے سے گھبرا رہی تھی لیکن اپنی گھبراہٹ وہ مجھ پہ ظاہر نہ کرنا چاہ رہی تھی۔ بوٹ میں بیٹھتے ہی میں نے خود کو مزید بڑا بڑا محسوس کیا اور جب وہ سپیڈ تیز ہونے اور پانی کے جھاگ بلند ہونے پر گھبرا کے پیچھے ہوتی تو مجھے اسے تسلی دیتے ہوئے اور ''ڈونٹ وری، میں ہوں ناں آپ کے ساتھ۔'' دہرانا اور بھی اچھا لگتا۔

''چائے پیو گے؟'' رشید کو ایک کپ چائے بھیجنے کے بعد جب وہ اپنے کپ میں چائے تھرماس سے انڈیل رہی تھی۔ اس نے سرسری انداز میں مجھ سے پوچھا۔ میں چائے کا عادی نہیں تھا لیکن اس وقت پتا نہیں کیوں میں نے سر ہلا دیا۔ شاید میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے خود کو اور بڑا ثابت کرنا چاہتا تھا۔

''چکن رولز، ڈرم اسٹکس اور سینڈوچز تو مزے کے تھے ہی مگر آپ چائے بھی بہت اچھی بناتی ہیں، ہانیہ۔'' میں نے بالکل پاپا کے اسٹائل میں کہا، جب کبھی ماما اور پاپا شام کی

چائے کے وقت اکٹھے گھر پہ ہوتے اور ماما تکلفاً خود چائے بناتیں تب وہ یونہی ایک سپ لیتے ہی سر ہلا کے یہ تعریفی کلمات کہتے لیکن ہانی نے پہلا گھونٹ بھرتے ہی عجیب سا منہ بنا کے کپ رکھ دیا۔

''صرف یہ چائے ہی تھی، جسے بنانے کا کام میں نے صادقہ کو سونپا تھا اور یہ چائے تو ذرا بھی اچھی نہیں بنی۔'' میں شرمندہ ہو گیا۔

''اور ایک بات تو بتاؤ، یہ تم مجھے ہانیہ کیوں کہتے ہو؟''

''کیونکہ یہ آپ کا نام ہے۔'' میں اس کے عجیب سے سوال نما اعتراض پہ حیران ہوا۔

''ہاں وہ تو ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ تم مجھے میرے نام سے پکارو۔''

''نہیں، ضروری تو نہیں، مجھے یہ نام ویسے بھی خاصا مشکل لگتا ہے، میں آئندہ سے آپ کو صرف ہانی کہہ کے بلاؤں گا۔'' میں نے طے کر لیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور صاف لفظوں میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تمہارے خیال میں کیا یہ مناسب نہیں کہ تم مجھے نام سے بلانے کی بجائے کچھ اور کہو مثلاً باجی، آپی..... وغیرہ وغیرہ آخر میں تم سے بڑی ہوں اور خاصی بڑی ہوں۔ دوسری بات یہ کہ مجھے نام سے پکارنے والے بہت ہیں، رشتے سے پکارنے والا کوئی نہیں۔ تم میرے نام کے ساتھ کوئی رشتہ لگاؤ گے تو مجھے اچھا لگے گا۔''

''آپ نے مجھ سے دوستی کی تھی اور دوستی میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ اب اگر آپ کو خیال آ رہا ہے کہ آپ مجھ سے بہت بڑی اور سمجھدار ہیں اور میں ایک بے وقوف سا لڑکا ہوں تو آپ بے شک مجھ سے دوستی ختم کر دیں۔''

''اچھا بھئی سوری، ویری سوری، آئندہ ہماری دوستی میں کوئی بھی بڑائی چھوٹائی والا معاملہ نہیں آئے گا۔ چلو اب موڈ ٹھیک کرو۔ میں یہ تھوبڑا دیکھنے کے لئے تمہیں یہاں نہیں لائی۔ چلو ایسا کرتے ہیں، اسکریبل نکالتے ہیں۔''

''نہیں، سائیکلنگ۔'' میں نے اس کی بات رد کر کے اپنا مشورہ پیش کیا اور پھر یہ میری عادت بن گئی۔ میں ہمیشہ اس پہ اپنی رائے تھوپنے کی کوشش کرتا، اپنی مرضی چلانے کی ضد کرتا اور وہ ہمیشہ مان جاتی۔

☆======☆======☆

''یہ میرا فیورٹ پلے ہے۔'' میں نے اسے بتایا اور اس کے ہاتھ سے میگزین لے کر سائیڈ پر رکھ دیا تاکہ وہ بھی پوری توجہ سے میرے ساتھ ٹی وی دیکھے۔

''یہ بتاؤ کون سا پلے یا کون سا پروگرام تمہارا فیورٹ نہیں ہے۔ جب دیکھو ٹی وی سے چپکے رہتے ہو۔'' اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ مگر میں نظر انداز کرتے ہوئے دل جمعی سے ٹی وی دیکھتا رہا۔

یہ 90ء کی دہائی کا پہلا سال تھا اور اگرچہ اس دہائی کے وسط تک ڈش انٹینا کی سہولت گھر گھر پہنچ چکی تھی، بلکہ اس دہائی کے اختتام تک کیبل کلچر بھی فروغ پا چکا تھا جس نے ہر شخص کو بیک وقت سو سو چینلز سے متعارف کروا دیا تھا مگر یہ 1991ء تھا۔ ڈش انٹینا ابھی خاص تھا، عام نہیں ہوا تھا اور جہاں جہاں تھا یعنی جیسے کہ ہمارے گھر..... وہاں بھی تفریح سے زیادہ معلوماتی استعمال میں ہی آتا تھا۔

''لو اب تو ختم ہو گیا..... چلو آؤ لان میں چلتے ہیں، بڑا اچھا موسم ہو رہا ہے۔'' پروگرام کے ختم ہوتے ہی ہانی نے پھر کہا۔

''کیا اچھا ہے..... اتنی گرمی ہے میں نہیں جا رہا اور نہ ہی آپ جائیں گی ہنی۔'' ہانی سے رفتہ رفتہ اب وہ میرے لئے ہنی ہو چکی تھی۔

''واؤ..... بولڈ اینڈ دی بیوٹی فل..... اس کا تو لاسٹ ایپی سوڈ بھی آپ کی وجہ سے مس کر دیا تھا میں نے۔'' میں نے والیم تیز کر دیا۔ بولڈ اینڈ دی بیوٹی فل ان دنوں اس چینل پہ چلنے والا سب سے مقبول سوپ تھا۔ اس کا ٹائٹل ہی چل رہا تھا کہ ہانی نے میرے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹا۔

''تم یہ سب دیکھتے ہو؟ بتاتی ہوں میں آنٹی کو اور ابھی تمہارے کمرے سے ڈش انٹینا کا کنکشن اُڑواتی ہوں۔'' اسے غصے میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

''کیا یہ غلط نہیں ہے؟''

''سعد! اس قسم کے پلے دیکھنا تمہارے لئے ٹھیک نہیں۔ کیا تمہارے ماما، پاپا کو علم ہے کہ تم یہ چینل دیکھتے ہو۔''

''وائے ناٹ..... ان فیکٹ ماما نے ہی کہا تھا کہ میں اس چینل کو ضرور وزٹ کیا کروں اسپیشلی ڈرامازوغیرہ..... ان سے میری انگلش امپروو ہو گی۔''

''انگلش.....'' وہ سر جھٹک کے رہ گئی۔ ''صرف انگلش ہی کیوں؟ اور بھی بہت کچھ امپروو ہو رہا ہو گا۔''

''واٹ؟'' اس کی بڑبڑاہٹ تب میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

''پی ٹی وی لگاؤ، مرینہ خان والا پلے آ رہا ہے۔'' اس نے فی الحال مجھے سمجھانا ضروری

خیال نہیں کیا البتہ چینل تبدیل کروانے میں ضرور کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد وہ اکثر چیک کیا کرتی کہ میں ٹی وی پہ کیا دیکھ رہا ہوں اور ویڈیو پہ کون سی مووی لگائی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی وہ خود مجھے سلیکٹڈ انگلش موویز کے نام بتاتی اور پھر میرے ساتھ ہی بیٹھ کے دیکھتی، مختلف سائنس فکشن، کامیڈی یا پھر کارٹون موویز۔

☆======☆======☆

اس کے آنے سے اور کسی کو فرق پڑا ہوا یا نہ ہو، مجھے ضرور پڑا تھا۔ ماما اور پاپا کی وہی مصروفیات تھیں، بلکہ اب ماما میرے متعلق اور بھی بے فکر ہوگئی تھیں۔ پہلے جو تھوڑا بہت دھیان انہیں میری اسٹڈیز اور صحت کے بارے میں رکھنا پڑتا تھا، وہ بھی دادی اور ہانی کی وجہ سے رفتہ رفتہ کم ہوتے نہ ہونے کے برابر ہوگیا۔

ہنی اپنی اسٹڈیز میں پوری طرح سے انوالو ہونے کے باوجود کبھی میری طرف سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ یہی لگاؤ اس کا دادی کے لئے بھی تھا۔ اپنے کمرے میں وہ صرف تب پائی جاتی جب پڑھ رہی ہوتی، بصورت دیگر وہ میرے ساتھ لان میں یا پھر دادی کے کمرے میں وقت گزارا کرتی اور صرف اس کی وجہ سے میں دادی کے بور کمرے میں بھی گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھا رہتا۔ ان دنوں میں اوبیول کر رہا تھا، جب کہ وہ بی ای کے فائنل ایئر امتحانوں کی آج کل فراغت کے مزے لوٹ رہی تھی۔ میں سکول سے آکر سیدھا دادی کے کمرے میں چلا جاتا، جہاں وہ ان کے کمبل میں دبکی بیٹھی کافی پی رہی ہوتی یا چلغوزے کھا رہی ہوتی، اس نے میرے لئے ایک بند مٹھی میں چلغوزے چھیل کر رکھے ہوتے جو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے میری مٹھی میں منتقل کر دیتی۔ کھانا کھاتے ہوئے میں اسے سکول کی دن بھر کی رپورٹ دیا کرتا۔

اگرچہ وہ میری اچھی دوست تھی، مگر اب میں اتنا سمجھ دار ضرور ہو چکا تھا کہ اس سے کئی باتیں چھپانے لگا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے میری کون سی بات ناگوار گزرے گی اور کس پہ وہ ٹوکے گی..... لہٰذا میں نے ایسی باتیں اس سے کرنا ہی چھوڑ دیں۔ پہلے میں نے بڑی سچائی سے اسے مس لیلیٰ کے بارے میں اپنی پسندیدگی سے آگاہ کیا تھا۔ وہ سن کر بہت ہنسی تھی لیکن پھر اس نے مجھے ٹوکنا شروع کر دیا۔ صورت کی بجائے سیرت پہ توجہ دینے کا لیکچر جھاڑنا شروع کر دیا۔ مجھے سیرت والا فلسفہ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور نہ ہی یہ بات کہ کسی خوبصورت چیز کو پسند کرنا اور بدصورتی سے نفرت کرنا بُرا کیسے ہو سکتا ہے۔

سیرے ٹیوٹر کے آنے سے پہلے وہ خود میرا سارا کلاس ورک چیک کرتی، یہی وجہ تھی کہ اب ٹیوٹر مجھے زیادہ توجہ سے پڑھانے لگے تھے، کیونکہ ہنی اکثر ان سے اس بارے میں ڈسکس

کرتی تھی۔

اُس روز بھی سکول سے آنے کے بعد میں سیدھا دادی کے کمرے میں چلا گیا۔ دادی تخت پہ جائے نماز بچھائے کسی وظیفے میں مصروف تھیں اور ان کے بستر میں کمرتک کمبل اوڑھے وہ نیم دراز تھی۔ گھٹنوں کے سرے پہ اس نے کوئی میگزین ٹکا رکھا تھا۔ شاید اسے نہائے کچھ ہی دیر گزری تھی کیونکہ اس کے لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی نمی بھی لئے ہوئے تھے۔ مجھے اس کے بال بہت پسند تھے اور میں اکثر ہی اس سے انہیں کھلا رکھنے کی فرمائش کیا کرتا۔

''پلیز ہنی! کم از کم آج کی پارٹی میں تو ہیئر اسٹائل کچھ چینج کر لو اور کچھ نہیں تو انہیں کھلا ہی رہنے دو۔''

''بھئی، مجھ سے یہ مت کہا کرو۔'' وہ بال کھلے رکھنے کے تصور سے ہی گھبرا اٹھتی تھی۔ ''مجھے سخت پریشانی ہوتی ہے اس جھاڑ کے پھیلانے سے۔ میں اس ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں ہی کمفرٹیبل رہتی ہوں۔''

اور اب وہ ڈھیلی ڈھالی چوٹی، ہلکی نم ابھی ہوئی خم دار لٹوں کی صورت ہلکے آسمانی تکیے پہ پھیلی تھیں۔ سردی کی شدت سے اس کے گورے چہرے کی ساری گلابیاں ایک دم برف ہو چکی تھیں اور سیاہ بالوں کے ہالے اور گہرے سرمئی کمبل کے سائے میں یہ سفیدی کچھ زیادہ ہی نمایاں ہو رہی تھی۔ اب بھی وہ منظر مجھے یاد آتا ہے، تو برف پوش وادیوں کے نظارے میرے تصور میں پھیل جاتے ہیں۔ میں شوز اتار کر کمبل میں گھس گیا۔

''اوں ہوں، چینج تو کر کے آؤ۔'' اس کے ٹوکنے کے باوجود، مارے سُستی کے میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ مجھ سے آج کے پیپر کے بارے میں پوچھنے لگی، میں اسی کے تکیے پہ سر رکھ کے لیٹا، آہستہ آہستہ اسے بتانے لگا۔ میری آواز سُست پڑنے لگی، لہجہ اکھڑنے لگا، پلکیں بند ہونے لگیں..... شاید نیند مجھ پہ غالب آ رہی تھی..... اس کے بالوں سے آتی عجیب سی خوشگوار مہک میرے حواسوں پر پُرشفقت تھپکی دے رہی تھی۔ آخرکار میں ہار گیا۔ اب مجھ میں مزید ایک لفظ کہنے کی سکت نہ رہی تھی۔ میرا سر جھولتے ہوئے اس کے شانے سے آ ٹکا۔ اس نے میرے اوپر کمبل برابر کیا۔ میں ہلکی غنودگی کے زیر اثر تھا اور قریب تھا کہ گہری نیند میں چلا جاتا کہ دادی کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''سعد یہیں سو گیا ہے؟''

''جی..... پیپرز ہو رہے ہیں۔ رات دیر تک پڑھتا رہتا ہے، اسی لئے آتے ہی کھانا کھائے بغیر سو گیا۔''

''اس سے کہہ دیتیں کہ اوپر اپنے کمرے میں جا کے سو جائے۔ خیر چلو تم تو اُٹھو، سونے دو اسے یا کم از کم اس کا سر ہی تکیے پہ رکھ دو۔''

ان کے لہجے سے چھلکتی ہلکی سی ناگواری محسوس کر کے میری نیند کے ہلکورے ذرا مدھم ہوئے۔ مجھے لگا انہیں میرا اپنے بستر پہ سونا پسند نہیں آیا۔

''ابھی اس کی نیند کچی ہے، کہیں جاگ نہ جائے۔ ذرا دیر میں کرتی ہوں۔'' ان کے برعکس ہنی سرگوشیوں کے انداز میں بول رہی تھی۔

''چلو اچھا ہے جاگ جائے۔ بھوکا سو گیا ہے اور وہ بھی اس طریقے سے..... نہ لباس تبدیل کیا نہ منہ ہاتھ دھویا۔ میں جگاتی ہوں اسے۔'' اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکارتیں یا شانے سے پکڑ کے ہلاتیں، ہنی کہہ اٹھی۔

''پلیز دادی! سونے دیں۔'' اس نے شاید میرے اوپر بازو پھیلایا تھا۔ کہنی کی دبیز تہہ کے اوپر مجھے اس کے حلقے کی نرمی محسوس ہوئی۔

''ہانی! ناسمجھ مت بنو۔ واضح الفاظ میں سمجھا رہی ہوں کہ تم بچی نہیں، نہ ہی سعد اب بچہ رہا ہے۔ اس طرح کی بے تکلفی، بے حجابی کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ تمہارا اس کے ساتھ اتنا قریب ہونا مجھے بالکل پسند نہیں، جذباتی وابستگی ایک الگ چیز ہے، اس پہ مجھے اعتراض نہیں مگر یہ لیٹنا، چمٹنا..... میں ایسے الفاظ استعمال تو نہیں کرنا چاہتی مگر تم میرے اشاروں کنایوں کو سمجھ ہی نہیں پا رہیں۔ اب کیا یہ ٹھیک لگ رہا ہے اس کا تمہارے شانے پہ سر رکھ کے سونا۔ بہر حال وہ تمہارا نامحرم ہے۔''

سنجیدگی سے ان کا بیان سنتی ہانی آہستہ سے ہنس دی۔

''نامحرم؟..... دادی..... نامحرم اور یہ سعد..... یہ اتنا سا؟''

''میں نے کہہ دیا کہ سعد اب اتنا سا نہیں رہا۔'' عام حالات میں مجھے دادی کا یہ اعتراف بڑا خوش کن لگتا۔ مگر وہ جس طرح کہہ رہی تھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے بڑا ہونا کوئی جرم ہے جس کی پاداش میں مجھے ہانی سے دور رہنے کی تعزیر سنائی جانے والی ہو۔

''پلیز دادی! آپ تو کبھی ایسی باتیں نہیں کرتی تھیں۔'' اس کے لہجے میں بھی وہ گھبراہٹ تھی، جس نے ایکا ایکی مجھے گھیر لیا تھا۔

اس کے لہجے سے چھلکتی ناگواری اس بات کا ثبوت تھی کہ اسے بھی دادی کی یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔

''نہ میں اس کی معصومیت پہ شک کر رہی ہوں نہ تمہاری پاکیزہ نیت پر، یہ ایک اصولی

بات ہے اور یہ اصول میں نے یا تم نے وضع نہیں کیے۔ یقیناً ان میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ اگر سعد معصوم ہے تو اسے معصوم رہنے دو۔ اس کی کم عمری اور معصومیت کو کسی امتحان میں مت ڈالو۔''

''میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ رہیں۔'' اس نے نرمی سے میرا سر کھسکا کے تکیے پہ کیا۔ میں ذرا سا کسمسایا..... احتجاجاً۔

''ضروری نہیں کہ جو بات سمجھ میں آ جائے وہی مانی جائے۔'' یہ دادی کا کہنا تھا مگر میرا نظریہ مختلف تھا۔ ہانی کی فطرت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ دادی کے نظریے سے متفق نہ ہونے کے باوجود آرام سے ان کی بات مان گئی مگر میں تب تک کوئی بات نہ مانتا تھا جب تک مجھے یقین نہ آ جاتا کہ یہ بات ماننے میں میرا کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔

☆======☆======☆

ہنی نے مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کی اجازت کیا دی کہ مجھ پہ ایک اور در کھل گیا۔ پروین شاکر کی ''خوشبو'' دیر تک میرے اندر کو مہکاتی رہی۔

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اس کی

اس میں ایسا کیا تھا جو میں سمجھ نہ پایا۔

نہ شام ہے نہ گھنی رات ہے نہ پچھلا پہر
عجیب رنگ تیری چشم سرگیں سے ملیں

اس کی آنکھوں کی سرمئی سیاہی اور چہرے کی گلابیاں مجھ پہ کھل سی گئیں۔ وہ مجھے بہت حسین، بہت دلکش، بہت منفرد اور بہت اچھوتی سی لگنے لگی۔ اسے مسکراتا دیکھ کر میں خوش ہوتا..... اس کی اداسی پہ مجھے غصہ آنے لگتا۔ ہر اس چیز پہ جو اس کے غصے کا باعث ہو سکتی تھی۔ وہ میری تعریف کرتی تو اپنے آپ پہ فخر ہونے لگتا..... کسی بات پہ ٹوک دیتی تو ہفتوں خود سے شرمسار رہتا۔

میں نے جان لیا کہ میں اس سے پیار کرنے لگا ہوں۔

مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔

ہانیہ پیرزادہ سے..... جو مجھے اچھی تو تب بھی لگتی تھی، جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا، مگر ان سات سالوں میں وہ میرے اتنے قریب آ جائے گی اس کا اندازہ مجھے اس وقت نہ ہوا تھا۔ یہ محبت ہی تو ہے، یہ محبت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ مجھے پورا یقین تھا۔ میں..... سعد

رضوان پیرزادہ پندرہ برس کی عمر میں محبت کے بارے میں چند نظمیں پڑھ کے اور کچھ فلمیں دیکھ کر گویا محبت کی ساری فلاسفی سمجھنے کا دعویٰ کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے اس سے سچی محبت ہے۔

مجھے یقین تھا کہ وہ بھی ضرور مجھ سے محبت کرتی ہے مگر کسی فلم، کسی ڈرامے یا کسی افسانے میں کسی لڑکی نے خود محبت میں پہل کی ہے جو وہ کرتی؟

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ جیسے ہی میں اسے اپنے دل کی ساری بات بتاؤں گا وہ ایک خوشگوار سی حیرت کے ساتھ آنکھیں پٹ پٹا کے رہ جائے گی۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ہم دونوں کے ایک ہونے میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں سوائے میری کم عمری کے اور وقت گزرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ پتہ بھی نہیں چلے گا اور ایک کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا سال گزرے گا۔ میری ایجوکیشن کمپلیٹ ہو جائے گی..... اور نہ بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے..... بس زیادہ نہیں تو بیس، اکیس کا ہی ہو جاؤں تو پاپا سے کہہ دوں گا کہ ہنی سے میری شادی کروا دیں۔ یہ یقین بھی تھا کہ پاپا میری بات مان جائیں گے۔ زندگی کو سوچنا کتنا سہل ہے اور سوچ ہی سوچ میں زندگی بھی کتنی سہل لگتی ہے۔

☆======☆======☆

''ہانی! میری تو خواہش تھی کہ تمہارا رزلٹ آتے ہی یہ کام شروع کر دیتی، مگر تمہاری جاب کی ضد کے آگے تمہارے انکل ہار گئے۔ اب پریکٹیکل لائف میں آئے ہوئے بھی تمہیں ایک سال تو ہونے ہی والا ہے اور میرے خیال میں تمہارا یہ شوق خاصی حد تک پورا ہو چکا ہوگا، اس لئے میرا اور تمہارے انکل کا فیصلہ ہے کہ اب تمہاری شادی کے سلسلے میں سنجیدگی سے کچھ سوچا جائے۔ ان کے ایک دوست نے اپنے بیٹے کے لئے بات کی ہے۔ اچھا لڑکا ہے، تمہاری طرح انجینئر ہے، اپنی کمپنی ہے، ویل نون فیملی، ویل میچڈ، گڈ لکنگ، تم پہلے اسے اور اس کی فیملی سے مل لو اور سوچ سمجھ کر اپنی رائے دے دینا، تاکہ ہم بات آگے بڑھائیں۔''

اس روز چھٹی کی وجہ سے ہم سب ہی ناشتے پہ اکٹھے تھے جب ماما نے ڈبل روٹی پہ جیم لگاتے ہوئے یہ تفصیلی بیان ایک ہی سانس میں دہرا دیا۔ اگرچہ ماما کبھی ہانی کے ساتھ ایک مشفق ماں تو درکنار ایک دوست نما مہربان آنٹی کی طرح پیش نہیں آئیں مگر ان کا رویہ بہت درشت یا لئے دیئے رہنے والا بھی نہیں تھا، اس کے باوجود وہ نہ جانے کیوں ماما سے خائف رہا کرتی۔ ان سے بحث کرنے یا سوال کرنے کا تو اس نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ جاب کرنے کی خواہش بھی اس نے پاپا سے ہی بیان کی تھی۔ اب بھی وہ خاموشی سے سر جھکائے ان کو سنتی رہی۔

میرے اندر طیش کا ایک اُبال اُٹھا میں چمچ پلیٹ میں پٹخ کر، چیئر ٹھوکر کے ساتھ پیچھے گھسیٹنے کے بعد تیز قدموں کے ساتھ باہر نکلنے لگا۔ سب نے مجھے حیرت کے ساتھ دیکھا۔ میری پشت سے پاپا کی آواز آئی۔ وہ مجھ سے اس بدتمیزی کی وجہ پوچھ رہے تھے۔

''آپ سب کچھ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں پاپا؟ آپ نے ماما سے پوچھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟'' میرے جوابی سوال پہ وہ حیران ہوئے۔

''کیا مطلب؟ تمہاری ماما نے تم سے تو کچھ نہیں کہا، وہ ہانی سے بات کر رہی تھیں۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ کیوں کر رہی تھیں وہ یہ بات؟ ہانی کی مرضی کہ وہ جاب کرے یا کچھ اور..... ایک سال کرے یا دس سال۔ اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ ماما کس طرح کر سکتی ہیں؟'' ماما کے تو شاید وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس طرح کا کوئی واضح اعتراض کر سکتا ہوں۔ وہ گنگ سی ہو گئیں۔ دادی کے چہرے پہ بھی ناگواری تھی اور ہانی یوں ہی ابھی ابھی سی بیٹھی تھی، کچھ کچھ خوفزدہ سی۔

''کم آن سعد! تمہاری ماما نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ ظاہر ہے آخری فیصلہ ہانی کا ہوگا۔ تم نے سنا نہیں کہ انہوں نے اسے ارسلان سے اور اس کی فیملی سے ملنے کا کہا ہے۔''

''کیا کہا ہے ماما نے؟'' میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

''یہی کہ، وہ سوچ سمجھ لے اور جواب دے تاکہ بات آگے بڑھائی جا سکے یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ ہر حال میں جواب ہاں میں ہی دینا ہے۔ اسی طرح تو بات آگے بڑھ سکے گی۔ وہ یہ بھی تو کہہ سکتی تھیں کہ ہنی کے جواب کے بعد فیصلہ ہوگا کہ بات آگے بڑھائی جائے یا ختم کی جائے۔''

''ختم کرو بہت ہو گیا۔'' ماما کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''سعد رضوان، تم اپنی حد پار کر رہے ہو۔'' انہوں نے مجھ سے کہا، لیکن شعلہ بار نگاہیں ہانی پہ مرکوز تھیں جنہیں محسوس کر کے اس کے ہاتھ میں تھما چائے کا کپ ہلکا سا لرز گیا۔ میں اس ''عزت افزائی'' پہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گیا، لیکن میرے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے وہ ساری بحث مجھے بآسانی سنائی دے رہی تھی۔ اب ماما، دادی کی حمایت حاصل کرنے کے لئے دلائل دے رہی تھیں۔

''کیا غلط کیا میں نے؟ کیا ہانی ہماری ذمہ داری نہیں اور کیا بھائی زندہ ہوتیں تو وہ ایسا کچھ نہ کرتیں، بلکہ شاید اب تک کر بھی چکی ہوتیں، ہماری فیملی میں کب لڑکیاں اس طرح دوسروں کی ملازمت کرتی پھرتی ہیں۔ اسے رضوان نے کہا بھی، کہ وہ کام کرنا چاہتی ہے تو ان

کی فرم جوائن کرلے لیکن ہانی کو ضد سوار تھی، اپنے بل بوتے پہ کچھ کرنے کی، یہ سوچ کر ہم دونوں نے اجازت دے دی کہ اس کے دل میں خیال نہ آئے کہ اس کی خواہشات کا احترام نہیں کیا جاتا۔ اب بھی اتنا اچھا پروپوزل، میں چاہتی تو آنکھ بند کرکے ہاں کردیتی مگر میں نے پوری آزادی دی کہ وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو مگر اس میں ہانی کو قصوروار کیسے ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اس نے تو کچھ نہیں کہا جو تم اس پہ بگڑ رہی ہو یا گلہ کررہی ہو۔" دادی کو پسند نہیں آیا کہ وہ ان کی لاڈلی پوتی پہ خفا ہوں۔

"تو آپ کا خیال ہے سعد یہ ساری بکواس بلا وجہ کرکے گیا ہے۔" ان کے کہنے پہ میں چونک گیا۔

"بھلا ماما کو کیسے پتا چلا کہ....."

راز کھل جانے کے احساس سے میں خوفزدہ نہیں ہوا بلکہ سبک سا ہوگیا لیکن ماما..... وہ تو کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

"ہانی نے ہمیشہ اپنے اور میرے درمیان فاصلے رکھے ہیں۔ میں سعد کی ماں ہوں لیکن جذباتی طور پہ وہ اپنے پاپا کے زیادہ قریب رہا ہے، لیکن جب ہانی اس گھر میں آئی تو مجھے لگا کہ میری زندگی میں ایک بیٹی کی کمی پوری ہوجائے گی مگر اس نے کبھی مجھے ماں تو کیا..... کچھ بھی نہیں سمجھا۔ کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا..... کوئی فرمائش، کوئی ضرورت، کوئی شکایت..... کچھ بھی چاہئے ہوتا اپنے انکل سے کہتی، اپنی دادی سے کہتی جیسے میں..... میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کی کچھ نہیں لگتی۔ یہ صرف اپنے چچا کے گھر میں رہ رہی ہے اسے کچھ بھی چاہئے ہوتا، کوئی بھی بات منوانا ہوتی یہ صرف رضوان سے کہتی اور اب بھی یہی ہوا ہے۔ اگر اسے اس جگہ شادی نہیں کرنی، یا..... یا اس کی کوئی اور مرضی ہے تو اسے مجھ سے بات کرنی چاہئے تھی، مجھ پہ اعتماد کرنا چاہئے تھا۔ آخر میں اس کی ماں کی جگہ ہوں لیکن اس نے سعد کے ذریعے یہ بات پہنچائی ہے اور بہت غلط طریقے سے پہنچائی۔ وہ ابھی بچہ ہے اور اسے ان معاملات میں گھسیٹ کر ہانی..... تم نے اچھا نہیں کیا۔"

ماما کی اتنی طویل بات میں میرے لئے بہت سی تکلیف دہ باتیں تھیں۔ ایک نہیں..... بہت سی۔

میں بے چین ہوکر اُٹھا اور ادھ کھلے دروازے سے ڈائننگ ٹیبل کا منظر دیکھنے لگا۔ ہانی اپنی کرسی سے اُٹھ کر ماما کے گلے لگ گئی تھی اس نے ان کے پیچھے سے اپنے بازو ان کی گردن

میں حمائل کررکھے تھے اور اپنا گال ان کے گال سے ملائے آنسو بہا رہی تھی البتہ اس کی آنکھوں سے کہیں نہ لگ رہا تھا کہ یہ آنسو کسی تکلیف یا رنج کی وجہ سے نکل رہے تھے بلکہ اس وقت ان آنکھوں سے ایک الوہی چمک ظاہر ہورہی تھی۔ وہ مسرت سے کپکپاتے لہجے میں ماما کو یقین دلا رہی تھی۔

"آنٹی! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے کبھی اس فاصلے کو دانستہ برقرار رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس کوتاہی کا اعتراف ضرور کروں گی کہ اس فاصلے کو پاٹنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی۔ چاہنے کے باوجود بھی اور اس کی وجہ صرف میری جھجک تھی اور آپ سے کچھ کہنے، کسی فرمائش کے کرنے کی نوبت ہی کبھی نہیں آئی، آپ نے میرے بغیر کہے میری ہر ضرورت کا دھیان رکھا بالکل ایسے جیسے کوئی ماں رکھتی ہے۔ اسی طرح شکایت کرنے والی کوئی بات ہوتی تو کرتی، رہا سوال جاب کے مسئلے پہ آپ کے بجائے انکل سے بات کرنے کا معاملہ تو دادی کا کہنا تھا کہ شاید انکل کو میرے جاب کرنے پہ اعتراض ہو اسی لئے میں نے ان سے اپنی خواہش ظاہر کی اور پلیز آنٹی! آئی سوئیر، سعد سے میری اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگر مجھے اس سلسلے میں کوئی بات کرنا ہوئی تو میں دادی یا آپ سے کروں گی۔ میں نے فی الحال شادی کے بارے میں کچھ سوچا تک نہیں تو پسند ناپسند کا سوال تو بعد میں اُٹھتا ہے۔ سعد تو بس....."

"لیکن اب وہ اتنا بھی چھوٹا نہیں رہا کہ بات کو سمجھ نہ سکے۔" ماما نے اس کے گال تھپتھپا کے اپنی ناراضی ختم ہونے کا سگنل دیا اور پھر سے مجھے موضوع بحث بنالیا۔

"آج نہیں تو کل، یہ کام تو ہونا ہی ہے۔ کیا اس کی ضد کی خاطر تمہیں گھر بٹھائے رکھیں گے کہ بھئی، سعد رضوان کی مرضی ہے، وہ ہانی کو دور نہیں دیکھ سکتا۔"

"افوہ، ماما کو اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی، ویسے بہت قابل بنتی ہیں۔ کیا حرج ہے اس میں اگر وہ میری خاطر ہانی کو گھر میں رکھ لیں، اس گھر میں..... ہمیشہ کے لئے..... میری خاطر۔"

میں سوچتا رہا اور سنتا رہا، سنتا رہا اور سوچتا رہا۔

"آنٹی! آپ کی چائے بالکل ٹھنڈی ہوگئی ہے۔" ہانی نے اس موضوع کو ختم کرنے میں پہل کی اور وہ کہا جس کی میں اس سے توقع کررہا تھا۔

"یہ چائے لیجئے اور بس اب یہ فکریں چھوڑ دیں۔ میری جانب سے پلیز، پلیز کسی قسم کا کوئی اندیشہ ذہن میں نہ لائیں جو آپ بہتر سمجھتی ہیں میرے لئے وہی کیجئے اور سعد کی بات چھوڑیں، وہ بہت جذباتی ہے اور کچھ نہیں۔"

"نہیں ہانی! وہ سرکش اور منہ پھٹ تو شروع سے ہی تھا اور اس کا آج کا رویہ دیکھ کر

مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ میں نے اس کی ذمہ داری سراسر رضوان کو سونپ کر سخت غلطی کی ہے۔ رضوان نے اسے بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اب اماں! آپ ہی بتائیے اس کی عمر ہے گھر کے ایسے معاملات میں دخل دینے کی؟ ماں سے جواب طلبی کرنے کی؟ وہ اپنی حد سے آگے بڑھ رہا ہے۔"

"تم کچھ زیادہ ہی ری ایکٹ کر رہی ہو۔ سعد، عمر کے اس حصے میں ہے جہاں اپنے بڑے ہونے کا احساس دوسروں کی نسبت زیادہ شدت سے ہونے لگتا ہے۔ وہ صرف اپنے ہونے کا احساس دلانا چاہ رہا تھا، خود کو اس گھر کے اہم معاملات میں شامل کر کے اپنی اہمیت....."

"رضوان! تم بے جا حمایت مت کرو۔" دادی نے بہو کی سائیڈ لی۔

"وہ اس گھر کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی اہمیت کب تسلیم نہیں کی گئی لیکن اس طرح کا رویہ..... یہ واقعی مناسب نہیں آگے چل کر یہ بات خود تمہارے لئے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوگی۔"

میں نے ایک زوردار دھماکے کے ساتھ ادھ کھلا دروازہ بند کیا۔ اب میں اور کچھ نہیں سننا چاہتا تھا۔

جس بات کا ڈر تھا، وہی ہوا۔ ہانی، ماما کے جذباتی بیان سے ٹریپ ہوگئی۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھا اور اب صرف ماما کے اس بے معنی سے اندیشے کو دھونے کے لئے اس نے راضی خوشی اپنے بارے میں سارے فیصلے کرنے کے اختیارات انہیں سونپ دیئے اور ماما..... وہ اس اختیار کے ہاتھ آتے ہی پُر جوش ہو کر اپنے ارادوں کو کس تیزی سے پایہ تکمیل تک پہنچائیں گی، یہ میں جانتا تھا اس لئے میں روٹھ گیا، ماما سے..... ہانی سے اور اپنے آپ سے۔

☆======☆======☆

یہ ناراضی شاید بہت دن تک چلتی..... یہ بھی ہو سکتا تھا، وہ مجھے منا لیتی مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ مجھے خود یہ ناراضی ترک کر کے اس کی طرف بڑھنا پڑا۔

اس نے دادی کی وفات کا ایسا اثر لیا تھا جتنا شاید اپنی ماما کی ڈیتھ کا بھی نہ لیا ہو۔

میرے نزدیک تو یہ ایک معمول کی بات تھی جیسے کوئی بھی چیز ایک مدت پوری کرنے کے بعد ختم تو ہو ہی جاتی ہے ایسے ہی ایک نہ ایک روز دادی نے بھی تو..... مگر ہانی کے لئے یہ واقعی ایک حادثہ تھا، ایک سانحہ تھا۔ ایک مہینہ ہونے والا تھا مگر وہ تھی کہ اس صدمے سے باہر نہ آ رہی تھی۔ اس کی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر خواہ مخواہ میری پلکوں پہ ریت چبھنے لگتی۔ اس کے

کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے اُبھرتی سسکیاں میرے حلق میں پھر سے وہی کانٹے اُگانے لگتیں۔

کچھ دن تو میں اسے ایسے ہی کھانے پینے ہر چیز سے بے نیاز، روتا دیکھتا رہا پھر نہ رہ سکا۔ چالیسویں سے پانچ روز پہلے ہی اس کا جنم دن آ گیا۔ وہ ہمیشہ سے اس دن کا آغاز دادی کی دعاؤں سے کرنے کی عادی تھی۔ یہ دن اس کے رستے ہوئے زخم کو نئے سرے سے اُدھیڑنے کا باعث بنا تھا۔ اب ماما نے خود میری مدد طلب کی۔

"سعد! تم کیسے دوست ہو اتنے دنوں سے اسے حال سے بے حال دیکھ رہے ہو۔ جاؤ، اس کے پاس بیٹھو، اِدھر اُدھر کی باتوں سے اس کا دھیان بٹاؤ۔"

"دادی کے جانے کا ایک فائدہ ہوا۔"

رسمی باتیں تو مجھے کرنا آتی نہیں تھیں۔

لیکن کم از کم مجھے یہ بھی نہیں کہنا چاہئے تھا، کیا پتا وہ کچھ اُٹھا کے میرے سر پہ مار دیتی۔ اب بھی بات کہہ چکنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کس قدر نامعقول فقرہ ادا کر چکا ہوں اور وہ بھی سخت بے موقع، جب کہ درحقیقت میں کوئی زیادہ غیر مناسب بات کرنے بھی نہیں جا رہا تھا۔

"دیکھو نا، دادی کی ڈیتھ سے اب ماما کچھ عرصہ کے لئے تمہاری شادی کا شور مچانا بند کر دیں گی۔" میں نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی۔ اس کے سوکھے لبوں پہ ایک بھولی بسری سی مسکراہٹ آئی اور لبوں کی اجاڑ چوکھٹ ہولے سے چھو کر واپس پلٹ گئی، اس نے سر جھٹکا۔

"تم بھی نا سعد! ایک بات کو سر پہ سوار کر لیتے ہو۔" اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

"میں یا تم؟ پتا ہے پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے تمہیں یوں کمرے میں بیٹھ کے روتے ہوئے۔ اس ایک مہینے میں تم نہ آفس گئی ہو، نہ کچن میں جا کر صادقہ کی خبر لی ہے جو پھر سے ڈھیاں بھر بھر مرچیں انڈیلنا شروع ہو گئی ہے اور کوکنگ آئل بھی اس نے لیٹروں کے حساب سے ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ چار روز پہلے بھی ماما نے زبردستی تمہیں نہانے پہ مجبور کیا تھا اور پرسوں تم نے آخری بار بال برش کئے تھے، ہے نا؟" میں نے پورا پورا حساب لگایا۔

"ارے تم تو تھ برش تو کر رہی ہو نا..... یا اسے بھی ہفتہ گزر گیا ہے..... دکھاؤ....." میں راسا آگے ہوا اور پھر پورا داؤ کاری کرتے ہوئے گھبرا کے پیچھے ہوا۔

"اوں، ہوں گندی بچی..... کم از کم دانت تو صاف کرو۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "بدتمیز۔"

اس روز اس میں اتنی تبدیلی آئی کہ اس نے خود سے لاپرواہی برتنا چھوڑ دیا۔ اتنے دنوں

بعد اس کا آفس میں پہلا دن مجھے بہت کٹھن لگا۔ وہ لوٹی تو میں لان میں ریکٹ لئے اسی کے انتظار میں تھا۔ ''اوہ پلیز، سعد! آج نہیں۔ بہت تھک گئی ہوں۔'' میرا موڈ بھانپ کر اس نے منت کی۔ میں نے نزدیک رکھی ٹرالی آگے گھسیٹی۔

''چائے حاضر ہے مائی کوئین! ہیجیے اور تھکن مٹایئے، ساتھ میں قیمے والے سموسے، پیزا اور ڈونٹس بے فکر ہو کر کھایئے گا جناب۔ ان میں سے کسی پہ بھی صادقہ کا ہاتھ نہیں لگا، یہ میں تمہارے لئے اسپیشلی خود لے کر آیا ہوں۔''

''تھینکس یار! آج تو میں لنچ بھی نہیں لے سکی۔'' وہ وہیں بیٹھ گئی اور چائے اور اسنیکس کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔

''تم تو واقعی بہت گندی بچی ہو، ہاتھ منہ تک نہیں دھویا۔''

''میں آج سائیٹ پہ نہیں گئی۔ آفس ورک تھا اور آف ہونے کے بعد میں فریش ہو کے وین میں بیٹھی تھی۔''

''کل کا کیا پروگرام ہے؟''

''کل کا.....؟ کل شاید سائیٹ پہ.....'' وہ رک کر سوچنے لگی۔

''ارے ہاں، کل تو آف ڈے ہے۔ اتنے دن سے روٹین ڈسٹرب تھی اس لئے چھٹی والے دن کا بھی اندازہ نہ ہوا۔''

''پتا ہے، ہم پورے چار ماہ سے جلو نہیں گئے۔ پہلے میرے ایگزام تھے، پھر.....کل چلیں؟'' میں پروگرام پہلے ہی بنائے بیٹھا تھا۔ اس نے بہانہ بنانا بھی چاہا، مگر میرے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

اس دن مجھے اس پہلے دن کی یاد شدت سے آئی، جب پہلی بار میں اس کے بہت مجبور کرنے پہ یہاں آنے پہ آمادہ ہوا تھا۔ کل وہ میری انگلی تھام کے مجھے گھما رہی تھی اور آج وہی سب کچھ میں کر رہا تھا۔ اس کے پسندیدہ گانوں کے کیسٹس میں نے رکھے تھے۔ دسمبر کا آخیر تھا۔ دھند بھری اس صبح کو پکنک پہ نکلنے کا فیصلہ عجیب سا تھا۔ مگر میں اس کی ''انگلی تھامنے'' کے جوش میں موسم کی شدت تک بھلائے بیٹھا تھا۔ آج مجھے اپنا آپ بہت بڑا، بہت ذمہ دار سا لگ رہا تھا اور وہ.....وہ ایک چھوٹی سی راستہ بھٹکی اداس سی شہزادی، جس کا دل بہلانے کی ذمہ داری مجھ پہ عائد کی گئی ہو۔ اس دن میں نے ''بڑے پن'' کا ہرا احساس شدت سے محسوس کیا۔ کچھ یہ فخر میرا سینہ چوڑا کرنے کو کافی تھا کہ اسے اس سوگوار کیفیت سے باہر لانے میں سب ناکام رہے، سوائے میرے یعنی وہ میرا کہا مانتی ہے۔ میرا اتنا اثر ہے اس پہ، میں وقتاً

فوقتاً اس احساس کو اور اُجاگر کر رہا تھا، کسی نہ کسی طریقے سے۔

''صرف شال، اس قدر سردی ہے، چلو اندر، پہلے کوئی سویٹر پہن کے آؤ اور سوکس بھی۔'' یا پھر۔

''بھوک تو نہیں لگی، یہ پکوڑے میں نے خود فرائی کئے ہیں، کھاؤ تم آج کل اپنی ڈائٹ پہ بالکل توجہ نہیں دے رہیں۔''

''کافی لونگی، سردی خاصی ہے۔''

''بونگ پہ چلیں.....؟ اگر موڈ نہیں ہے تو رہنے دو۔'' وغیرہ وغیرہ اور وہ بھی میری ہر بات بغیر چوں و چرا کے مان رہی تھی، یعنی کہ بالفاظ دیگر اس نے میرے بڑے پن کو تسلیم کر لیا تھا۔ میں کچھ اور نڈر ہو گیا۔

''تو، تم ایسے ہی کہہ رہی تھیں کہ آج کل کون پکنک پہ جاتا ہے۔ اتنی سردی میں لوگ ہیٹر کے آگے سے اُٹھنا تک گوارا نہیں کرتے وغیرہ، یہ دیکھو، یہ جو اتنے سارے کمبل آئے بیٹھے ہیں یہ کیا پاگل ہیں.....یا ہیٹر اپنے ساتھ اُٹھا کے لائے ہوئے ہیں۔ مس ہنی! جنہیں آنا ہوتا ہے وہ موسم نہیں دیکھتے، نہ بارش، نہ طوفان نہ سردی نہ گرمی.....بس آجاتے ہیں.....ملنے۔'' میں معنی خیز انداز میں مسکرایا تو وہ چونکی۔ ایک نظر اس نے بھی اردگرد بیٹھے کپلز پہ ڈالی اور میری بات کا مطلب بھانپ گئی۔ اس کی خاموشی سے مجھے اور شہ ملی۔

''ہنی! ہم بھی درخت پہ اپنا نام لکھیں۔'' ایک لڑکے کو درخت کے تنے پہ نام کھودتے دیکھ کر میں نے کہا تو وہ زور سے ہنس پڑی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں، دل کی شکل بھی بنانا اور اس میں ایک عدد تیر گھونپنا تو ہرگز مت بھولنا اور ساتھ میں کوئی دھواں دھار شعر بھی ہو تو کیا ہی کہنے۔''

''تم میری ہر بات کو مذاق میں کیوں اُڑاتی ہو؟''

''کمال ہے۔'' وہ میرے غصے کو حیرت سے دیکھنے لگی۔

''تم مذاق کرو تو ٹھیک ہے اور اگر میں جواباً کچھ کہہ دوں تو ناراض۔''

''میں نے مذاق نہیں کیا تھا، میں سیریس ہوں۔ میں واقعی اس درخت پہ اپنا اور تمہارا نام لکھنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ.....کہ شادی.....شادی کے بعد جب کبھی تم سے دیکھو گی تو تمہیں کیسا لگے گا۔''

بہت ہمت کر کے میں نے اتنا کہا اور رک کے اس کا ردِعمل دیکھنے لگا۔ میرا دل لمحے بھر کے لئے سکڑ سا گیا تھا نہ جانے وہ کیا کہہ دے۔ مگر وہ ویسے ہی ڈھیلے قدموں کے ساتھ گھاس

پہ چلتی، پیر کی ٹھوکر سے ایک پتھر کو مسلسل آگے دھکیلتی لاپرواہی سے کہنے لگی۔

''اس روز تو بڑا شکر ادا کر رہے تھے کہ کسی بہانے ماما کی توجہ تو ہٹی میری شادی کی فکر سے اور اب خود ذکر لے کر بیٹھ گئے اور اس بات کو چھوڑو کہ اسے دیکھ کر مجھے کیسا لگے گا، یہ سوچو کہ میرے شوہر کو کیسا لگے گا، اپنی زوجہ محترمہ کا نام ایک دوسرے نام کے ساتھ درخت پہ گُندہ دیکھ کر۔ کیوں میرا مستقبل مخدوش کرتے ہو مسٹر سعد رضوان پیرزادہ۔''

''ایسی کی تیسی تمہارے شوہر کی اور اس کے سوچنے کی۔'' میں نے دل ہی دل میں خوب گالیاں دیں۔

''آج تو دھوپ بھی نہیں نکلی۔ خاصی سردی ہو رہی ہے، چلو واپس چلتے ہیں۔''

''مگر ابھی تو بوٹنگ بھی نہیں کی۔''

''پاگل ہوئے ہو، میری پہلے ہی قلفی جم رہی ہے، تم جھیل پہ جانے کی سوچ رہے ہو۔ میرا خیال ہے آج تو کوئی بھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا۔''

میں پہلے ہی اس کی لاپرواہی پہ جل بھن رہا تھا کہ وہ میری کسی بھی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی، اب اس طرح اپنی چلانے پہ مزید ناراض ہو گیا۔ واپس جانے پر رضامند تو ہو گیا مگر اسی سوجے ہوئے منہ کے ساتھ۔ وہ راستے بھر مجھے منانے کے لئے جتن کرتی رہی۔

''ایک تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلتا، کب کس بات پہ ناراض ہو جاؤ اور مجھ سے تو تمہیں دشمنی ہے اور کسی سے روٹھو نہ روٹھو، مجھے ہفتے میں دو بار یہ نخرے ضرور دکھانے ہوتے ہیں۔''

آخر کار بارمان کے اس نے کہا..... جب کار گیٹ سے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

''تم سے دشمنی نہیں، محبت ہے۔'' میں اچانک کہہ اُٹھا۔

وادی کے جانے کے بعد میں جس انداز میں اس کے قریب آیا تھا، اس سے میرے اندر اعتماد پہلے کے مقابلے میں سوگنا بڑھ چکا تھا۔ وہ بکھری ہوئی تھی، شکستہ تھی اور میں نے اسے سنبھالا تھا، بہلایا تھا، یہ فخر مجھے مغرور و بے باک کر گیا، اس لئے میں اتنی بڑی بات اسے کہہ بیٹھا۔

''جن سے محبت ہو، ناراضی بھی ان سے ہی ہوتی ہے۔''

''اور یہ جو میں گھنٹے بھر سے تمہاری منتیں کرتی پھر رہی ہوں اور آج سے نہیں بلکہ کئی سالوں سے تمہاری ہر ناراضی پر کرتی آئی ہوں یہ بھی صرف اور صرف میری محبت ہے۔'' اس نے کار سے اُترتے ہوئے کہا۔

''جتنی محبت تم مجھ سے کرتے ہو، اس سے کئی گنا زیادہ میں تم سے کرتی ہوں..... ارے آنٹی! آپ گھر پہ.....؟ آپ کو تو آج آنٹی شاہ کے ہاں جانا تھا۔'' میرے وجود کو پر لگا کر وہ

خود ماما کی طرف متوجہ ہو گئی جو لان میں بیٹھی تھیں۔

☆======☆======☆

میری آنکھوں میں چھپی اک کمی سی رہ گئی
میں نے جب بھی بات کی اک کمی سی رہ گئی
میں تو کچھ ایسا ہی تھا، جو کہا بے ربط تھا
لیکن اس کے ساتھ بھی اک کمی سی رہ گئی
کیا سنا اور کیا کہا، کیا پڑھا اور کیا لکھا
کچھ کہی کچھ اَن کہی، اک کمی سی رہ گئی
اس کے میرے درمیان اک تعلق کا گمان
بن گیا جب دل لگی، اک کمی سی رہ گئی

اور کمی تو واقعی رہ گئی تھی، کوئی کمی..... کہیں نہ کہیں۔ میرے سمجھانے میں..... یا اس کے سمجھنے میں۔ یا میری محبت میں..... یا اس کے ضبط میں کچھ تو تھا۔ اگر میں غیر جانبداری سے تجزیہ کرنے بیٹھوں تو تب بھی جتنا قصور مجھے اپنا لگتا ہے، اتنا ہی اس کا بھی نظر آتا ہے۔

چلو ٹھیک تھا، مجھے محبت کا قرینہ نہ آتا تھا، مجھے اظہار کا سلیقہ نہ تھا۔ میری جسارت تو دیکھو کہ خود سے آٹھ برس بڑی لڑکی سے محبت کر بیٹھا جو میرے اپنے ہی تایا کی بیٹی ہے۔ میری حماقت تو دیکھو، اس کے التفات کو محبت سمجھ بیٹھا۔ اس کی عنایت کو اللفت جان لیا اور میری جلد بازی یہ تھی کہ میں نے محبت کو پنپنے کا موقع دیئے بغیر کچا پکا ہی اتار کر اس کے سامنے دھر دیا۔

اور پھر ان ہی دنوں میرا رزلٹ آ گیا۔ میں نے گیارہ اے لے کر اپنے سکول میں ریکارڈ قائم کیا تھا۔ البتہ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کا سوچ لیا اور ہنی کو ڈنر آفر کیا۔

''یار! کارنامہ تو تم نے ایسا کیا ہے کہ مجھے، تمہیں ڈنر دینا چاہئے لیکن خیر..... وہ پھر کبھی سہی، تمہاری ٹریٹ بھی چھوڑنی نہیں چاہئے لیکن کیا خیال ہے ڈنر کے بجائے کل کا لنچ نہ رکھ لیں، تم مجھے ویر سے آفس سے پک کر لینا۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ میں ڈنر برائے نام ہی لیتی ہوں، صرف دودھ یا سوپ۔ اب ایسے سستے میں تو تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔ تم پہلی بار اپنی جیب ڈھیلی کر رہے ہو تو اس خوشی میں کل کا ناشتہ بھی گول کر دوں گی تاکہ لنچ زبردست رہے۔''

میرے لئے یہ بھی بہت تھا کہ وہ میرے ساتھ لنچ کرنے پہ تیار ہو گئی ہے۔ اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں تھا اس پہ اپنے جذبوں کو آشکار کرنے کا اور اوپن ہونے کے بعد مجھے یہ بھی

لگنے لگا تھا کہ میں نے اب اپنے بچپن کو مکمل طور پہ خیر باد کہہ دیا ہے، یہی مناسب وقت ہے۔

وہ رات مجھ پہ بہت بھاری گزری ایک ہیجان تھا جس نے میرے پورے وجود کو اپنے قبضے میں لے رکھا تھا، ایک سنسنی تھی جو میری رگوں میں متلاطم تھی، ایک بے چینی تھی جو میرے حواسوں پہ چھائی ہوئی تھی۔ میں کبھی اُٹھتا تھا..... کبھی بیٹھتا تھا۔ کبھی باہر نکل کر اس کے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑا ہو جاتا، کسی آہٹ کے..... کسی روشنی کے انتظار میں..... مگر وہ جو رات دیر تک پڑھنے کی عادت تھی، اب اس جوانیں کرنے کے بعد رات کو جلدی سونے لگی تھی۔

کبھی میں ٹی وی آن کر لیتا، کبھی ڈیک پہ مدھم سُروں میں کوئی گانا سننے لگتا۔

میں رائٹنگ ٹیبل پہ جا بیٹھا۔ مجھے ڈائری لکھنے کی عادت نہیں تھی نہ ہی میرے پاس کوئی ڈائری تھی۔ میں وہیں رکھے رائٹنگ پیڈ پہ اپنے دل کا غبار نکالنے لگا۔ میں نے سب لکھ ڈالا۔ جو میں محسوس کر رہا تھا۔ جو میرا دل چاہ رہا تھا..... سب کچھ..... ایسا کرنے کے بعد مجھے خود میں ذرا سنبھلنے کے آثار نظر آئے۔ میں نے گھڑی دیکھی، پونے پانچ ہو رہے تھے۔ میں نیند سے بے حال ہو کر بیڈ پر گرا اور سو گیا۔

ساڑھے گیارہ کے قریب جب میں بیدار ہوا تھا تو صرف ایک دھن سوار تھی کہ مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ہنی کے آفس پہنچنا ہے، وقت کم تھا اور تیاری زیادہ۔ ابھی تو مجھے راستے سے اس کے لئے گفٹ اور بوکے بھی لینا تھا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر میں افراتفری میں تیار ہو کے گھر سے نکل گیا۔ ایک گھنٹہ شاپنگ میں صرف ہوا۔ سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ کیا لوں۔ ہر چیز سے نظر پھسلتی پھسلتی بالآخر ایک رنگ پہ جا ٹھہری۔ پلاٹینم کی وہ بیش قیمت انگوٹھی صرف ایک ننھے سے ڈائمنڈ سے سجی بے انتہا خوبصورت لگ رہی تھی مگر میں اسے خرید نہیں سکتا تھا۔ حسرت سے اسے دیکھتے ہوئے آخرکار میں نے ایک تحفہ پسند کر ہی لیا۔ یہ ایک رسٹ واچ تھی، بے حد نازک سی، سلور کلر کی جو بے شک اس رنگ جتنی قیمتی تو نہ تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ نہ صرف میری اس ماہ کی پوری پاکٹ منی نکل گئی بلکہ پچھلے کچھ عرصے سے کی گئی بچت اور کل رزلٹ کی خوشی میں پاپا کی طرف سے ملی رقم بھی صرف ہو گئی۔ اس کے باوجود مجھے انگوٹھی کے نہ لینے کا ملال تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ جب بھی میرے پاس اتنی رقم ہوئی میں یہ رنگ ضرور لوں گا۔

ارمانی کے سوٹ میں، ہاتھ میں سُرخ گلابوں کا بوکے تھامے، جیب میں خوبصورت پیکنگ میں رکھی رسٹ واچ لئے، میں اس کے آفس کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا اور مجھے سخت مایوسی ہوئی اسے دیکھ کر، وہ عام سے حلیے میں تھی۔ یوں تو وہ خوش ذوق بھی تھی اور خوش لباس بھی مگر آفس جانے کے لئے پتہ نہیں کیوں اس نے مخصوص طرز کے ڈریسز تیار کروا

رکھے تھے۔ اس وقت بھی وہ ہلکے سبز رنگ کے پلین مرینہ کے سوٹ میں تھی، ہلکے سبز رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی جس پہ بھوری اور سرمئی دھاریاں تھیں، براؤن لیدر کا شولڈر بیگ اور ویسا ہی بدھنا سا بند جوتا۔ وہ مجھے ایسے بھی پسند تھی لیکن آج کے دن کے لئے میں نے پتہ نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ رات میرے ہر تصور میں وہ دھنک رنگ پیراھن اوڑھ کے آتی رہی تھی۔

سری دیوی کی طرح شفون کی سفید ساڑھی کا نہیں پلو لہراتے ہوئے۔

مادھوری کی طرح جھلمل شرارے کی کرنیں بکھراتے ہوئے.....

سنڈریلا کی طرح جالی کی میکسی کو ناز سے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے اُٹھا کر شیشے کی سینڈل میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتے ہوئے۔

سنو وائٹ کی طرح سیب سے رخساروں پہ گلاب کی کلیاں سہلاتے ہوئے۔

اور وہ..... کیا تھا جو وہ آج مجھ سے ملنے کی خاطر ذرا سا اہتمام کر لیتی۔

بال ہی کھلے چھوڑ لیتی جس کی میں اکثر فرمائش کیا کرتا تھا۔

"واؤ، سعد رضوان پیرزادہ! آپ کہاں سے ہو کر آ رہے ہیں اور کہاں کا ارادہ ہے؟"

اس نے میری تیاریوں کو سر سے پیر تک دیکھ کر پوچھا۔

"میں گھر سے ہی آ رہا ہوں اور کیا بھول گئیں، آج ہمیں اکٹھے لنچ بھی کرنا ہے۔"

"بھولتی کیوں؟ بس ذرا تمہاری سج دھج دیکھ کر مشکوک ہو گئی تھی کہ شاید تمہارا کہیں اور کا بھی پروگرام ہو۔" وہ آگے بڑھی اور ڈرائیونگ سیٹ کو خالی پا کر گھوم کے سوال کیا۔

"ڈرائیو نہیں آیا؟ تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ ابھی تم ڈرائیونگ۔" اس نے اتنا ہی کہا اور میری اکتاہٹ بھری خود ساختہ لاپرواہی کو دیکھ کر مزید لیکچر دینے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے ہاتھ آگے کیا۔

"لاؤ چابی، میں ڈرائیو کرتی ہوں۔"

"کیوں، کیا میری ڈرائیونگ اتنی بُری ہے۔" میری غیرت پہ کاری تازیانہ لگا۔

"ڈرائیونگ نہیں، تمہاری عادتیں بُری ہیں۔" میرے شرافت سے چابی نہ دینے پر اس نے خود ہی جھپٹ لی۔

"کیوں آج کے اہم دن میں رنگ میں بھنگ ڈالنے والی بات کرتے ہو۔ ہم تمہاری کامیابی کو سلیبریٹ کرنے جا رہے ہیں، یہ نہ ہو کہ بغیر لائسنس کے ڈرائیونگ کرنے پہ تمہارا چالان ہو جائے اور میرا لنچ ادھورا رہ جائے۔"

میرے بگڑے مزاجوں کی قطعاً پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کے

بیٹھ گئی لیکن میں نے اسے اُٹھا دیا اور خود ڈرائیونگ کی۔ اس کے ذرا برابر لفٹ نہ کرانے والے انداز میرے ہیجان اور اضطراب میں مزید اضافہ کر گئے۔ میں نے جز بز ہوتے ہوئے اسے وہاں سے اُٹھا دیا اور اس کے منع کرنے کے باوجود ڈرائیونگ کرنے لگا۔

ایم ایم عالم روڈ پہ بنے شہر کے تمام مہنگے اور نامور ریسٹورنٹس کے آگے ٹریفک جام تھا، یہ لنچ ٹائم کا حال تھا۔ سب ریستورانوں کے آگے پارکنگ کے لئے جگہ تلاش کرتی گاڑیوں اور ان میں بیٹھے لوگوں کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے ہنی نے کہا۔

''ارے، کیا لوگوں کو گھر میں کھانا ملنا بند ہو گیا ہے، ویسے تو مہنگائی کے رونے روئے جاتے ہیں اور یہاں ریستوران کبھی خالی ہی نہیں ہوتے، میرا نہیں خیال کہ اس روڈ کے کسی بھی ریسٹورنٹ میں ہم دو گھنٹے سے پہلے داخل ہو پائیں گے، ایسا کرو آگے سب ٹرن لے کر رائٹ پہ مڑ جاؤ، ایک نیا ریسٹورنٹ بنا ہے شاید وہاں جگہ مل جائے۔''

لیکن اس کے مشورہ دیتے دیتے میں گاڑی کو ''کھابا'' کی پارکنگ میں پھنسانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

''اُتریئے میڈم! میں نے یہاں رات کو ہی بکنگ کروالی تھی۔''

''بریلینٹ! ایمان سے بھوک کے مارے حشر ہو رہا تھا، میرا تو ارادہ تھا، کہیں جگہ نہ ملی تو پیزا ہٹ سے پیزا پیک کروا کے یونی ڈرائیونگ کے دوران میں ہی پیٹ پوجا کر لیں گے۔''

اس نے پہلے سے ریزرو ٹیبل پہ بیٹھتے ہوئے کہا تو اس کے اس پھسپھسے ارادے پہ میرا موڈ بگڑ گیا۔

''تمہیں تو صرف پیٹ پوجا کی پڑی ہوئی ہے۔ اگر ڈرائیونگ کرتے ہوئے..... اور وہ بھی لاہور کی سڑکوں پر..... ہی کھانا کھانا تھا تو اس سے کہیں بہتر ماحول میں گھر پر بھی لنچ کیا جا سکتا تھا، لیکن میں ایسے بکواس لنچ کے ساتھ آج کا خوبصورت دن ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے میں نے ایڈوانس بکنگ کروالی۔ ایسا رومانٹک ماحول، رومانٹک ترین دن اور سچ مچ رومانٹک ڈنر۔''

میں نے ٹیبل پہ دونوں کہنیاں ٹکاتے ہوئے ذرا سا آگے جھک کے کہا۔ میرے اس طرح رومانٹک کی تکرار کرنے سے وہ کچھ اُلجھن کا شکار نظر آئی لیکن اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر مسکرا دی۔

اب اُلجھنے کی باری میری تھی۔ آخر وہ میری کسی بات کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیتی؟ کب تک مذاق سمجھ کے ٹالتی رہے گی؟

میں نے اسے چونکانے کا تہیہ کر لیا تھا، اس لئے اس کی تنبیہی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہتا رہا۔

''بس ایک کمی ہے..... بلکہ ایک نہیں دو۔ ایک تمہاری طرف سے..... ایک میری طرف سے۔ تمہاری طرف سے تو یہ ہے کہ تم اس رومانٹک لنچ کے تقاضے پورے کرنے کے لئے خاص تیاری سے نہیں آئیں۔ ارے ارے مائنڈ مت کرو، تم ایسے بھی اچھی لگ رہی ہو، بہت اچھی..... مگر مجھے دیکھو میں بھی تو ایسے ہی اچھا لگا کرتا ہوں بلکہ بہت اچھا۔'' میں کالر جھاڑتے ہوئے اترایا۔

''لیکن تم سے ملنے کے لئے خاص اہتمام سے تیار ہو کے آیا ہوں اور ایک تم ہو کہ.....''

''بہت ہو گیا سعد۔'' اس نے مجھے گھورا۔ وہ میری باتوں کو ابھی تک ایک گستاخانہ مذاق سمجھ رہی تھی اور چونکہ مذاق میں بھی وہ گستاخی برداشت نہیں کرتی تھی، اتنی عزیز تھی اسے اپنی خود ساختہ بزرگی اس لئے اب مجھ پہ حد نافذ کر رہی تھی اور میں تھا کہ ساری حدود و قیود ایک ہی جست میں پھلانگنے کے درپے تھا۔

''اور جو کمی میری طرف سے ہے وہ میں پوری کئے دیتا ہوں۔'' میں نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا اور گلاب کی ادھ کھلی سُرخ کلی ایک خوش رنگ و خوش وضع میوزیکل کارڈ پہ رکھ کے اس کے سامنے پیش کی۔ وہ چند لمحے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دیکھتی رہی جیسے فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ یہ عملی مذاق بھی اسی زبانی مذاق کا ایک حصہ ہے یا حقیقت۔ میں پہلے سے جانتا تھا کہ اسے میری بات کو مذاق کی بجائے حقیقت کے طور پہ تسلیم کرنے میں کچھ وقت لگے گا اس لئے اس کا ہاتھ نہ بڑھانا مجھے مایوسی میں مبتلا نہیں کر سکا، بلکہ اس کی خاموشی میری ہمت بندھانے لگی۔ وہ کچھ دیر میرے چہرے کو کھوجتی رہی اور جب ڈھونڈے سے بھی اسے مذاق کی ہلکی سی رمق نہ ملی تو اس کی یہ خاموشی معنی خیز نہ رہی، بلکہ ایک واضح خفگی اختیار کر گئی۔ میری آنکھوں کی چٹیلوں نما چاہتے نئے نوپلے جذبے اس پہ آشکار ہوتے ہی اس کی آنکھوں نے سرد مہری کی کہر اوڑھ لی۔ ایک اجنبی سی نظر اس نے اپنے آگے پڑے اس ہلکے گلابی چکنی سطح والے کارڈ پہ ڈالی، جس پہ گہرے گلابی رنگ کا ایک دل اور سنہرے الفاظ میں ایک بے حد جذباتی سی نظم درج تھی اور جس کارڈ کے برابر وہ تر و تازہ ہی گلاب کی کلی بھی دھری تھی۔ اس کارڈ پہ تحریر نظم پہ ایک نظر دوڑانے کے بعد اس کی صبیح پیشانی ہلکی سی شکن آلود ہوئی۔

''یہ سب کیا ہے سعد رضوان؟ اگر مذاق ہے تو بہت ہی گھٹیا اور اگر.....''

''اور اگر حقیقت ہے تو بے حد خوبصورت۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''اور یہ حقیقت ہی ہے ہنی!''

''دیکھو سعد! مانا کہ تم بڑے ہو گئے ہو یا یوں کہنا چاہئے کہ جوان ہو گئے ہو۔ لیکن

تمہارے آس پاس میرے علاوہ کوئی اور لڑکی Available نہیں تھی، تب بھی اس ایڈونچر سے پہلے تمہیں کم از کم ایک بار تو اپنے اور میرے تعلق کے بارے میں سوچنا چاہئے تھا۔''

''تمہارا اور میرا تعلق؟..... میں اسی تعلق کے بارے میں تو بات کر رہا ہوں اور اس بارے میں اچھی طرح سوچنے کے بعد ہی بات کر رہا ہوں۔''

''خاک سوچا ہوگا تم نے۔ بلکہ کچھ عرصے بعد جب تم واقعی سنجیدگی سے یہ سوچو گے کہ تم نے مجھ سے کیا کچھ کہا تو تمہیں خود سے بھی شرم آئے گی میرا سامنا کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔'' وہ مشتعل ہو رہی تھی اور اپنے اشتعال کو دبانے کی خاص کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔

''سعد! عمر کا یہ حصہ خطرناک ہوتا ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ انسان ہوش گنوا بیٹھے۔ تم تو رشتوں کا تقدس بھی بھلا بیٹھے ہو۔'' وہ مجھ پہ اس طرح لعن طعن کر رہی تھی کہ بالآخر مجھے بھی غصہ آ گیا۔

''کیا تقدس؟ تم میری خالہ ہو، پھوپھی ہو، تائی ہو؟ بولو؟'' میرے تڑخ کے کہنے پہ وہ شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر سر جھٹک کے اپنا بیگ اُٹھانے لگی۔

''تم وہ سعد نہیں رہے جسے جاننے کا ہانی نے کبھی دعویٰ کیا تھا۔ تم تو ایک اجنبی ہو، سراسر اجنبی اور میں کسی اجنبی سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی، کجا کہ اس کے ساتھ کہیں تنہا وقت گزاروں۔''

اسے اس طرح بات کے شروع ہونے سے پہلے ختم کر کے اٹھتے دیکھ کر میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے واپس کرسی تک کھینچنا چاہا۔ اس نے فوراً ہی زوردار طریقے سے میرا ہاتھ جھٹکا۔ اس سے پہلے بھی کئی بار میں نے اس کا ہاتھ تھاما تھا، اسے چھوا تھا مگر وہ یوں برہم نہ ہوئی تھی۔

''تماشا مت بناؤ سعد!'' اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے تو آواز دبا کے مجھے تنبیہہ کرنے لگی۔

''تماشا تو تم میرا بنا رہی ہو ہانی! میری پوری بات سنے بغیر ہی تم یوں ناراض ہو کے جا رہی ہو۔ میرا قصور کیا ہے..... آخر میں نے ایسا بھی کیا کہہ دیا ہے۔'' میں روہانسا ہو گیا۔ اپنی ہی آواز کی کپکپاہٹ نے مجھے احساس دلایا کہ میں جتنا بڑا بننے کی کوشش کر رہا ہوں ابھی اتنا ہوا نہیں تب ہی تو اس کی خفگی سے گھبرا کے میرے آنسو چھلکنے کو بے تاب تھے۔ میری آنکھوں کی نمی اور لہجے کی بے چارگی نے شاید اسے بھی کچھ ٹھنڈا کر دیا تھا۔

''تم یہ فتویٰ کیسے صادر کر سکتی ہو کہ چونکہ مجھے اپنے آس پاس کوئی لڑکی نظر نہیں آئی اس

لئے صرف اپنی خوشی کو منانے کے لئے میں تمہیں یہاں لے آیا اور ایسی باتیں کر رہا ہوں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جسے تم عمر کا تقاضا سمجھ رہی ہو یا جوانی کا ابال وہ تو ایک سائے کی طرح بچپن سے میرے ساتھ ساتھ ہے۔ اگر اب تمہارے کہنے کے مطابق میں اپنی سدھ بدھ کھو چکا ہوں تو یہ بتاؤ بچپن کے جذبات میں تو کوئی کھوٹ نہیں ہوتا نا.....؟ تب تو دل ہر برائی، ہر لرزش، ہر بے ایمانی سے پاک ہوتا ہے، جس کے بارے میں جو بھی جذبہ رکھتا ہے، سچا اور بے ساختہ رکھتا ہے تو ہانی! سچ یہ ہے کہ میں تمہیں بچپن سے چاہتا آ رہا ہوں، یہ کوئی کل پرسوں کی اچانک پیدا کی ہوئی محبت نہیں ہے۔ میں نے کئی سالوں تک اسے دل میں چھپا کر رکھا ہے۔''

''سعد.....!'' اس نے ایک گہری اور طویل سانس بھری اور میرے روہانسے چہرے پہ ایک عجیب سی نظر ڈال کر بولی۔

''میں بھی تمہیں بچپن سے چاہتی آ رہی ہوں۔''

میرے دل کو اچانک پر لگ گئے..... بڑے بڑے پر جو آن ہی آن میں مجھے ساتویں آسمان تک اُڑا کے لے گئے اور اس اُڑان میں، میں اس کی نظر کے عجیب ہونے پہ غور بھی نہ کر سکا۔

''لیکن سعد.....''

اس کے لیکن نے میرے پر قینچ کر کے رکھ دیئے۔ میری پرواز تھم کے ساکت ہو گئی۔

''خدا کے لئے اس چاہت کو وہی چاہت رہنے دو، بچپن کی چاہت جو ہر کھوٹ، ہر بے ایمانی سے پاک ہوتی ہے۔ اس پہ نت نئے لیبل مت لگاؤ۔ میں اب بھی تمہیں ویسے ہی چاہتا چاہتی ہوں، جیسے تمہیں پہلی بار دیکھ کے چاہنے کی چاہ من میں جاگی تھی۔ میرا کوئی بہن یا بھائی نہیں تھا اور تمہیں دیکھ کے میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس پیارے سے بچے کو.....''

''ہانی۔'' میرے پر، بازوؤں سمیت کٹ گئے اور میں نیچے گرتے ہی چیخ پڑا۔ میری چیخ سے بے نیاز وہ کہتی رہی۔

''تم بھی اکیلے تھے، میری صورت میں تمہیں بھی ایک ساتھی ملا۔ یہی وجہ تھی ہماری دوستی، اپنائیت اور وابستگی کی، لیکن پتہ نہیں کیوں اور کس کے بہکاوے میں آ کر تم اس خوبصورت رشتے کو مسخ کرنے پہ تلے ہو۔ تم نا سمجھ ہو، اسے تمہاری نوعمری کی بھول سمجھ کر میں نظر انداز کر دوں گی، اگر تم یہ وعدہ کرو کہ اس فضول واقعے کا ذکر بھی آئندہ ہمارے درمیان کبھی نہیں آئے گا۔''

''کیسے نہیں آئے گا؟ ہمارے درمیان اگر کچھ ہے تو یہی ہے، اگر کوئی رشتہ ہے تو یہی

ہے۔تم خواہ مخواہ اس چیز کو میرے اوپر زبردستی تھوپنے کی کوشش مت کرو، جس کے بارے میں، میں تمہارے حوالے سے کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو، معذرت کرنا یا ندامت کا اظہار کرنا تو درکنار تم اپنی فضول سوچ پہ شرمندہ تک نہیں ہو رہے۔" اس نے گلاسز آنکھوں پہ چڑھا لئے، شال درست کرتے ہوئے اپنا بیگ اور موبائل اٹھایا اور واپس جاتے جاتے پلٹ کر کہا۔

"سعد رضوان! یہی بات اگر تمہارے سوا کسی اور نے مجھ سے کی ہوتی تو مجھے غصہ آتا.....شدید غصہ، مگر.....صرف غصہ.....تم سے سن کر تو میں پچھتاوے اور ذلت سے مری جا رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ میں یہ بازی اپنی جلد بازی کے ہاتھوں ہار چکا تھا اور بہت بُری طرح ہار چکا تھا۔لرزتے ہاتھوں کے ساتھ میں نے ٹیبل پہ پڑا کارڈ اور گلاب اٹھایا، واپس کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلا۔ وہ روڈ کے کنارے کھڑی شاید ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھی، مگر اس روڈ پہ ٹیکسی وغیرہ کا گزر کم ہی ہوتا تھا۔ میں کار ریورس کر کے اس کے نزدیک لے آیا۔

"ہنی! بیٹھو، میں گھر ہی جا رہا ہوں۔" میں نے اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"پہلی بات.....مجھے آئندہ ایسے کسی نام سے مخاطب مت کرنا، میرا نام ہانیہ پیرزادہ ہے اور دوسری بات.....مجھے اس نام سے بھی کبھی مخاطب مت کرنا.....بلکہ کسی نام سے بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں چٹان کی سی سختی تھی جس کے بوجھ تلے دب کر میرا ہر احساس کچلا جا رہا تھا۔

"اور آخری بات سعد رضوان پیرزادہ! ہو سکے تو مجھے بغیر نام کے بھی مخاطب مت کرنا، مجھ سے کبھی ایسے بھی مت ملنا جیسے سرِ راہ کوئی کسی اجنبی سے ملتا ہے۔ میں تم سے اجنبیت کا رشتہ بھی نہیں رکھنا چاہتی۔"

اس نے حد ہی کر دی۔ میرا ہارا ہوا نفس.....کچلا ہوا احساس.....اور ٹھوکر کھایا دل بپھر گیا۔

"یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

"تم ہوتی کون ہو یہ فیصلہ کرنے والی کہ میرے لئے کیا بہتر ہے کیا نہیں۔" میں گاڑی سے نکل کر ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔ پتا نہیں میرے چہرے پہ کیا تھا کہ وہ پل بھر کے لئے خوفزدہ ہو گئی۔

"تم مجھے جانتی نہیں ہو، تمہارے اور میرے درمیان شناسائی نہیں ہے، میں تمہیں مخاطب تک نہیں کر سکتا، تم سرِ راہ مجھ سے کسی اجنبی کی طرح بھی نہیں ملنا چاہتیں۔ پھر تمہیں یہ فکر کیوں ہے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ کیا نہیں، تم کیوں کسی اجنبی کے لئے کسی غیر کے لئے "بہتر" کا فیصلہ کرتی پھرتی ہو۔ میری مرضی، جو میرا دل چاہے گا میں کروں گا، میں تم سے پیار کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا، چاہے تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو۔ تم ایک ہزار ایک چہرے بھی بدل کے میرے سامنے آؤ گی تو میں تمہیں پہچان لوں گا۔"

ایک برف کی سل میرے رخسار پہ تڑاخ سے آن گری، بے ساختہ اپنا دایاں ہاتھ بائیں رخسار پہ پھیرتے ہوئے، میں نے حیرت سے اس کے غضب ناک چہرے کی جانب دیکھا۔

"کیا واقعی اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے؟"

مجھے یقین نہ آ رہا تھا، گال پہ ہوتی سنسناہٹ یقین دلا رہی تھی مگر یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ نہ میں اس کا اٹھتا ہاتھ دیکھ سکا نہ ہی اپنی بلند ہوتی آواز کے شور میں اس تھپڑ کی گونج محسوس کر سکا۔ گال پہ ہاتھ رکھے میں دور تک اسے دیکھتا رہا۔ جو پیدل ہی آگے کی جانب چل پڑی تھی، اس کے قدموں میں معمول سے زیادہ تیزی تھی اور اس کا ہر اٹھتا قدم مجھے ایک اور بھرپور تھپڑ کی طرح دل پہ پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں پانی سے بھرتی جا رہی تھیں۔ میں پلکیں جھپک رہا تھا۔ اس کا دور ہوتا وجود مدھم اور دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک ہلکے سبز نقطے کی طرح نظر آنا بھی بند ہو گئی۔ پتا نہیں وہ سڑک کا موڑ مڑ چکی تھی اس لئے میں اسے دیکھنے سے قاصر تھا یا پھر.....آنکھوں کے آگے اتنا سیلاب جمع ہو چکا تھا کہ بینائی جواب دے گئی تھی۔ میں تو اپنے آس پاس تماشا دیکھنے والے اکا دکا افراد سے بھی بے خبر تھا جو تمسخر سے یہ دیکھ رہے تھے۔ ایک لوفر لڑکے کو ایک لڑکی کو تھپڑ مارنے پہ سرِ بازار تھپڑ پڑا.....شاید یہ خبر شام کے چٹ پٹے اخباروں میں بھی چھپتی۔

☆======☆======☆

کہتے ہیں آفت ہمیشہ کبھی اکیلی نہیں آتی، اپنے ساتھ قیامت، قہر اور عذاب وغیرہ کو بھی گھسیٹ لاتی ہے۔

سالوں سے میں جس لمحے کا انتظار کر رہا تھا، وہ سامنے آیا تو ایک آفت ہر طرف مچا کے چلا گیا۔ مجھے اپنا دل.....اپنا وجود.....اپنی سوچیں.....سب کچھ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ کسی آفت زدہ شہر کی طرح.....

گھر آیا تو ایک اور قیامت میری منتظر تھی۔

پاپا پہ اس دن جو قہر ٹوٹا تھا، وہی قہر وہ مجھ پر برسانے کے لئے بالکل تیار تھے۔

بھری سڑک پہ پڑنے والا تھپڑ..... اور ارد گرد کھڑے اجنبی لوگوں کے سامنے ملنے والی ذلت نے مجھے اس طرح زمین میں نہ گاڑا تھا مگر پاپا کو اپنے کمرے میں موجود دیکھ کر ان کے ہاتھ میں دبے کاغذات کو پہچان کر جو عذاب مجھ پہ گزرا، اس کا بیان میرے بس سے باہر ہے۔

یہ وہی صفحے تھے جن پہ میں ساری رات اپنا غبار نکال کر لکھتا رہا تھا۔ پاپا اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اندر سے اب بھی وہی روایتی باپ اور چچا تھے، میرے لئے اتنے نہیں جتنے کہ اپنی بھتیجی ہانی کے لئے۔ ان کے لئے یہ کھلم کھلا اور بے حجابانہ، بے باکانہ اظہارِ محبت ایک طمانچہ ہوگا، اس پہ مستزاد یہ کہ ان کی بھتیجی کے بارے میں ایسے جذبات کا اظہار کرنے والا ان کا اپنا "ہونہار" بیٹا ہو۔

"کیا بکواس ہے یہ؟" انہوں نے کھولتے ہوئے لہجے میں پوچھا اور میرے آگے وہ کاغذ لہرائے، میں سر جھکا کے رہ گیا۔

"وہ پا..... پاپا....." مجھے بالکل کچھ نہ سوجھ رہا تھا کہ کیا کہنا چاہئے۔

"تم اس قدر گھٹیا حرکت کر سکتے ہو، اس کا اندازہ بھی نہ تھا مجھے، اتنی نیچ حرکت کی کیسے تم نے؟ اپنے ہی گھر میں..... اپنی ہی فیملی کی لڑکی..... اور وہ بھی ایسی لڑکی جس کے ساتھ تم اس گھر میں، بہن بھائیوں کی طرح پلے بڑھے۔"

ان کی کڑوی کسیلی باتیں میرے اندر تک زہر اتارتی رہیں، میں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا مگر میرا دل ان کی ہر بات کو رد کر رہا تھا۔

مگر یہ سب فی الحال ان سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ میری کوئی بات سننے کے موڈ میں نہیں لگ رہے تھے، میں ان کا غصہ دیکھتے ہوئے وقتی طور پر ہانی کا غم بھول گیا تھا، لیکن اب پھر مجھے اس کے ہاتھوں ملنے والی تذلیل ستانے لگی۔

"اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو پاپا کو خاموش کرانے کے لئے میری ایک ہی بات کافی تھی، کہ..... پاپا ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، لیکن ایسا بھی تو نہیں کہہ سکتا۔ بے بسی نے مجھے اور تاؤ دلا دیا۔ میری خاموشی سے تنگ آ کر پاپا خود ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ نزدیک آ کر میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کے ہلکا سا باؤ ڈالا اور پہلے سے ذرا نرم لہجے میں کہنے لگے۔

"دیکھو بیٹا! وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا..... اسی طرح جذبات اور خیالات بھی کبھی ایک سے نہیں رہتے، ہر وقت کے جذبے الگ اور ہر عمر کے خیالات الگ ہوتے ہیں، جب تم یہ دور گزار دو گے تو اس عمر کی بہت سی یادیں ایسی ہوں گی جن پہ تمہیں ہنسی آئے گی، بہت سی

ایسی بھی ہوں گی جن پہ تم شرمندہ ہو گے۔ ایسا کچھ نہ کرو کہ شرمندگی اتنی بڑھ جائے کہ آنے والے کل میں تم اپنے گزرے ہوئے کل سے منہ چھپائے پھرو۔ ابھی یہ بات ہمارے درمیان ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ ہمارے درمیان ہی ختم ہو رہی ہے۔"

میری غیر موجودگی میں پاپا کا میرے بیڈ روم تک آنا بھی ایک اتفاق تھا۔ وہ رات کو میرے اچھے رزلٹ کے سلسلے میں پارٹی دینے کا آئیڈیا ریجیکٹ تو کر چکے تھے کہ دادی کی ڈیتھ کے فوراً بعد ایسا فنکشن رکھنا مناسب نہیں، مگر خود ان سے میری شاندار کامیابی کی خوشی سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔

تب پاپا کو خیال آیا کہ بڑے پیمانے پہ نہ سہی، وہ ایک فیملی ٹور کے ذریعے سے اس خوشی کو سیلیبریٹ تو کر سکتے ہیں۔ اسی مقصد کے لئے وہ آفس جانے سے پہلے میرے کمرے میں آئے تھے، تاکہ مجھ سے پوچھ سکیں کہ میں دبئی، سنگاپور یا کینیڈا میں سے کہاں جانا پسند کروں گا، لیکن وہاں اپنے فطری تجسس سے بے قرار ہو کر جب انہوں نے ٹیبل پہ لاپرواہی سے پھیلے کاغذوں کو پڑھا تو میں کہیں اور ہی پہنچ گیا..... جی ہاں امریکہ.....

مجھے اچھی طرح سمجھانے، بجھانے کے باوجود بھی ان کی تسلی نہ ہوئی تھی یا پھر وہ مجھے اتنی دور بھیج کر، اس حرکت کی سزا دینا چاہتے تھے یا پھر ان کا خیال ہوگا کہ اس مرحلے پہ جب کہ میں خود اپنے فعل پہ شرمندگی محسوس کر رہا ہوں (ان کے خیال میں) تو مجھے ہانی سے دور رکھنے میں ہی بھلا ہے۔ تاکہ میرے دل سے جلد از جلد اس سوچ کا اثر زائل ہو سکے۔

ہنی اور پاپا دونوں نے میرے جذبات کا جس طرح تجزیہ کیا تھا اور ان ہی کی باتوں کی روشنی میں جب میں نے خود اپنا احتساب کیا تو مجھے بھی واقعی یہ لگنے لگا کہ یہ محبت نہیں صرف وقتی ابال تھا..... میری حماقت تھی، عمر کا تقاضا..... جوانی کا نشہ، ماحول کا اثر..... والدین کی طرف سے ملی بے جا آزادی اور میڈیا کی بدولت وقت سے پہلے "باعلم" اور "باشعور" ہو جانے کا نتیجہ۔ ہاں شاید..... یہ محبت نہیں تھی۔

مگر اس گھر سے نکلتے ہوئے، سفر کے ایک ایک پل میں اور دیارِ غیر میں آنے کے بعد بھی، اگر میرا دل کسی چیز کے کھونے کے خوف سے بار بار سکڑا تھا تو وہ یہی ایک خوف تھا کہ اب پتا نہیں کب مجھے ہانی کا چہرہ دیکھنے کو ملے۔ تو کیا یہ خوف، یہ تڑپ، یہ محرومی، یہ دکھ..... یہ سب عمر کا تقاضا اور جوانی کا خمار تھا۔ نہیں یہ تو شاید..... ہاں..... شاید یہ محبت ہے۔

اپنی عمر کے پندرھویں سال میرے دل نے بڑے وثوق سے اس محبت کا اعلان کیا تھا اور میری ہر حس نے پوری صداقت سے اس کی تصدیق بھی کی تھی، لیکن اب عمر کے سولہویں

سال میں داخل ہوتے ہوئے یہ یقین ڈگمگا گیا تھا اس میں ایک سرسراتا ہوا ''شاید'' شامل ہو گیا تھا۔

☆======☆======☆

اور میری عمر کے اٹھارھویں سال نے اس ''شاید'' کو بھی لڑکھڑانے پہ مجبور کر دیا۔

مجھے امریکہ آئے دو سال ہونے کو تھے، اگرچہ پاکستان میں بھی اپنی فیملی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے جس سیٹ اَپ کا حصہ تھا، وہ کوئی کم رنگا رنگ اور پُرتعیش نہ تھا۔

مگر امریکہ کے شہر نیویارک میں رہنا ایک الگ ہی بات تھی۔ یہاں میں اپنے ماموں کے گھر میں تھا جو پچھلے بائیس سالوں سے یہاں فیملی کے ساتھ سیٹل تھے اور یقیناً اگر وہ نہ ہوتے تو پاپا اپنے اس بیٹے کو جوان کے خیال میں بگڑ رہا ہے، کبھی ایسے مادر پدر آزاد معاشرے میں تنہا بھیج کر اس کی مکمل بربادی کا سامان نہ کرتے۔

ممانی امریکہ میں رہنے کے باوجود میری دادی کے ٹائپ کی خاتون تھیں اور حیرت انگیز طور پہ انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت بھی ایسے ہی کی تھی ان کی دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں، جن میں سے ایک کو تو وہ شادی کر کے پاکستان ہی کے شہر ملتان رخصت کر چکی تھیں، جب کہ دوسری کی شادی نیوجرسی میں رہنے والے ایک پاکستانی سے کی تھی، تیسرے نمبر کا اکلوتا بیٹا مجھ سے کم از کم چار پانچ سال بڑا تھا اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

لیکن ممانی مجھ پہ ویسی پابندیاں نافذ نہیں کر سکتی تھیں جیسی کہ پورے استحقاق کے ساتھ اپنے بیٹے پہ لاگو کرتی تھیں، ظاہر ہے میں ان کا سسرالی عزیز تھا ان کے شوہر کی بہن کا بیٹا۔ وہ میرا ہر لحاظ سے خیال رکھتیں، مجھے مکمل گھریلو ماحول اور سکون میسر تھا۔

ظاہر ہے کہ پہلے پہل تو میں اداس ہی رہا۔ خاص طور پہ ان حالات میں جس طرح مجھے یہاں بھیجا گیا۔ سب سے زیادہ غصہ مجھے ہانی پہ آتا تھا جو اس دن کے بعد میرا سامنا کرنے پہ بھی تیار نہ تھی۔ حتیٰ کہ میرے امریکہ جانے کی خبر پہ بھی اس نے یہ خودساختہ گریز ترک نہ کیا۔

چند دن ایسے ہی جلتے کڑھتے بے بسی کے عالم میں گزرے۔ مجھے اپنے وجود پہ کسی بے جان چیز کا گمان ہوتا جسے جب چاہے کوئی اٹھا کے کہیں بھی رکھ سکتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بے بسی، بے زاری اور جھنجلاہٹ کی دھند چھٹنے لگی۔ میرا ایڈمیشن ہو گیا۔ میں باہر نکلنے لگا۔ دوست بننے لگے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''ارے..... میں تو امریکہ میں ہوں، نیویارک سٹی میں، جہاں آنے کے خواب لڑکے دیکھتے ہیں۔''

اپنی مرضی نہ چلنے اور اپنے جذبوں کو حماقت قرار دیے جانے کی ساری فرسٹریشن نکالنے کا بھرپور موقع تھا۔ یہاں مجھے اپنے اندر کا غبار کاغذوں پہ نکالنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں جو چاہتا کرتا، جس سے چاہتا ملتا، ہاں ماموں کے گھر میں رہنے کا ایک لحاظ ضرور تھا کہ میں مزے ضرور کر رہا تھا، مگر حد سے آگے نہ بڑھ پاتا۔ یہی ڈر تھا کہ اگر ماموں کو پتا چل گیا تو بات پاپا تک پہنچنے میں دیر نہ لگے گی اور یہاں سے آگے وہ پتہ نہیں مجھے کہاں بھیجیں گے۔

کرسٹینا، روتھ، سمانتھا، یکے بعد دیگرے ان سب سے دوستی کے دوران میں بار بار یہ احساس جاگا کہ میں محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اور ہر بار ان سے کسی ایک سے بریک اَپ ہونے کے بعد اپنے اس وہم کو جھٹلاتے ہوئے میں سوچتا۔

''ربش، اگر یہ محبت ہوتی تو اس احمق لڑکی کو کسی دوسرے لڑکے کے ساتھ دیکھ کر مجھے ہنسی نہ آتی بلکہ غصہ آتا، دکھ ہوتا۔ یہ محبت نہیں تھی بلکہ اس کی نیلی آنکھوں اور منی اسکرٹ کا جادو تھا جو جتنی جلدی چڑھا، اتنی جلدی اُتر گیا۔''

کل تک تو میں روتھ کے بارے میں سنجیدگی سے یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کرسٹینا جیسی فلرٹ اور بے باک نہیں۔ اگر وہ ہامی بھر لے تو شادی تک بات آگے جا سکتی ہے اور آج اس بلیک بیوٹی سمانتھا کے آئیڈیل تراش والے لبوں کو دیکھ کر روتھ کی سنہری رنگت پھیکی لگنے لگی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میری یہ محبت بھی محض فلرٹیشن تھی۔

اور جب تیسری بار سمانتھا سے ملنے کے بعد بھی دل میں کوئی ہلچل نہ مچی تو میں نے فرض کر لیا۔

''یار! یہ محبت وغیرہ کچھ بھی نہیں..... سب بکواس ہے۔ محبت نہیں ہوتی، صرف یہ لگتا ضرور ہے کہ محبت ہو گئی ہے اور ایک بار نہیں بار بار ایسا لگتا ہے، لگتا رہے گا۔ جب تک عمر کا یہ دور باقی ہے اور جب تک ایسے حسین چہرے ٹکراتے رہیں گے، ایسا لگتا رہے گا۔ مجھے اب عادی ہو جانا چاہیے، ہو سکتا ہے کل کسی اور چہرے کو دیکھ کر میرا دل ایک بیٹ مس کرے۔ کسی اور کی زلفوں کو دیکھ کر میرے اندر انہیں چھونے کی خواہش جاگے اور سب سے پہلے ہی کے بارے میں بھی میں اس غلط فہمی کا شکار ہوا تھا۔''

عرصے سے جو اُلجھن ڈسٹرب کر رہی تھی ''یقیناً'' اور ''شاید'' والی، وہ ختم ہو گئی۔

''ہاں واقعی، مجھے ہانیہ پیرزادہ سے محبت نہیں تھی۔''

مجھا نے پورے وثوق سے دہرایا، میرا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ جب مجھے اس سے محبت ہی نہیں تھی، تو میں ناکامی کا بوجھ دل پہ لئے کیوں اداس پھرتا، میری اداسی بھی ختم ہو گئی۔ اس

کے لئے جتنے گلے شکوے تھے، سب خود ہی فنا ہو گئے۔ پاپا ٹھیک کہتے تھے ایک وقت آئے گا جب مجھے ان باتوں پہ ہنسی آئے گی۔ شرمندگی ہوگی۔

لیکن ہوا یہ کہ عمر کے بیسویں سال یہ یقین بھی لڑکھڑا گیا۔ شاید قدرت سے میرا سکون اور ٹھہراؤ دیکھا نہیں گیا۔ میرے پاس ماما کا فون آیا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میں کب پاکستان آسکتا ہوں تاکہ اس کے مطابق ہانی کی شادی کی تاریخ مقرر کی جائے۔

''ہانی کی شادی.....''

''ہاں، شکر ہے اس فرض کی ادائیگی کا موقع ملا، اب تو خاندان کے لوگ باتیں بنانے لگے تھے۔ کسی کی اولاد کی ذمہ داری قبول کرنا بہت مشکل کام ہے، خاص طور پہ بیٹی کی، شکر ہے اللہ کا کہ اس ذمہ داری کو ہم لوگوں نے پوری ایمانداری سے نبھایا۔''

وہ ماما، جن کے پاس مجھ سے رسمی سی بات کرنے کا وقت بھی مشکل سے ہوا کرتا تھا، اب ایسے ہی فون پہ لمبی لمبی باتیں کیا کرتیں۔

''خدا خدا کر کے ہانی راضی ہوئی ہے اس رشتے پہ، ورنہ میں تو پریشان ہو گئی تھی اس لڑکی کے ہاتھوں، تمہارے پاپا بھی پہلے پہل یہی کرتے رہے کہ کرنے دو جو اس کا جی چاہتا ہے لیکن تمہارے جانے کے بعد وہ بھی ہانی سے اصرار کرنے لگے کہ وہ ان رشتوں میں سے کسی ایک کو پسند کرلے، جو اس کے لئے آتے رہتے تھے۔ مگر پتا نہیں اس کا کیا معیار تھا کہ اچھی بھلی ویل نون فیملیز کے لڑکے مسترد کرتی رہی، ایک تو تمہارے پاپا کے بزنس سرکل کے ہی فرینڈ نوید ہمدانی کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا جو اپنے فیملی بزنس کا اکلوتا وارث تھا، دوسرا ایک نوجوان ایم این اے تھا اور تمہارے ہوتے ہوئے بھی تو کیسے اچھے اچھے پروپوزل آئے تھے لیکن اس لڑکی نے ہامی بھی بھری تو ایک معمولی سے انجینئر کے لئے، جو عام سے مڈل کلاس گھرانے سے ہے، اس کا کولیگ ہی ہے، ویسے تو باضابطہ طور پہ رشتہ لائے ہیں اس کے گھر والے مگر ہانی کا بغیر کسی جھجک اس کے ہاں کر دینا ظاہر کر رہا تھا کہ یہ دو طرفہ پسندیدگی ہوگی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ.....'' مجھے یہ بات ہضم نہ ہو رہی تھی کہ ہانی بھی کسی سے محبت کر سکتی ہے۔

''ہاں تو اور کیا مطلب ہے اس کا، لیکن بذات خود لڑکا چونکہ ٹھیک ٹھاک ہے اس لئے رضوان نے زیادہ اعتراض نہیں کیا۔ ویسے بھی ان کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے انہیں صرف ہانی کو رخصت کرنے سے دلچسپی ہے ورنہ مجھے تو اس کا فیملی بیک گراؤنڈ زیادہ نہیں بھایا۔''

اور پاپا کو اسے رخصت کرنے کی زیادہ جلدی کس لئے تھی، یہ صرف میں جانتا تھا۔ ظاہر

ہے کہ اس حرکت پہ وہ کتنے ہی سیخ پا کیوں نہ ہوئے ہوں۔ اس جدائی سے بے چین بھی ہوتے ہوں گے، اپنے ہاتھوں دی گئی اس جلاوطنی کا خاتمہ کرنے کا بس یہی حل انہیں سوجھا ہوگا۔

''تم نے نہیں بتایا نہیں، کب آسکتے ہو؟ یہ تمہارا لاسٹ سمسٹر ہے نا؟''

''جی، لیکن اس کے بعد میں نے کچھ کورسز کرنے کا پلان کر رکھا ہے اپنے فرینڈز کے ساتھ، اس لئے ان چھٹیوں میں تو نہیں آسکتا۔''

''اس سے پہلے کون سی چھٹیاں تھیں، جن میں تم آئے۔'' انہوں نے خفگی سے جتایا۔

''مجھے تو لگتا ہے تمہیں وہاں کی آب و ہوا زیادہ ہی راس آگئی ہے۔ شاید اب تم کبھی بھی واپس آنا پسند نہ کرو۔'' ان کے لہجے میں خوف تھا، اندیشے تھے اور کچھ شکوے بھی۔

''ایسی بات نہیں ماما، ویسے بھی یہاں آنے کا فیصلہ میرا نہیں، پاپا کا تھا اور شاید آپ کی مرضی بھی اس میں شامل تھی۔ اب اگر میں آگیا ہوں تو جس مقصد کے لئے آیا ہوں اسے دل لگا کر پورا تو کرنے دیں۔ ہانی کی شادی ایسا کون سا بڑا مسئلہ ہے جو میرے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔ کون سا اس کی شادی.....''

میں کہتے کہتے رک گیا کہ کون سا اس کی شادی مجھ سے ہو رہی ہے جو میرا آنا ضروری ہے۔ خفا خفا سے دل کی اس ضدی شکایت پہ میں خود ہی ہنس پڑا۔

''کہاں تو تمہاری محبت کا یہ عالم تھا کہ اس کی شادی کے ذکر سے تم گھبرا کے اُلجھنا شروع کر دیتے تھے اور کہاں اس کی شادی میں شرکت تک کرنے کے لئے تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔ صحیح کہا ہے کسی نے، آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل مگر بیٹا! یہ تمہارے اپنے گھر کی تقریب ہے، بلکہ پہلا پہلا موقع ہے تم نہیں ہوگے تو سب کچھ کتنا ادھورا لگے گا۔ خود ہانی بھی کتنا محسوس کرے گی۔ ایک ہی تو بھائی ہو تم اس کے اور اگر تم ہی.....''

''پلیز ماما.....!'' پہلے کی طرح آج بھی یہ بات مجھے اتنی ہی بُری لگی کہ میری گرفت ریسیور پہ اور بھی سخت ہوگئی۔

''میں کوشش کروں گا۔'' میں نے خود ہی خدا حافظ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ انہیں تو میں نے صاف ٹالا تھا مگر جب پاپا نے ایک ہی کال کے ذریعے پندرہ تاریخ تک پہنچنے کا حکم دیا تو میں کوئی بہانہ تک نہ گھڑ سکا۔

ہانی کی شادی کی خبر پہ دل کا گھبرا جانا، اس کو کسی اور کا ہوتے دیکھنے کا تصور کرتے ہی اندر آگ کا جل جانا، چپکے چپکے کسی طرح اس شادی کے رک جانے کی دعائیں مانگنا اور سب

سے بڑھ کے یہ انکشاف کہ اس شادی میں ہانی کی مرضی اور پسند بھی شامل ہے، اس انکشاف نے تو مجھے لاوا بنا کے رکھ دیا تھا۔ ایک طرف اس شخص سے اتنی نفرت اور حسد محسوس کرتا کہ ڈر تھا اس کے سامنے آتے ہی میں کچھ کر نہ بیٹھوں اور دوسری جانب اسے دیکھنے کی خواہش بھی شدید تر تھی کہ آخر اس میں ایسا ہے کیا جو ہانی کو بھایا۔ کیا میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں، اب بھی؟ یعنی پہلے کرتا تھا.....؟ ہاں.....شاید.....

یہ "شاید" پھر سے مجھے الجھی ہوئی تھتی بنانے آ گیا۔

سارے رستے خود کو یقین دلاتا، میں پاکستان پہنچ گیا۔ پاپا نے پندرہ تک پہنچنے کا کہا تھا، میں نے مصروفیت کا عذر تراشا اور جان بوجھ کر بائیس تاریخ تک پہنچا۔ اگلے ہی دن اس کی شادی تھی۔

وہ بھی مجھ سے خاصے نارمل انداز میں ملی، ان سالوں میں اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھا تھا لیکن اب وہ مجھ سے ایسے مل رہی تھی جیسے ہمارے درمیان کبھی کسی تلخی یا بدمزگی کا گزر ہی نہ ہوا ہو۔

"تم تو پورے امریکن بن کے لوٹے ہو۔ رنگ بھی نکھر گیا ہے، لگتا ہے وہاں جلنا کڑھنا چھوڑ دیا تھا اور یہ تم ٹاڑ کے جیسے لمبے کیوں ہوتے جا رہے ہو۔"

"بس قد ہی قد آؤٹ سا نکال لیا ہے۔ کمزور تو اس قدر ہو گیا ہے میرا بیٹا اور رنگ تو یہاں پہ زیادہ صاف تھا۔ اب تو کچھ پیلا پیلا لگ رہا ہے۔" مامانے خالص ماؤں والی آنکھ سے مجھے دیکھا جب کہ حقیقت وہی تھی جو ہانی نے بیان کی تھی۔ میری صحت قابلِ رشک ہو چکی تھی۔ پچیس چھبیس سال کا بھرپور جوان نظر آتا تھا۔ میں نے چور نظروں سے مہمان خواتین کے ساتھ باتیں کرتی ہانی کا جائزہ لیا۔

مایوں کے زرد لباس اور زرد چمکتے دمکتے دوپٹے میں وہ زیادہ بدلی ہوئی نہیں لگ رہی تھی، ویسی ہی تھی جیسی میں چھوڑ کے گیا تھا۔ اس کے نقوش بہت زیادہ غیر معمولی حسین بھی نہ تھے مگر اس کی صورت اور سراپے میں یہ خاصیت تھی کہ عمر اس پہ رک سی گئی تھی، وہ اب ستائیس سال کی عمر میں بھی انیس بیس سے زیادہ کی نہ لگتی۔ چہرے کے نقوش میں آج بھی وہی نرمی اور ملائمت تھی جو اسے کم عمری کی مخصوص معصومیت عطا کرتی تھی، حالانکہ داوی کہتی تھیں کہ ملازمت کرنے والی لڑکیوں کے چہرے کرخت ہو جایا کرتے ہیں۔ وہ ویسی ہی دھان پان تھی مگر نزاکت کے باوجود صحت مندی کی چمک اس کی شفاف جلد، چہرے کے گلابی پن اور سرمئی آنکھوں کی چمکا چوند سے واضح ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ اس قدر سنہری تھا کہ زرد دوپٹے کے

ہالے سے پھوٹتی کرنیں بھی اسے زردی نہ اوڑھا سکیں۔ اچانک اس نے میری طرف دیکھا مجھے وزدیدہ نگاہوں سے اپنی جانب تکتے پا کر اس کی مسکراہٹ ذرا سی پھیکی پڑی۔ میں نے فوراً نظریں پھیر لیں۔

اسی رات جب مہندی کا فنکشن اپنے تمام تر ہنگامے سمیٹے اب اختتام کو تھا۔ لوگ ڈنر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، مجھے گھر کی پرانی ملازمہ جیراں نے ہانی کا پیغام دیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی، اپنے کمرے میں، میں نے ایک نظر وسیع و عریض لان پہ ڈالی، اسی جگہ کچھ دیر قبل وہ سر جھکائے بیٹھی مہندی کی رسم کی خاص مہمان بنی ہوئی تھی۔ اس کی دبی دبی سی مخصوص مسکان میں شرمیلی سی مسرت تھی۔ اس کے چہرے کے سنہری پن میں سات رنگوں کی شعاعیں شامل ہو گئی تھیں۔

اس کا کمرہ بھی ویسے کا ویسا تھا..... بالکل اسی کی طرح..... جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے اندر آتے ہی لگا جیسے میں دو سال پہلے کے وقت میں داخل ہو گیا ہوں۔ اس گرے لائننگ والے کارپٹ پہ بیٹھ کے ہم لوڈو اور اسکریبل کھیلا کرتے تھے، بیٹھے بیٹھے میں ان ہی فلور کشنز میں ایک کو گھسیٹ کر لیٹ جایا کرتا تھا۔ یہی وہ بلیک اور سلور وال کلاک تھا جس کی سوئیوں کو دیکھتے ہی وہ مجھے فوراً کمرے سے بھگایا کرتی تھی کہ اب اس کے پڑھنے یا سونے کا وقت ہو گیا ہے۔ یہی وہ سادہ سی ساخت کا اخروٹ کی لکڑی کا سنگل بیڈ تھا جس پہ بیٹھی وہ کوئی ملکہ لگا کرتی تھی۔ یہی وہ گرے اور وائٹ ڈیزائن والا کمبل تھا جو.....

"بیٹھو نا سعد....." اس کی آواز پہ میں چونکا اور سر جھٹک کر ان خیالات سے جان چھڑانا چاہی۔

"تم بہت بدل گئے ہو سعد....."

"کوئی نئی بات کرو۔ یہ تو تم نے تب بھی کہا تھا جب میں یہاں تھا۔" میرے فقرے پہ اس کے چہرے کی رنگت کا متغیر ہو جانا ظاہر کر رہا تھا کہ میرے کوئی حوالہ دیے بغیر بھی وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ میں نے یہ بات کیوں کی۔

"تم اتنے ناراض ناراض سے کیوں رہنے لگے ہو؟"

"کیونکہ کوئی مجھے "راضی" رکھتا ہی نہیں۔"

"بولتے تو پہلے بھی بہت تھے اور بہت خوب بولتے تھے، اب حاضر جوابی پہلے کے مقابلے میں دگنی ہو گئی ہے۔"

"اور بھی بہت کچھ ہے جو پہلے کے مقابلے میں دگنا ہو گیا ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ پھر سے وہی گیم کھیل رہی تھی۔ میری ہر سنجیدہ بات کو نظر انداز کرنے اور مطلب سمجھ کر بھی نہ سمجھنے والی لاپرواہی دکھانے کا کھیل اور اس کا یہ ردِعمل مجھے پہلے کی طرح اکسا رہا تھا۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا اور اب پھر میں اس کی باتوں پہ تاؤ کھاتے ہوئے وہ سب کہہ رہا تھا، جو میں نے پہلے سے بالکل نہ سوچ رکھا تھا۔

''ہاں جیسے تمہاری ہائٹ، تمہاری سمارٹ نیس۔'' میری بات اور انداز پہ وہ پل بھر کو گڑبڑائی ضرور..... مگر وہی اس کی اہمیت نہ دینے کی عادت.....

''اور تمہاری دلکشی، تمہاری دلربائی۔'' میں اس کا دل جلانے والی لوفرانہ مسکراہٹ سجا کے گنگنانے لگا۔

''تمہاری اردو خاصی بہتر ہوگئی ہے۔ میرا تو خیال تھا جتنی آتی ہے، وہ بھی بھلا کے آئے ہوگے۔'' اس نے حسبِ عادت ہوشیاری سے بات پلٹی۔

''بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور بھلا تم کوئی بھولنے والی چیز ہو۔'' میرا ہاتھ اس کے ہاتھ کی جانب بڑھا مگر اس سے پہلے وہ تڑپ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرا خیال تھا تم سدھر چکے ہوگے۔ میں نے تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ میں جانے سے پہلے اپنے اور تمہارے درمیان موجود اس سرد مہری اور اجنبیت کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے امریکہ جانے کو بھی میں تمہاری شرمندگی سمجھ رہی تھی۔ اب پتا چلا ہے کہ شرمندہ ہونا تو تم نے سیکھا ہی نہیں۔ آج مجھے یہ شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں نے پھر سے اپنے اور تمہارے درمیان اس تعلق کو جوڑنے کی کوشش کیوں کی تھی جو کبھی تھا ہی نہیں۔''

''تعلق نہ تو تمہارے تسلیم کرنے سے بنے گا، نہ ہی ختم کرنے سے فنا ہوگا۔'' میں نے اسے مزید خوفزدہ کیا، اگرچہ وہ مجھ پہ رعب جھاڑنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی مگر میں جان گیا تھا اسے میرے تیور لرزا رہے تھے۔ اب وہ مجھ پہ سرِعام تو کیا اس بند کمرے میں بھی ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

''تم یہاں سے نکل جاؤ۔''

''کہاں کہاں سے نکلواؤ گی مجھے، اس گھر سے تو نکلوا چکی ہو۔''

''میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم اس گھر کو چھوڑو.....''

''مجھ سے نہیں کہا تھا مگر پاپا سے تو کہا تھا۔'' میں نے صاف الزام لگایا، مقصد صرف اسے احساسِ جرم میں مبتلا کرنا تھا، ہمدردی چاہتا تھا کہ ایک اس کی خاطر اس کی وجہ سے میں ملک بدر ہوا۔

''میں کیوں کسی سے کچھ کہتی، تمہیں بھیج کر میرا کیا فائدہ ہوتا۔ نہ ہی تمہارے رہنے سے مجھے کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں تم سے..... ایک بچے سے خوفزدہ کیوں ہوتی۔'' اسے اچھی طرح علم تھا کہ خود کو بچہ کہلائے جانے پہ میں تب بھی آپے سے باہر ہو جاتا تھا، جب واقعی بچہ تھا تو اب اٹھارہ سال کی عمر میں میں یہ طعنہ کیسے سن پاتا۔

''یہ بات تم دیر سے ہی سہی مگر سمجھ جاؤ گی۔ تم جلد ہی جان جاؤ گی کہ یہ ''بچہ'' تمہیں کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

اتنا کہتے ہوئے میں دروازے کو ٹھوکر مار کر باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

''حمزہ! زیادہ سوال کرنے کے بجائے تم صرف وہ کرو، جو میں نے تم سے کہا ہے۔''

''سوال کیوں نہ کروں، میں کوئی تمہارا جی حضور ٹائپ کا ملازم نہیں جو بغیر چوں چرا کے تمہاری ساری باتیں مانتا جاؤں، پتا تو چلے کہ یہ چکر کیا ہے، کیوں کر رہے ہو تم یہ ساری ڈرامہ بازی۔''

''صرف اور صرف سوالوں سے بچنے کی خاطر، بات صرف اتنی ہے کہ میں اپنے چند فرینڈز کے کہنے میں آ کر تھوڑی سی ڈرنک لے بیٹھا اب اس حال میں گھر تو نہیں جا سکتا تھا۔ اسی لئے کلب بیٹھا رہا۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں اور گھر پہ ہانی کی بارات کافی دیر پہلے آ چکی ہوگی۔ گھر والے نہ صرف میرے منتظر ہوں گے بلکہ پریشان بھی۔ تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ تم گھر پہ فون کر کے کہہ دو کہ میرا ایک معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور تم مجھے فرسٹ ایڈ دلانے کے بعد اپنے گھر لے آئے ہو۔''

''عجیب آدمی ہو تم؟ یہ کون سے فرینڈز ہیں جنہیں میں نہیں جانتا اور تم ہٹے کٹے ہو، تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر.....''

میں نے آستین اوپر کر کے اسے کہنی سے ذرا نیچے بندھی بینڈیج دکھائی، پھر ماتھے سے بال ہٹا کے پیشانی کی خراش بھی..... تب وہ چپ ہوا۔

''اور تسلی چاہیے تو باہر نکل کے میری گاڑی کو دیکھ لو۔''

''یعنی ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے تم خود ہی کار بھی کہیں مار بیٹھے۔''

میں خاموش رہا تو وہ شانے اچکاتا ہوا فون پہ میرے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

اصل بات کیسے بتاتا اسے کہ میں ہانی کی شادی میں شرکت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اسے فاتحانہ انداز میں دلہن بنے وداع ہوتے دیکھتا۔

مگر شادی والے دن اور عین فنکشن کے وقت میری اتنی طویل غیر حاضری انہیں تشویش میں مبتلا کر سکتی تھی، اسی لئے میں حمزہ کی طرف چلا آیا۔ حمزہ نے فون پہ پاپا سے وہی کہہ دیا، جو میں نے کہا تھا، مگر پاپا کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ اسی وقت تقریب چھوڑ کر آنا چاہتے تھے۔

اس کے بعد میں نے بھی فون پہ پاپا سے کہہ دیا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں، وہ آرام سے ہانی کو رخصت کرنے کے بعد مجھے لینے آجائیں، شاید میری آواز سے ان کی تسلی ہوگئی تھی، کیونکہ اس کے بعد انہوں نے مزید اصرار نہ کیا۔

☆======☆======☆

ولیمہ ایک دن کے وقفے سے تھا، مگر میرے حادثے کی اطلاع ملتے ہی شادی کے اگلے روز بلال احمد بمعہ اپنی نئی نویلی دلہن کے میری عیادت کو آیا۔ بلال احمد وہ شخص تھا جو آج کل میری بے انتہا نفرت کا نشانہ بنا ہوا تھا، یعنی ہانی کا شوہر، میں ایسے بھی کہہ سکتا تھا کہ ہانی اپنے شوہر کے ساتھ آئی، لیکن یہ غلط ہوتا یقیناً اس کا شوہر ہی اس حادثے کی وجہ سے دنیا داری اور وضع داری کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اسے لایا تھا، اس کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی میرے سامنے نہ آتی۔

بلال احمد خاصا یا توئی شخص لگ رہا تھا، جلد بے تکلف ہو جانے والا مگر مجھے لگا، جیسے ہانی کو اس کا مجھ سے گھل مل کے باتیں کرنا پسند نہیں آرہا۔ شاید وہ خوفزدہ ہو کہ میں اس کے سامنے ہی کچھ ایسا نہ اگل دوں جس سے وہ مشکوک ہو جائے اور میرا ایسا کوئی ارادہ تو نہ تھا۔ مگر عادت سے مجبور، صرف اس کو چڑانے کی خاطر..... میں..... جو بلال سے اکھڑے لہجے میں بات کر رہا تھا اس کی تمام تر گرم جوشی کے باوجود..... اب اچانک ہی بااخلاق ہو گیا۔

''مسٹر بلال! اتنا تو میں بھانپ چکا ہوں کہ یہ ارینج میرج نہ تم اور لو میرج زیادہ ہے، چاہے ہنی کچھ بتائے یا نہ بتائے۔'' میں نے ''ہنی'' کہتے ہوئے ضرورت سے زیادہ ہی شہد گھول لیا اپنے لہجے میں۔

''لیکن تفصیل آپ سے سننا چاہوں گا، مسٹر بلال۔''

''پہلے تو تم یہ بتاؤ کہ یہ مسٹر بلال کیا ہوتا ہے، بھئی رشتہ ہے ہم دونوں کے درمیان، سالے بہنوئی کا، تم مجھے بھائی جان، دولہا بھائی وغیرہ کچھ بھی کہہ سکتے ہو، بلکہ اگر زیادہ فلمی انداز میں پکارنا ہو تو بیجامی بھی کہہ سکتے ہو۔''

وہ چوتھا شخص تھا جو زبردستی ہانی کو مجھ سے ایسے رشتے میں جوڑ رہا تھا۔ جس کا تصور بھی میں نہ کرنا چاہتا تھا۔

''آپ سے کس نے کہا کہ آپ میرے بہنوئی لگتے ہیں۔ میری کوئی بہن نہیں۔'' میرے لہجے کی خشکی پہ غور کئے بغیر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ہاں آنٹی نے بتایا ہے تم دونوں کی دوستی کے بارے میں کہ بہت کم عمری سے تم ہانی سے اٹیچ ہو گئے تھے۔''

''ہاں، بہت کم عمری سے، لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کم عمری کے جذبات سطحی اور ناپائیدار ہوتے ہیں بلکہ ''کم عمر'' ہی ہوتے ہیں۔''

''نہیں میرا تو خیال ہے کہ کم عمری میں پیدا ہونے والی وابستگیاں زیادہ دیرپا اور شدت پسند ہوتی ہیں۔'' میں نے عجیب جتانے والی نظروں سے ہانی کو دیکھا جس کی پیشانی شکن آلود تھی اور وہ بے چینی سے اپنی ہتھیلی مسل رہی تھی۔

''اپنی وے، ہنی کا دوست ہونے کے ناطے تو تم مجھ سے زیادہ بے تکلف ہونے کا حق رکھتے ہو، اگر تمہیں میرا سالا بننے پر اعتراض ہے تو تم یار بن جاؤ، اسے بھی تم نام سے پکارتے ہو، مجھے بھی صرف بلال کہہ لیا کرو۔''

''لیکن ہنی میرے لئے صرف دوست نہیں، وہ تو اس سے بھی.....'' میں اس کی گھبراہٹ کا بھرپور لطف لے رہا تھا جو اچانک میری بات کاٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بلال! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔''

☆======☆======☆

''کیا.....؟ مگر کب؟ اب کہاں ہے وہ؟''

میں حیران پریشان فون پہ بات کر رہا تھا۔ خبر ہی کچھ ایسی تھی۔

اس کی شادی کو چھ روز گزر چکے تھے، بلال احمد سے اس پہلی ملاقات کے بعد بھی میں دو تین بار ملا لیکن اب میں نے خود پہ قابو پا لیا تھا، ہانی کو خوفزدہ کرنے کے لئے وہ بے سروپا گفتگو کرنے والی حرکت مجھے بچگانہ محسوس ہو رہی تھی۔

میری واپسی کی سیٹ کنفرم ہو چکی تھی اور میں یہ چار دن صرف اور صرف اپنے پرانے فرینڈز کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی میں حمزہ، راحیل اور دوسرے سکول فیلوز کے ساتھ ریستوران میں بیٹھا تھا جب موبائل پہ پاپا کی اطلاع نے میرے ہوش اڑا کے رکھ دیئے۔

''بلال احمد کا ایک سیریس روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسے ایک پرائیویٹ ہاسپٹل شفٹ کر دیا گیا ہے اور اب سے کچھ دیر بعد اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔'' پاپا کے انداز

سے صاف لگ رہا تھا کہ اس کی کنڈیشن نازک ہے۔ ہانی سے گہری ناراضی اور بلال احمد سے شدید نفرت کے باوجود میں اپنے دل کو روک نہیں پایا۔ وہاں سے شادمان تک، اس ہاسپٹل میں جاتے ہوئے کتنی ہی بار ہانی کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آیا۔

جب وہ مایوں کے زرد لباس میں بھی آنے والے دنوں کی بے پایاں مسرت کے خیال سے گلابیاں چھلکا رہی تھی۔

اور مہندی لگواتے ہوئے اس کی وہ پُر اشتیاق مسکراہٹ۔

شادی کے بعد اس کے ہر انداز سے چھلکتی آسودگی۔

کیا ہوگا اگر بلال احمد نہ رہا تو.....؟ میں نے تصور میں ہانی کو سفید لباس میں چوڑیاں توڑتے اور بین کرتے ہوئے دیکھا۔ میرے قدم ایک دم بریک پہ جا رکے اور میرا دل پوری رفتار سے دھڑکنے لگا۔

''ایک تو یہ فلمی اثرات پتہ نہیں کب میرے ذہن سے دور ہوں گے۔'' میں نے خود کو اس فلمی سین کے سوچنے پر لعن طعن کی۔

ریسپشن سے روم نمبر وغیرہ معلوم کر کے میں وہاں گیا تو خالی بیڈ اور سنسان کمرہ مجھے عجیب سے وہم میں ڈال گیا۔ میں نے نزدیک سے گزرتی نرس سے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ مریض اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہے۔

کوریڈور میں بہت سے انجانے چہروں میں پاپا، ماما اور ہانی کا متفکر چہرہ دور سے نمایاں تھا۔

مجھ پہ نظر پڑتے ہی وہ تڑپ کے اٹھی اور تیر کی طرح میری طرف لپکی، میں بوکھلا گیا۔ اسے تقریباً بھاگتے ہوئے اپنی جانب آتے دیکھ کر میں نہ جانے کیا سمجھا کہ اپنے بازو وا کر دیئے۔

اس وقت میں سب کچھ بھول گیا تھا۔

بھری سڑک پہ پڑنے والا وہ تھپڑ بھی.....

پاپا کے ہاتھوں ہوئی بے عزتی بھی۔

گھر سے دور کسی زبردستی کے طوق کی طرح ڈالے وہ دو سال بھی.....

اپنے اور اس کے درمیان پیدا ہوئے اس سرد طویل سے فاصلے کو بھی.....

یاد رہا تو صرف یہ کہ وہ ہانی ہے..... ہانی..... میری ہنی..... وہی ہنی جسے پہلی بار میں نے دیکھا تھا تو تب بھی وہ ایسے ہی رو رہی تھی..... اس کی آنکھوں میں ایک عزیز ہستی کو کھو

دینے کے دکھ کے ساتھ ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں ایسا ہی خوف نمایاں تھا اور جیسے اس دن کی مترنم آنکھوں کو دیکھ کر مجھے لگا تھا کہ جیسے ان سے زیادہ اداس آنکھیں میں نے کہیں اور..... کبھی اور..... نہ دیکھی ہوں ویسا ہی احساس آج بھی ہو رہا تھا۔ اس کا بھیگا چہرہ دیکھ کر تب بھی مجھے لگا تھا جیسے میرے اپنے گال بھیگ گئے ہوں، آج بھی مجھے وہی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دن کی طرح اب پھر مجھے اپنے حلق میں پھندے اٹکتے محسوس ہوئے۔ میری آنکھیں جلنے لگیں مجھے لگا، میں پھر سے رو دوں گا۔

میں نے بڑی مشکل سے آنسوؤں کو نکلنے سے روکا۔ آج میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس لئے کہ تب جب میری ہچکی بندھی گئی تھی۔ ایسے ہی بلا وجہ..... تب اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا، مجھے چپ کرایا تھا۔ آج میں یہ قرض اتارنا چاہتا تھا۔ اس کے آنسو خشک کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے قریب آتے ہی اپنے بازو پھیلا دیئے۔ وہ میرے قریب آئی، بہت قریب..... مگر میرے شانے پہ سر رکھ کے رونے کے لئے نہیں، بلکہ میرا گریبان پکڑ کے جھنجھوڑنے کے لئے۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟ صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کہ تم سچے ہو..... اور..... اور میں غلط..... جو ہمیشہ تمہاری بدتمیزیوں کو تمہارا بچپنا اور نادانی سمجھ کے نظر انداز کرتی رہی۔''

وہ میرے کالر کو اتنے زور سے جھٹکے دے رہی تھی..... میرا وجود زلزلوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں اپنے پیروں پہ کھڑا تھا، کیا یہ حیرت کی بات نہیں تھی؟

اور سب کے لئے بھی یہ منظر حیرت انگیز تھا..... اور ہانی کے الفاظ بھی..... سوائے پاپا کے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے وہ جذبات صرف قلم کے ذریعے کاغذ پہ نہیں پھیلے تھے، بلکہ زہر بن کے ہانی کے اندر بھی دوڑ رہے تھے۔ وہ تاسف سے مجھے دیکھنے لگے۔ ماما کے چہرے پہ البتہ اُلجھن کے ساتھ ساتھ ناگواری بھی تھی۔

''تم کہتے ہو تمہیں مجھ سے محبت ہے، کیسی محبت ہے یہ سعد! محبت کرنے سے پہلے یہ تو سیکھ لیتے کہ محبت کرتے کیسے ہیں۔''

وہ بلک بلک کر روتے ہوئے اب نیچے کی طرف جھک رہی تھی۔ شاید اس کے اندر اب اپنے وجود کو سہارنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ میرا گریبان اب بھی اس کی مٹھیوں میں دبا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجبوراً مجھے بھی جھکنا پڑا۔ وہ اب گھٹنوں کے بل فرش پہ بیٹھی ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

''بہت غصہ آتا ہے نا تمہیں، جب میں تمہیں چھوٹا کہتی ہوں لیکن اب تم خود اپنی نظروں

میں کتنے چھوٹے ہو گئے ہو اس کا احساس ہے تمہیں؟'' میری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے نہ جانے وہ کیا سمجھی۔ شاید یہ کہ اتنے لوگوں میں تماشا بننے کی ذلت مجھے رلا رہی ہے۔ حالانکہ میرے آنسوؤں کا اس کے آنسوؤں سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا.....؟'' شدت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔

''کیوں مارا تم نے بلال احمد کو؟ میں تو تم سے ناراض ہونے کے باوجود تمہارے لئے دعائیں ہی مانگتی رہی اور تم.....تم.....نے میری زندگی کی واحد خوشی بھی مجھ سے چھین لی۔''

حیرت کا حملہ اتنا شدید تھا کہ میں تردید تک کرنا بھول گیا۔ پاپا آگے بڑھے اور اسے شانوں سے تھام کر اٹھانے لگے۔

''کیا ہو گیا تمہیں ہانی! ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ کچھ بھی نہیں ہوا بلال کو، دعا کرو اس کا آپریشن خیریت کے ساتھ ہو جائے۔'' پاپا نے اس سے اتنا کچھ کہا.....مگر نہ کہا تو بس یہ.....کہ.....سعد نے میرے بیٹے کچھ نہیں کیا وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتا، میں نے مدد طلب نظروں سے ماما کی جانب دیکھا، وہ تڑپ کے آگے بڑھیں۔

''کیا کہہ رہی ہے یہ لڑکی؟''

اس وقت ان کے لہجے میں اس قدر اجنبیت تھی کہ دکھ اور غصے سے حواس کھوتی ہانی بھی حیرت سے اپنا صدمہ بھول کر انہیں دیکھنے لگی۔

''کیا صدمے نے اس کے دماغ پر اثر کر دیا ہے۔'' وہ پاپا کی معنی خیز خاموشی سے بھی الجھ رہی تھیں۔

''کیا مقصد ہے اس بے سروپا گفتگو کا۔ اتنے لوگوں میں تماشا بنانے کی آخر کیا تک ہے بھلا۔ اسے اتنا احساس نہیں کہ یہاں اس کے ڈرامے کو اس کے یہ گھٹیا سرال والے بھی دلچسپی سے مزے لے لے کر دیکھ رہے ہیں۔''

وہ آوازوں کے مگر سخت ترین لہجے میں بات کرتے ہوئے باری باری پاپا اور ہانی کو خونخوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی باتوں سے اتنا ضرور ہوا کہ دیوانگی کی حد کو چھوتی ہانی گم صم سی ہو کے اردگرد کھڑے لوگوں کو دیکھنے لگی تھی۔ اس نے آہستگی سے میرا گریبان چھوڑا اور ہارے ہوئے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پاپا! جانے سے پہلے میں صرف ایک وضاحت کر دوں کہ.....پاپا میں نے.....میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے واقعی کچھ نہیں کیا۔ بلال احمد کو پیش آنے والے حادثے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں، میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ میں تو اپنے فرینڈز کے ساتھ.....''

''مجھے پتا ہے۔'' پاپا نے میری بات کاٹ دی اور میرے شانے پہ ہاتھ رکھ کے مجھے خود سے قریب کیا۔

''میں جانتا ہوں، بلکہ سب ہی جانتے ہیں بلال احمد اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے ایک بس سے کار ٹکرا بیٹھا۔ تمہاری طرف دھیان جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم میں سے کسی نے اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا، البتہ اس وقت اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر اس کے بے معنی وہم کی فوری تردید بھی اس کے سامنے نہ کر سکے۔ ویسے بھی اب تو سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہے۔ بلال کا آپریشن کامیاب رہا ہے۔ دو ایک روز میں وہ گھر آ جائے گا۔''

''یعنی آپ اب مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔''

''میں تم سے کبھی بھی ناراض نہیں تھا۔'' انہوں نے مجھے گلے سے لگایا۔

ماما کے بہت کہنے کے باوجود میں نے اپنی واپسی کی تاریخ آگے نہیں کروائی، میں اب اور دوبارہ نہیں کہنا چاہتا تھا، میں ہانی کا دوبارہ سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، مجھے عمر بھر شرمندہ کرتے رہنے کے لئے ہانی کی بس اس دن کی باتیں ہی کافی تھیں۔

بلال احمد کا بلڈ گروپ مجھ سے میچ کرتا تھا، میں نے ڈاکٹرز سے کہہ دیا کہ انہیں جتنا بھی خون چاہئے وہ میری رگوں سے کھینچ لیں اور اس شخص کے جسم میں داخل کر دیں جس سے پہلی نظر میں ہی میں نے انتہائی شدید نفرت کا رشتہ باندھ لیا تھا، اس نفرت کے باوجود میں نے دو راتیں اس کے کمرے میں کسی خادم کی طرح جاگ کر گزاریں۔ اس نے ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے میرا چہرہ دیکھا، ہانی تو ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر گھر پہ تھی۔ وہ لو بلڈ پریشر کی پیشنٹ تھی اور اب اس وقت اس کا بی پی خطرناک حد تک لو تھا اس کے علاوہ اس حادثے نے اس کا نروس سسٹم بھی متاثر کیا تھا۔ بلال کی ہر طرح کی دیکھ بھال ان دو راتوں اور تین دنوں میں، میں نے ہی کی۔ دوا کھلانا، سوپ پلانا، پھل کاٹ کے دینا اس کا ہاتھ منہ صاف کرنا، یہ سب میں صرف یہ ثابت کرنے کے لئے کر رہا تھا کہ سعد رضوان پیرزادہ کو بھی محبت کرنا آتی ہے اور یہ مجھے کسی اور پہ نہیں خود پہ ثابت کرنا تھا۔ ہانی کے اس الزام کو دھونے کے لئے.....کہ.....

''سعد رضوان! محبت کرنے سے پہلے یہ سیکھ تو لیتے کہ محبت کرتے کیسے ہیں۔''

اور میں.....اب سیکھنے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

آٹھ سال کی عمر میں، میں نے محبت کی۔

چودہ سال عمر میں محبت کا احساس ہوا۔

پندرہ سال کی عمر میں، میں نے محبت کا اظہار کیا۔

سولہ سال کی عمر میں، میں نے محبت کا دکھ اٹھایا۔

اور اب..... بیسویں سال میں، یعنی اس سے ملنے کے بارہ سال بعد میں نے محبت کو سیکھنا شروع کیا۔

یہ پڑھائی میرے دل کے بوجھ کو رفتہ رفتہ کم کرتی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

میں شاید تم کو یکسر بھولنے والا ہوں۔

شاید.....

جانِ جاں شاید.....

کہ اب تم مجھ کو پہلے سے زیادہ یاد آتی ہو۔

ابھی تو میں نے اس بوجھ سے آزادی حاصل کرنے کی جانب پہلا قدم بڑھایا تھا کہ ہانی کا خط میری رفتار کو دھیما کرنے آ گیا۔ مجھے آئے دو ہفتے ہوئے تھے جب ایک خوبصورت معذرتی کارڈ کے ہمراہ اس کا تحریر کردہ مختصر سا خط موصول ہوا۔

''سعد رضوان!

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس خط میں کیا لکھوں، تمہیں مخاطب کروں تو کس انداز میں؟ تم سے معذرت کروں تو کن الفاظ میں؟ تم سے معافی مانگوں تو کیسے؟ صرف اتنا کہوں گی کہ جب کسی کو اپنے ہاتھ سے کسی ایسے ہاتھ کے چھوٹنے کا اندیشہ لاحق ہو جائے جس کے بغیر وہ اک پل جینے کا تصور بھی نہ کر سکتا ہو تو شاید اس کے حواس ایسے ہی مختل ہو جاتے ہوں گے جیسے میرے ہوئے۔

یہ بلال سے میری شدید محبت تھی جو میں تم سے اتنا سب کہہ بیٹھی۔ یہ میری تم سے نفرت نہیں تھی سعد! پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ تم نے بلال کو..... حالانکہ تم میرے لئے غیر نہیں ہو، تمہیں میں آج سے نہیں کئی سالوں سے جانتی ہوں، لیکن سعد! میرا اپنی ''پہچان اور پرکھ'' پہ سے اعتماد ڈانواں ڈول کرنے والے بھی تو تم ہی ہو۔ اب میں نے کسی بھی شخص کو اندر تک جان لینے کا دعویٰ کرنے سے توبہ کر لی ہے، یہ دعویٰ کبھی مجھے تمہارے متعلق تھا اور اس دعوے کو تم ہی نے ایک بار اپنے بچپنے میں پتنگیوں میں اُڑا دیا تھا۔ غلطی یقیناً میری تھی جو میں تمہاری اس حرکت کو دل سے معاف نہ کر پائی۔

تم واپس لوٹے تو ایک بار پھر تمہاری زبان سے وہ سب سن کر میں نے فرض

کر لیا کہ تم اب میرے بچپن کے بھولے سے مخلص دوست نہیں ہو۔ اسی لئے بلال کے ایکسیڈنٹ پہ میرا دماغ الٹ گیا اور میں بغیر سوچے سمجھے تمہیں الزام دینے لگی۔ تمہارے جانے کے بعد انکل نے اور خود بلال احمد نے مجھے بتایا کہ تم میری اس قدر بکواس سننے کے باوجود بھی میری خاطر کیا کچھ کرتے رہے۔

تمہارا بلال کو خون دینا، اس کا خیال رکھنا اس کے لئے رات رات بھر جاگنا.....

یہ سب میرے علم میں آ گیا اور میں ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی کہ کیا واقعی مجھے اتنی عمر گزار لینے کے بعد بھی کسی کو پرکھنا نہیں آیا۔ آج سے پہلے جب بھی میں نے تمہارے ساتھ اپنے گزشتہ رویے کو یاد کیا میں نے خود کو حق بجانب سمجھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے تم سے اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آنا چاہئے۔

لیکن آج سوچتی ہوں تو سوائے افسوس کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں کچھ بھی کر لیتی، تمہارے لئے دل میں ایسی کوئی گنجائش پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ میرے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔ نہ پہلے کبھی، نہ بعد میں، میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دینے کے لئے خود کو نااہل سمجھتی ہوں اور یہ نااہلی میری زندگی کا سب سے بڑا افسوس ہے۔''

وہ کیا کہنا چاہتی تھی، میں سمجھ بھی رہا تھا اور ٹھیک طرح سے سمجھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ صرف ایک احساس تھا جو اندر تک اُترتا جا رہا تھا اور وہ یہ کہ..... میں اس ''شاید'' سے کبھی نہ نکل پاؤں گا۔

پاکستان چھوڑنے کے ساتھ ہی میں نے اس جذبے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا جو میرے لئے ہمیشہ ایک معمہ بنا رہا۔ پتا نہیں یہ جذبہ ضد تھی، انا تھی، یا محبت، نفرت یا پھر کشش..... یہ جو بھی تھا میں نے اسے بھول جانے کی قسم کھائی تھی کہ اس کا یہ خط اور سب سے بڑھ کے افسوس مجھے پھر سے اس ''شاید'' کی دلدل میں دھنسانے لگا۔

''اے مجھ سے محبت نہیں مگر کیا یہ کم بڑی بات ہے کہ اس نے میری محبت کو تسلیم کیا اور یہ بھی کہ مجھ سے محبت نہ کرنے پہ اسے ہمیشہ افسوس رہے گا۔''

میں خوش فہم ہو گیا۔ حالانکہ یہ اتنی بڑی بات بھی نہ تھی کہ میں خوشی سے بے قابو ہوتا پھرتا۔ وہ ایک شخص کی بیوی تھی، اس سے مخلص تھی اور اس سے محبت بھی بے پناہ کرتی تھی۔ اس نے یہ خط میری یاد میں بے قرار ہو کے نہیں لکھا تھا، بلکہ اپنے اس رویے کی بدصورتی کی معذرت کرنے کے لئے لکھا تھا اور اسے ایسا کرنا بھی چاہئے تھا، یہ اس کا اخلاقی فرض تھا۔

احسان تو نہ کر رہی تھی وہ.....اور اس خط میں بھلا کیا لکھا تھا.....یہی نا کہ وہ چاہے بھی تو میرے متعلق ایسا کبھی نہیں سوچ سکتی پھر میں اتنا خوش کیوں ہو رہا ہوں۔ کیا صرف اس لئے کہ جس محبت کے بارے میں مجھے خود شک سا تھا کہ شاید ہے، شاید نہیں۔ اسے ہنی نے پوری سچائی سے تسلیم کر لیا ہے۔

''اور شاید یہ بلال احمد درمیان میں نہ ہوتا تو وہ اپنی نااہلی پہ افسوس کا اظہار بھی نہ کر پاتی۔''

ایک اور شاید نے دل میں جگہ بنائی۔

تمہارے رنگ مجھ میں اور گہرے ہوتے جاتے ہیں
میں ڈرتا ہوں
میرے احساس کے اس خواب کا انجام کیا ہوگا
اے میرے اندرونِ ذات کے تاراج گر
جذبات کے بیری وقت کی سازش نہ ہو کوئی
تمہارے اس طرح ہر لمحہ یاد آنے سے
دل سہما ہوا ہے
تو پھر تم کم ہی یاد آؤ۔

☆======☆======☆

اس بار میں پانچ سال کی طویل مدت کے بعد وطن واپس لوٹ رہا تھا۔

ان پانچ سالوں میں بہت کچھ نہیں بدلا تھا، مگر جو دو تبدیلیاں آئی تھیں، وہ اتنی اہم تھیں کہ زندگی کی ساری ڈگر ہی مختلف ہو گئی تھی۔

ایک تبدیلی تو یہ آئی تھی کہ میں نے خود اذیتی کے چابک مار مار کے دل کو مستقل مزاجی کی راہ میں لگا ہی لیا تھا۔ میں نے ہنی کو بھلانے کی ہر ممکن کوشش کرنے کا عہد کیا خود سے اور یہ تہیہ بھی کہ اگر میں اسے بھلا نہ بھی پایا تو کم از کم اس کے بارے میں اب مزید کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کی گنجائش نہیں رکھنی۔ اس ایک خط کے بعد ہانی نے مجھ سے دوبارہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بھی اس خط کا کوئی رسپانس ظاہر نہ کیا تھا۔ میں نے پاپا اور ماما سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں اب پاکستان آنے میں دلچسپی نہیں رکھتا، اسی لئے وہ خود ہی سال ڈیڑھ سال بعد مجھ سے ملنے آ جایا کرتے۔

دوسری تبدیلی دو سال پہلے ہونے والی پاپا کی اچانک وفات تھی۔ وہ یہیں میرے پاس

امریکہ آئے ہوئے تھے۔ ماما بھی ساتھ تھیں۔ لوگ اس ملک میں کئی بیماریاں سمیٹ لاتے ہیں، علاج کی نیت سے.....پھر یہاں کے شعبدہ گر ڈاکٹروں کی بدولت برسوں کی تکالیف کو جھٹک کر بھلے چنگے ہو کر واپس جاتے ہیں مگر میرے پاپا ٹھیک ٹھاک آئے اور آنے کے تیسرے دن ہی انہیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ ایمبولینس سے ہاسپٹل لے جاتے ہوئے راستے میں ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔

پاپا کا کوئی قریبی عزیز یعنی ماں، باپ، بہن، بھائی تو اب رہا نہیں تھا۔ اکلوتی بھتیجی یعنی ہانی بھی ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ عمرہ ادا کرنے گئی ہوئی تھی، اسی لئے ماما سے مشورہ کرنے کے بعد ان کی آخری رسومات یہیں ادا کر کے مدفین کر دی گئی۔

میں نے بعد میں ماما سے بھی بہت کہا کہ وہ یہیں رک جائیں، مگر انہیں اپنے وطن کی یاد ستا رہی تھی۔ ویسے بھی یہاں رہ کر وہ اپنی زندگی گزارنا تو بھول ہی گئی تھیں۔ میں نے بھی غور کیا تو پاکستان جانا ہی ماما کے لئے بہتر سمجھا۔ وہاں جا کر وہ اپنے انسٹی ٹیوٹ کی مصروفیات میں مگن ہو کر زیادہ جلدی خود کو پاپا کی اچانک وفات کے صدمے سے نکال پائیں گی۔ یہاں اجنبی ماحول میں بغیر کسی روٹین اور مصروفیت کے وہ قنوطیت اور یاسیت کا شکار ہو رہی تھیں۔ البتہ میں نے ان سے یہ وعدہ ضرور لے لیا کہ وہ ایک دو سالوں تک پاپا کا بزنس وائنڈ اَپ کر کے اور اپنا انسٹی ٹیوٹ ختم کر کے یہیں لوٹیں گی اور یہ مائنڈ میک اَپ کر کے آئیں گی کہ اب انہیں یہیں رہنا ہے۔ وہ میری بات سن کر چپ ہو گئیں پھر ایک شرط پر یہ وعدہ منظور کیا۔

''اگر رضوان یہاں نہ ہوتا تو شاید میں کبھی اس طرح تمہاری یہ شرط نہ مانتی لیکن پھر بھی ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ ہوتے ہی تم پاکستان آؤ گے۔ خود اپنے پاپا کی ساری پراپرٹی کا فیصلہ کرو گے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ اس کے بعد تم پاکستان میں ہی کسی اچھی فیملی کی لڑکی سے شادی کرو گے، چاہے وہ تمہاری اپنی پسند ہو یا پھر میری پسند۔ پھر اگر تم امریکہ اپنی فیملی کے ساتھ سیٹل ہونا چاہو تو مجھے بھی تمہارے ساتھ آنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

اور میں جو کبھی وہاں نہ جانے کی قسم کھائے بیٹھا تھا، میں اس پہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد میرے ڈیڑھ سال بے حد مصروف گزرے۔

ایگزامز سے فراغت ملتے ہی ماما نے مجھے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ میں نے خود کو ٹٹولا۔ کہیں کسی وہم، کسی اندیشے، کسی پچھتاوے کا گزر نہ تھا، کسی بیتے پل کی ناخوشگوار آہٹ نہ تھی۔ عرصے بعد میں نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا اور دل و دماغ کی تمام تر آمادگی کے ساتھ پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگا۔

☆======☆======☆

وہاں پہنچتے ہی مجھے جو چہرہ سب سے پہلے نظر آیا، وہ ہانی کا تھا۔

میں حیران رہ گیا۔ وہ ویسی کی ویسی تھی۔ حالانکہ پانچ سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ وہی اس کے مخصوص سادہ طرز کے بندھے ہوئے سیدھے سلکی بال..... وہی اس کی دھلی دھلی شفاف سرمئی آنکھیں جن میں دکھ ٹھہر سا گیا تھا، اداسی منجمد ہوگئی تھی۔ میں ایک بار پھر دہرائے بغیر نہ رہ سکا۔

''واقعی، اس سے زیادہ اداس آنکھیں میں نے زندگی میں کبھی اور کہیں بھی نہیں دیکھیں۔''

یقیناً ماما نے اسے میرے بارے میں بتایا ہوگا، اسی لئے وہ پہلے سے یہاں موجود تھی۔ پچھلی بار جب میں آیا تھا تو وہ جس نارمل انداز میں مجھ سے ملی تھی، اب بھی اسی طرح ملی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے درمیان کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو..... نہ تلخ..... نہ شگفتہ..... اچانک دھیان آنے پر میں نے بلال احمد کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ چپ ہوگئی اور سر جھکا کے اپنی ہتھیلی مسلنے لگی۔ وہی اس کی پرانی عادت۔ میں نے ماما کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر ناگواری واضح تھی۔ میں نے فی الحال اس مسئلے کو چھیڑنا مناسب نہ جانا۔ بعد میں اس کے اپنے کمرے میں جانے کے بعد ماما نے خود بتایا۔

''خود ہی پسند کر کے شادی رچائی۔ اب خود ہی بے زار بیٹھی ہے۔ پہلے دیکھنا تھا کہ اس دقیانوسی ماحول میں پرورش پانے والے مڈل کلاس ذہنیت کے شخص سے گزارہ ہوسکتا ہے یا نہیں۔ کیا پہلے اسے نہیں پتا تھا کہ اس کی ماں اندرون شہر کی ٹپکل گالم گلوچ کرنے والی اور بہو کی چوٹی اکھاڑنے والی عورت ہے۔ پہلے نہیں پتا تھا کہ.....''

''ماما! ہوا کیا ہے؟'' میں ماما کی شکایتیں سننے کے بجائے، اصل بات جاننا چاہتا تھا۔

''ہونا کیا ہے، وہی، کل، کل اور جج جج جو اس قسم کی بے جوڑ شادیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ تنگ آ گئی ہوں میں تو۔ میں نے پہلے دن رضوان کو وارن کیا تھا کہ بیٹ پونچنے ایسے ہی نہیں ہماری لڑکی پر لٹو ہوئے۔ سارا پیسے کا کھیل ہے اور میری بات سچ نکلی۔ اب وہ شخص بلال احمد جس نے اس وقت رضوان کی جانب سے ہماری فرم میں ایک اچھی پوسٹ لینے سے انکار کر دیا تھا اور جسے ہانی نے اس کی خودداری بتلایا تھا، وہی خوددار اور غیور شخص ہانی پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ وہ اپنی ساری جائیداد اس کے نام کردے اور یہ لڑکی جسے عمر بھر پیسے کی ذرہ برابر پروا نہیں رہی، اب چٹان کی طرح ضد پر اڑی ہے کہ وہ ایک دھیلا تک اسے نہ دے گی حالانکہ وہ

اس کا شوہر ہے، اگر اس کی جائیداد کی بدولت وہ کوئی اچھا کاروبار شروع کر لیتا ہے تو اسی کا بھلا ہے۔ بارہ ہزار کی جاب یہ کرتی ہے، پندرہ سولہ ہزار وہ کماتا ہے ہر ماہ۔ آج کل کے دور میں کہاں گزارا ہوتا ہے اور اگر خدا نے دیا ہوا ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ سلمان بھائی صاحب کی جائیداد کی اکیلی وارث ہانی ہی تو ہے اور رضوان نے بھی اس کے نام کئی شیئرز لے کر رکھے ہوئے ہیں پھر کیا ضرورت ہے اتنا کھینچ تان کے گزارہ کرنے کی، معمولی سی ملازمت میں سر کھپانے کی اور اپنی میرڈ لائف میں تلخیاں گھولنے کی۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ وہ اپنا سب کچھ شوہر اور سسرال والوں کے حوالے کر کے خود خالی ہاتھ ہو جائے۔ ایسے تو ان لوگوں کا لالچ بڑھتا جائے گا۔ میرا تو خیال ہے کہ ہانی جیسی متحمل مزاج اور ٹھنڈے دماغ کی لڑکی اگر اس حد تک آئی ہے تو وہ یقیناً ان لوگوں کی بے تکی ڈیمانڈ کا ردعمل ہے۔''

''اب جو بھی ہے، اگر جائیداد کے بدلے اس کا گھر اور گھرہستی بچتی ہے تو کیا بُرا ہے۔ کوئی کم جائیداد تو نہیں ہانی کے پاس۔ بھائی صاحب کے ہوٹل کی رقم کافی ہے۔ پچاس لاکھ کے شیئرز تمہارے پاپا نے اس کے نام کئے تھے جب اس کی شادی ہوئی تھی۔ اپنے پینشن کا ایبٹ آباد والا بنگلہ تو اس کا ہے ہی۔ تمہارے پاپا نے بھی اپنی زندگی میں اسلام آباد والا فلیٹ اس کے نام کیا ہے اور تمہاری دادی نے بھی لاکھوں کی مالیت کے خاندانی زیورات کا ایک بڑا حصہ.....''

''ماما پلیز، آپ اس حساب کتاب کے بجائے غیر جانب داری سے سوچئے۔ بات صرف روپے پیسے کی نہیں، اعتماد اور محبت کی ہے۔ ہانی نے بلال احمد میں کیا دیکھا تھا۔ ذہانت، قابلیت، حیثیت..... کس حیثیت سے وہ اس کا ہم پلہ تھا؟ شاید اسے بلال احمد کی خودساختہ اور وقتی خودداری ہی نے متاثر کیا ہو اور جب یہ طلسم اُترا ہوگا تو مایوسی میں وہ اتنا شدید ردعمل اپنانے پر مجبور ہوگئی ہوگی۔''

''تو کسی نے مجبور کیا تھا اسے یہ شادی کرنے پر۔ اپنے کئے فیصلے پر وہ اب پچھتا رہی ہے۔ اگر کہیں ہمارے پسند کئے رشتے پر ہاں کر بیٹھتی تو نہ جانے کتنے دن برداشت کرتی۔ اگلے ہی مہینے واپس آ گئی ہوتی۔ تمہارا کیا خیال ہے، وہ صرف ناراضی ظاہر کرنے یہاں بیٹھی ہے؟ علیحدگی کا پکا ارادہ کر لیا ہے صاحبزادی نے۔ خلع کا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ میں پوچھتی ہوں، ایسی بھی کیا ہوس دولت کی۔ کروڑوں کی اکیلی وارث ہو۔ دو چار کروڑ شوہر کو دے کر کوئی کاروبار جما دو اس کا۔ ساس نندیں لالچی ہیں تو دس دس لاکھ منہ پر مارو ان کے اور ہمیشہ

کے لئے چپ کرادو۔ کم از کم اپنی گھر ہستی اور زندگی تو محفوظ کرو۔"

"ایسی خریدی ہوئی محبت اور زندگی کا کیا فائدہ ماما! یہ تو آپ بھی جانتی ہیں کہ ہانی کو پیسہ کبھی بھی عزیز نہیں رہا۔ اس نے شاید کبھی یہ پتا تک لگانے کی کوشش نہ کی ہوگی کہ اس کے نام کیا کچھ ہے اور کتنا ہے۔ وہ تو اتنی سادہ دل اور سادہ طبیعت ہے۔ سودے بازیاں کر کے وہ کبھی بھی خوش نہیں رہ سکتی تھی۔"

"بس بھی کرو سعد! جب سے آئے ہو، ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے، ایک ہی فکر کے پیچھے ہلکان ہو رہے ہو۔ ہانی، ہانی..... کیا وہ اتنا ہی اہم مسئلہ ہے تمہارے لئے؟ وہ جانے اور اس کی زندگی۔ چاہے سنوارے، چاہے بگاڑے۔"

"ماما! پلیز۔" میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کی اس درجہ لاتعلقی پر۔ "ماما! مت بھولیں، وہ ہماری ذمہ داری ہے۔"

"کیسی ذمہ داری؟ ہم یہ ذمہ داری نباہ چکے ہیں۔ رضوان نے اپنی اولاد کی طرح اس کی پرورش کی۔ اس کی امانت، اس کے والد کی جائیداد کی حفاظت کی۔ اسے اچھی تعلیم دی، مناسب پرورش کی اور تو اور اس کی خاطر اکلوتے بیٹے کو گھر سے دور کیا۔ اسی کی پسند سے اس کی شادی دھوم دھام سے کی، جاتے جاتے بھی وہ اسے نہ بھولے اور بیٹے کے ساتھ ساتھ اسے بھی جائیداد میں سے حصہ دیا۔ اب وہ تمہارے تایا کی بیٹی نہیں رہی، اپنے گھر بار والی ایک شادی شدہ عورت ہے۔ پیرزادہ فیملی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں، اگر ہمیں اس کے لئے کچھ کرنا چاہئے تو صرف اتنا کہ اسے اس احمقانہ فیصلے سے باز رکھیں۔ اسے مجبور کریں کہ وہ خلع کا مقدمہ واپس لے کر صلح صفائی کی کوشش کرے۔" انہوں نے سفاکی سے کہا۔

"سوری ماما! کم از کم میں تو ایسا نہیں کر سکتا، مجھے اس کا یہ فیصلہ بالکل درست لگ رہا ہے۔"

"اسی بات کا..... اسی بات کا ڈر تھا مجھے۔" ماما یک دم غصے میں آ گئیں۔

"اب بھی تمہارے سر پہ اس کا جادو چڑھا ہوا ہے۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تمہیں آنے سے نہ روک کر۔ جس دن یہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آئی، مجھے اسی دن تمہیں فون کر کے یہاں آنے سے منع کر دینا چاہئے تھا۔"

"آپ غلط سمجھ..... میں ان کے اندازے پر خجل سا ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت میرے وہم و گمان میں دور دور تک ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میں نے پوری غیر جانب داری اور حقیقت پسندی سے اس سارے معاملے کا تجزیہ کیا تھا۔

"ہاں، شاید میں غلط سمجھ رہی ہوں۔" میرے شرمندہ شرمندہ سے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کے ماما نے کہا۔

"میرا بیٹا! یہ نہیں، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ اگر اس وقت رضوان نے سب کچھ مجھ سے پوشیدہ رکھنے کے بجائے، مجھے آگاہ کیا ہوتا تو اس سب کی نوبت ہی نہ آتی۔ پندرہ سالہ لڑکے کو بھلا اتنا شعور کیسے کہ وہ ایک لڑکی..... اور بھی اس جواس سے عمر میں کئی سال بڑی ہو، اس کے لئے ایسے جذبات رکھے۔ یہ سب ہانی کا کیا دھرا ہے۔ اس نے تمہیں شہ دی ہوگی، تمہیں بھڑکایا ہوگا۔ جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کئے ہوں گے کہ تم....."

"فار گاڈ سیک ماما!" میں چلا اٹھا۔ "آپ کو کیا ہو گیا ہے، کس قسم کی سوچیں پال رکھی ہیں آپ نے۔ ہانی کے بارے میں ایسی بات آپ کیسے کر سکتی ہیں۔ کیا آپ اسے نہیں جانتیں؟"

"میں صرف تمہیں جانتی ہوں۔ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو، میرا واحد سہارا۔"

"وہ اتنے سالوں سے آپ کے سامنے ہے، آپ کو اب تک اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ کیسی ہے۔"

"تم ہمیشہ سے میرے سامنے ہو، پیدا کیا ہے میں نے تمہیں۔ کیا مجھے اندازہ نہیں کہ تم کیسے ہو۔"

"نہیں ہے آپ کو اندازہ۔" ان کے مسلسل ایک ہی تکرار کرتے رہنے پر میں زچ ہو گیا اور پھٹ پڑا۔ "آپ کو اندازہ ہوگا بھی کیسے، آپ صرف یہ کہہ سکتی ہیں کہ تم ہمیشہ سے میرے سامنے ہو، مگر ثابت نہیں کر سکتیں۔ اپنی عمر کے ابتدائی چھ سال میں نے آیا کی گود میں گزارے۔ سکول جانے کے بعد میری ذمہ داری ٹیچرز اور ٹیوٹر نے اٹھالی۔ ہانی آئی، دادی آ گئیں اور آپ بالکل ہی بے فکر ہو گئیں۔ میں کس سبجیکٹ میں کمزور تھا، مجھے کھانے میں کیا پسند تھا، کیا لنچ دے کر مجھے ناشتہ کرنے پہ تیار کیا جاتا تھا، مجھے ڈرائنگ سے دلچسپی تھی یا ویڈیو گیمز سے، مجھے رات کو کس وقت نیند آتی تھی، میں اپنا فارغ وقت کیسے گزارا کرتا تھا..... یہ سب آپ نہیں جانتی تھیں، نہ ہی آپ نے کبھی جاننا چاہا پھر آپ کس مل بوتے پر یہ دعویٰ کر رہی ہیں۔ مجھے جاننے کا دعویٰ ہے تو پہلے یہ حقیقت سن لیجئے کہ آپ کے اس چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے جو کیا، مکمل ہوش و حواس میں سراسر اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کیا۔ مجھے آپ کی طرف سے ملی مکمل آزادی، بے توجہی اور کھلی چھوٹ نے وقت سے بہت پہلے بگاڑ دیا تھا۔ یہاں میں اتنی وضاحت کر دوں کہ میں محبت کو "بگاڑ" نہیں کہہ رہا مگر میرے ماحول اور تربیت کی کمی نے مجھ پر جو اثرات مرتب کئے، ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے محبت کو بڑے ہی غلط

معنوں میں لیا اور بڑے ہی غلط انداز میں اسے ہنی تک پہنچایا۔"

"اب سارا الزام میری تربیت پہ آئے گا۔ یہ نوبت بھی آنی تھی۔" ماما رونے لگیں۔

"اس کی چالیں کوئی نہیں سمجھتا۔ عین تمہارے آنے سے پہلے وہ شوہر سے الگ ہونے کا تہیہ کر کے یہاں آگئی۔ جانتی ہے کہ اب میں نے تمہاری شادی کا ارادہ کرلیا ہے اس لئے۔"

"پلیز ماما! آپ کو خدا کا واسطہ ہے کہ اس ٹاپک کو چھوڑ دیں۔" ان کے آنسوؤں سے گھبرا کے میں نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ کچھ یہ ڈر بھی تھا کہ ماما کی بتدریج بلند ہوتی آواز ہنی تک نہ پہنچ جائے۔

"پہلے تم یہ وعدہ کرو کہ اب تم اس کے جال میں نہ پھنسو گے۔"

"اوکاڈا!" میں نے سر تھام لیا۔

☆======☆======☆

"تم یہ جاب چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔" ماما کو مطمئن کرنے کے لئے میں دانستہ طور پر دو چار روز تک ہانی سے ذرا کھنچا کھنچا سا رہا۔ ویسے بھی پاپا کا بزنس وائنڈ اپ کرنے کے سلسلے میں میری مصروفیات مجھے گھر پہ ٹکنے بھی نہ دیتی تھیں، لیکن اس روز ناشتے کی ٹیبل پہ اسے جلدی میں آدھا سلائس نگلتے اور چائے کا کپ پی کر نکلتے دیکھا تو میں ٹوکے بغیر نہ رہ سکا۔

"چھوڑ چکی ہوں۔" اس کا مختصر جواب مجھ سے زیادہ ماما کو حیران کر گیا، اسی لئے اگلا سوال ان کی جانب سے آیا۔

"تو پھر ہر روز اتنے گھنٹوں کے لئے کہاں غائب ہو جاتی ہو؟"

"بہت سی جگہیں ہیں اس شہر میں مجھ جیسی عورتوں کے لئے، جہاں وہ دھکے کھاتی رہتی ہیں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "حقوقِ نسواں کے دفاتر، وکیلوں کے گورکھ دھندے، عدالتوں کی خواری....."

"تو کس نے کہا تھا عدالتوں کے چکر میں پڑو۔ تم نے تو ہمیں اپنا بڑا سمجھنے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ مجھ سے کہتیں، اس بلال احمد اور اس کی اجڈ ماں کے وہ لتے لیتی کہ اگلے دن ہی تمہیں آنکھوں پہ بٹھا کے لے جاتے، لیکن تم نے تو صاف کہہ دیا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور اسے میں اپنے طریقے سے ہینڈل کروں گی اور یہ ہے تمہارا طریقہ؟ صلح صفائی کی ایک کوشش تک نہ کرنے دی تم نے۔"

"اتنے سالوں سے میں یہی کوشش تو کر رہی تھی آنٹی! لیکن صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، میں اس کے ساتھ ہر حال میں گزارا کرنے کو تیار تھی۔ اس کی معمولی تنخواہ میں بھی راضی و

مطمئن تھی۔ خود محنت کر کے اس کا بوجھ بانٹ رہی تھی۔ اگر وہ بھی میری خوشی میں خوش رہنے پہ تیار ہوتا، مجھے وہ عزت اور اعتماد دیتا جس کی میں مستحق تھی تو کبھی یہ نوبت نہ آتی۔"

"مگر سوال یہ ہے کہ تم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اتنی گزارے لائق زندگی کیوں بسر کرتیں۔ ٹھیک تو کہتا ہے وہ بے چارہ۔ بیوی کے نام کروڑوں کی پراپرٹی ہو اور پورا گھرانہ تنگ دستی کے خلاف جنگ لڑ رہا ہو۔ ارے اس کے نام کرنے کا حوصلہ نہ ہو تو ٹھیک ہے، خود کو تو کوئی فیس پہنچاؤ۔ خود ہی کوئی بزنس شروع کرلو۔"

"وہ سارا سرمایہ ایک امانت ہے آنٹی!" وہ آہستگی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دماغ خراب ہے اس کا۔ امانت..... ہونہہ....." ماما بڑبڑاتی رہیں۔

☆======☆======☆

"سعد! یہ میرا بہت پرانا خواب ہے۔ اتنا ہی پرانا جتنی میری یتیمی۔ میں نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ میں ماما، پاپا اور دادی کے نام سے ایک ٹرسٹ ہاسپٹل بناؤں گی۔ میرے اس خواب سے کوئی واقف نہ تھا۔ نہ دادی، نہ تم..... نہ انکل..... ہاں، میں نے بلال کو ضرور بتایا تھا۔ اپنی شادی سے بھی پہلے اور اس لئے بتایا تھا کہ میں سمجھتی تھی، اس سے زیادہ مجھے کوئی نہیں جانتا اور کسی کو بھی یہ خواب بتایا تو وہ مجھے اس راہ میں آنے والی مشکلات سے آگاہ کر کے خوف زدہ کرنے کی کوشش کرے گا اور بلال نے وہی کیا جس کی میں اس سے توقع رکھتی تھی۔ اس نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور اب وہی وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ وہ پہلے سے جانتا تھا کہ میں اس ساری پراپرٹی سے دھیلا تک خود پہ خرچ کرنے کی روادار نہیں، کجا کہ اس کے نام کروں اور اسی کے بھائیوں، بہنوئیوں سمیت سارے خاندان کو مالی طور پر مستحکم کرنے کے لئے کاروبار سیٹ کر کے دوں۔ وہ مجھ پہ ہر طرح سے دباؤ ڈال رہا ہے، جبر کر رہا ہے اور جانتے ہو کہ جبر وہ واحد آلہ قتل ہے جس کے ذریعے محبت کی فوری موت ہوتی ہے۔"

"تو تم نے اب پکا فیصلہ کرلیا ہے طلاح لینے کا۔" اور کچھ گزرتے دن ہمیں اس نہج پہ لے آئے کہ میں نے اس سے اس معاملے پہ تفصیلی گفتگو کرنے کی ہمت کرلی۔

"نہ صرف فیصلہ، بلکہ عمل درآمد بھی۔ مجھے امید ہے کہ اگلی ایک دو پیشیوں تک فیصلہ میرے حق میں سنا دیا جائے گا۔"

"تمہیں دکھ نہیں ہوا؟" میں نے کریدنا چاہا۔

"دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ میں نے یہ قدم اٹھانے میں چار سال کی دیر کیوں کی جب کہ بلال نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھانے میں صرف ایک سال لگایا تھا۔"

''لیکن ہانی! تم اس سے محبت کرتی تھیں۔''

''نہیں سعد! مجھے صرف یہ لگتا تھا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اصل میں مجھے اس سے محبت نہیں تھی، کبھی بھی نہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہانی! جب محبت ہوتی ہے تو بس ہوتی ہے۔ تب یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ازل سے اسی محبت کے دائرے میں قید ہیں اور جب یہ محبت ختم ہوتی ہے تو لگتا ہے جیسے کبھی ہمیں محبت ہوئی ہی نہ ہو، لیکن محبت ہوتی ضرور ہے ہانی!''

''تو پھر یہ محبت ختم کیوں ہو جاتی ہے؟''

''اس لئے کہ ہمارا محبت پر سے یقین ختم ہو جاتا ہے۔''

میں نے آہستہ سے کہا اور اس کے جھکے سر کو دیکھتا ہوا وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کے ریشمی بالوں کے درمیان سے نکلتی سیدھی دودھیا مانگ مجھے ایک بار پھر سے کھینچ رہی تھی۔ میرے قدم دوبارہ آگے بڑھ رہے تھے، اسی لئے میں فرار ہو گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے دروازہ بند کر لیا۔

''جب محبت ہوتی ہے تو لگتا ہے ازل سے ہم اسی محبت کے دائرے میں قید ہیں اور جب یہ محبت ختم ہو تو لگتا ہے جیسے کبھی ہمیں محبت ہوئی نہ ہو۔''

اپنے ہی الفاظ مجھ پر سوچ کے نئے در وا کرنے لگے۔

''ہر بار میں خود کو یقین دلاتا ہوں کہ ہانی کے لئے میرے دل میں جب کبھی جو بھی جذبہ پیدا ہوا ہے، وہ محض پسندیدگی اور کشش تھی۔ اس کے پُرزور انکار کی ضد میں پیدا ہونے والی سرکشی ہے، محبت نہیں۔ بار بار میں اپنے ہی پھیلائے جال میں پھنس کر اس محبت سے تائب ہو جاتا ہوں..... تب ایسا لگتا ہے جیسے دل پہ ایسے کسی موسم کا کبھی گزر ہی نہ ہوا ہو۔ وہ نظر بھی آ جائے تو کچھ نہیں ہوتا۔ مل بھی جائے تو دل نہیں کھنچتا پھر ایسے ہی..... اچانک..... بلا وجہ.....

کبھی اس کی آنکھ کا کوئی آنسو، کبھی اس کی بھیگی زلفوں سے اٹھتا وہ مانوس سی مہک میں بسا جھونکا۔ کبھی اس کی نرم مسکان کی کوئی بھولی بسری یاد..... ایک دم ہی مجھے محبت کی پھوار میں بھگو دیتی ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے میں کبھی اس کی محبت سے کنارہ کش ہوا ہی نہیں تھا۔ میں تو ہمیشہ سے اس محبت میں گرفتار ہوں۔ ایک بار پھر یہ پھوار کن من کن من کرتی مجھے بھگو رہی تھی۔

''ہاں، میں ہنی سے محبت کرتا ہوں، یقیناً..... یقیناً میں اس سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ کوئی بھی مجھے اس محبت سے نہیں روک سکتا۔ میں خود بھی نہیں۔ اب کوئی ''شاید'' میرے اس یقین کو لڑکھڑانے پر مجبور نہیں کرے گا۔''

☆======☆======☆

وہ سر تھام کے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

''سعد..... تم.....'' لگتا تھا اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔ کافی دیر کے بعد بھی وہ ان دو لفظوں کے سوا اور کچھ نہ دہرا سکی۔ حالانکہ میں نے اس کی ہر متوقع بات کے جواب میں کئی دلائل رٹ رکھے تھے اور اپنا مقدمہ کامیابی سے لڑنے کے لئے صفائیاں بھی۔

''ہاں ہنی! مان جاؤ کہ یہی سچ ہے۔ ان سب باتوں کو بھول جاؤ جو ہمارے درمیان اتنے فاصلے پیدا کرنے کا سبب بنی تھیں۔ وہ سب پتا نہیں کیا تھا..... قسمت کا ایک چکر..... میری بدحواسی..... اپنے ہی محسوسات کے بارے میں میری لاعلمی..... تم مجھ سے متنفر ہو گئیں اور تمہاری نفرت کے بعد میں خود اپنے آپ سے بھی نالاں ہو گیا۔ کیوں تمہاری نظروں سے خود کو گرایا مگر میں غلط تھا، میں بلاوجہ خود سے نفرت کرتا رہا۔ میں نے ہمیشہ تم سے محبت ہی کی ہے ہنی! اور یہ ویسی محبت قطعی نہیں جو تمہارے خیال میں تھی۔ یعنی بچپن کی انسیت اور ساتھ رہنے کی لگاوٹ اور نہ ہی یہ محبت ویسی تھی جیسا میں اتنا عرصہ سمجھتا رہا۔ یعنی وقتی کشش اور تمہاری خوبصورتی کی طلب۔ یہ تو بڑی سچی لگن اور کھری چاہ تھی۔ میرا جرم تم سے محبت کرنا نہیں تھا ہنی! میری غلطی اسے تمہارے آگے غلط اور بے ڈھنگے پن سے ظاہر کرنا تھا۔ یہ فن شاید مجھے اب بھی نہیں آیا، اسی لئے اب بھی میرے الفاظ تمہارے چہرے پہ شکنیں پھیلا رہے ہیں، لیکن میرا یقین کرو، مجھے محبت کرنی آتی ہے یا نہیں، اس کے اظہار کا سلیقہ ہے یا نہیں.....''

''بس کرو سعد! بس کرو۔'' وہ جیسے کراہی تھی۔

''نہ تم بار بار مجھے یہ دکھ دینے سے باز آؤ گے، نہ ہی میں یہ غلطی دہرانا ترک کروں گی، ہر بار سب کچھ بھلا کر تم سے پھر بے تکلف ہو جانے والی غلطی۔ اب تم اتنے سالوں بعد لوٹے تو تمہیں دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ تم بدل گئے ہو، بہت بدل گئے ہو۔ تم مجھے دیکھ کر نظریں نہیں چرا رہے تھے جیسے میری شادی کے وقت چراتے تھے۔ تمہاری زبان مجھ پہ زہر میں بجھے تیر نہیں برساتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر از خود یہ فرض کر لیا کہ تم سب بھول چکے ہو۔ ویسے بھی میرا خیال تھا کہ اب ایک ایسی عورت میں تمہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جو اپنی عمر کے تیس سال پورے کر کے چوتھی دہائی پہ گامزن ہے اور جو عنقریب ایک طلاق یافتہ عورت کہلائے گی اور جس نے اپنی ازدواجی زندگی کے پانچ تلخ سال گزار کے خود کو بنجر کر لیا ہے۔ اس عورت میں تمہیں کیا دلچسپی محسوس ہو سکتی ہے مگر میں حیران ہوں کہ اب بھی تم..... مجھے تو لگتا ہے کہ تم یہ سب صرف مجھے زچ کرنے کے لئے کہہ رہے ہو۔ تم بہانے بہانے سے صرف مجھے پریشان

کرنا چاہتے ہو اور کچھ نہیں۔"

"ہنی! پلیز ایسا مت کہو۔ میں تمہیں دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم مجھے بے حد عزیز ہو۔ میرا یقین کرو، میں سچ مچ تم سے محبت....." لیکن اس نے میری بات کاٹ دی۔

"محبت.....؟ کیسی محبت؟ یہ اکیسویں صدی ہے سعد رضوان! یہ وہ دور نہیں کہ بغیر دیکھے، بغیر جانے کسی کو محض کسی کے نام سے ہی محبت ہو جائے.....کوئی کسی کا احساس دل میں پالے عمر بتا دے۔ آج کی محبت اگر کہیں ہوتی بھی ہے تو کچھ دیکھ کر.....سارا نفع نقصان پرکھ کے۔ مجھے دیکھو، کیا میں تمہیں سودے باز قسم کی عورت نظر آتی ہوں۔ میں نے زندگی میں ہمیشہ جس کو چاہا، خلوص نیت سے چاہا لیکن جب میں نے بھی بلال احمد سے محبت کے سارے پہلوؤں کو سامنے رکھا، اس کی ذات سے مجھے تحفظ مل رہا تھا۔ ہماری مکمل ذہنی ہم آہنگی تھی اور سب سے بڑھ کے یہ کہ اس نے میرے دیرینہ خواب کی تکمیل میں میرا پورا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس محبت کو اپنے لئے قطعی ضرر رساں نہ سمجھتے ہوئے اس سے شادی کر لی اور جب یہ احساس ہوا کہ یہ محبت زیاں کے سوا مجھے اور کچھ نہیں دے رہی۔ میرا سارا خلوص اور دیانتداری بے کار جا رہی ہے کیونکہ اس شخص کو ان سب کی چاہ ہی نہیں، تو میری محبت آپوں آپ فنا ہو گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹکنے میں دیر نہ لگائی۔ اب یہ تم کس محبت کا فلسفہ لے کر میرے سامنے آ گئے ہو۔ بتاؤ، کیا ہے مجھ میں جس سے تمہیں عشق ہے۔ ایک ڈھلتی عمر کی عورت میں ایک پچیس سالہ خوبرو نوجوان کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مجھ میں ایسا کیا ہے جس کی تمہیں طلب ہے۔ عمروں کے اتنے فرق کے ساتھ ہماری ذہنی ہم آہنگی تو مر کے بھی نہیں ہو سکتی۔ خاندان میرا بھی وہ ہے جو تمہارا ہے، بینک بیلنس اور پراپرٹی میں تم مجھ سے کئی گنا زیادہ ہو پھر کیا ہے جو تمہیں چاہئے۔"

"تم.....صرف اور صرف تم....."

"بکواس ہے یہ.....نری بکواس۔" وہ اتنے غصے میں نہ تھی جتنا کہ ظاہر کر رہی تھی۔

آج اس کی کسی بات پہ میری نظریں جھک رہی تھیں، نہ ہی سر۔ اس لئے کہ آج میرے اندر کوئی چور "شاید" نہیں تھا۔ مکمل یقین اور اعتماد مجھے سر بلند کئے ہوئے تھا۔

"تم پہلے بھی مجھ سے چھوٹے تھے، اب بھی چھوٹے ہی ہو۔ یہ بات کیوں نہیں سمجھ لیتے۔" میرے مسلسل اس کے چہرے کو تکتے رہنے سے وہ زرد ہو گئی اور چیختے چیختے اب مدھم آواز میں کہتی بیڈ پہ بیٹھ گئی۔ میں اور آگے ہوا۔

"اِدھر دیکھو۔" میرے لہجے میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ وہ اس حکم پر پورا سر اٹھا کے مجھے

دیکھنے لگی۔

"میں تمہیں چھوٹا لگتا ہوں، ہاں، پہلے میں تم سے چھوٹا ضرور تھا لیکن اب دیکھو تم ویسی کی ویسی ہو اور میں بڑا ہو گیا ہوں۔" یہ میں بھی جانتا تھا کہ میری دلیل ایک دم بچگانہ ہے، وہ بھی طنز سے مسکرا دی۔

"ہاں اور اب ایسے ہی رہنے کی باری تمہاری ہے۔ تم اتنے ہی رہو گے اور آئندہ کئی سال تک اور میں.....میں بڑی ہوتی جاؤں گی۔ تمہاری ساری محبت میری بالوں میں تار جھلملاتے دیکھ کر ختم ہو جائے گی۔ ساری دیوانگی میرے چہرے پہ نمودار ہوتی جھریوں کو دیکھ کر فنا ہوتی جائے گی اور ان سب میں میرے حصے میں کیا آئے گا، صرف شرمندگی اور ذلت.....میں اتنا بوجھ سمیٹوں تو کس لئے.....؟ جب مجھے پتا ہے کہ انجام ایسا ہی ہونا ہے۔ آخر کار تمہیں اس بے تکی محبت کا خاتمہ ہی کرنا ہے تو کس لئے میں زمانے بھر کے طعنے تشنے سہوں۔ کیا کہیں گے لوگ کہ جس بچے کو کھلایا، اسی پہ ڈورے ڈالے۔ جس کی انگلی تھامی، اسی کا ہاتھ پکڑ لیا، بلکہ سب تو یہ بھی فرض کر لیں گے کہ میں بلال سے خلع بھی اسی لئے لے رہی ہوں۔"

"سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں۔ تم بے کار میں خوفزدہ ہو رہی ہو اور مجھے بھی کرنے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔ ان لوگوں سے ہمارا کیا واسطہ۔"

"کیا تمہارا واسطہ اپنی ماما سے بھی نہ ہو گا سعد؟"

اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ میں چپ ہو گیا۔ واقعی ماما کی ناپسندیدگی تو ان کے ہر انداز سے مترشح تھی۔

"ایسا مت کرو سعد! آنٹی کا تمہارے سوا اور کوئی نہیں۔ کیوں ان کی ناراضی مول لیتے ہو۔ میرا بھی آنٹی کے سوا اور کوئی نہیں۔ مت گراؤ ان کی نظروں سے مجھے اور جب میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہاری اس ضد کا انجام بالآخر کیا ہونا ہے تو کیوں یہ ذلت اٹھائی جائے، کیوں اپنوں کو اذیت دی جائے۔"

"پتا نہیں کیوں تم یہ فرض کر کے بیٹھ گئی ہو کہ میری محبت کا خمار ایک دن اُتر جائے گا۔ ہنی! اتنے سالوں میں، میں چاہ کر بھی.....ہزار کوشش کے بعد بھی ایسا نہیں کر سکا تو آئندہ بھی اس کا امکان ہے نہ ہی اندیشہ۔"

"اب تک ایسا اس لئے نہیں ہوا سعد! کہ تمہارے دل میں طلب باقی ہے، ضد زندہ ہے۔ جب طلب پوری ہو جائے، ضد جیت جائے تو جذبے رخ بدلنے میں وقت نہیں لگاتے۔ یہ میرا تجربہ ہے جو یقیناً تم سے زیادہ ہے۔ اپنے "بڑوں" کے تجربات سے سبق

حاصل کرنا چاہئے سعد!'' اس نے مجھے چڑانے کی کوشش کی۔

''ایک بات بتاؤں بنی!'' میں نے اسے وارننگ دی۔ ''جب بھی تم ایسے بات کرتی ہو، میرے اندر کی ضد اور توانا ہو جاتی ہے۔'' اور یہ حقیقت تھی۔

''تم مان گئے کہ یہ ضد ہے..... کیوں اپنی ضد کے ہاتھوں.....''

''یہ محبت ہے بنی! اور ایک دن میں تمہیں یہ تسلیم کروا کے رہوں گا۔''

''چلو میں نے تسلیم کیا، اب تم بھی مان جاؤ کہ یہ اگر محبت ہے بھی تو ہمارا ساتھ اس محبت کی موت ہوگا۔ تم جتنی بے قراری مجھے پانے کے لئے دکھا رہے ہو، اتنی ہی بے زاری مجھ سے چھٹکارا پانے کے لئے ظاہر کرو گے اور ایسا کر بھی نہ سکو گے، کیونکہ اس میں تمہاری ہی جگ ہنسائی ہوگی۔ تمہارے بلند و بانگ دعوؤں کے بودے ہونے کی حقیقت کھل جائے گی۔''

''بنی! میں نے ایک بار پہلے بھی تمہیں بتایا تھا، شاید تمہیں یاد ہو کہ میں نے صرف تمہارے وجود سے محبت نہیں کی۔ میں نے تمہاری خوشبو سے بھی پیار کیا ہے اور خوشبو کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ وہ تو سدا جوان رہتی ہے، اس لئے میری محبت بھی ہمیشہ جوان اور بھرپور رہے گی۔''

''تمہارا مجھ سے محبت کا ہو جانا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے، میری زندگی کا بھی اور تمہاری زندگی کا بھی۔ میں نے کبھی ایسا سوچا نہ تھا، تمہارے ساتھ کھیلتے ہوئے، تمہیں پڑھاتے ہوئے، تمہیں بہلاتے ہوئے..... مگر یہ کرشمہ ہو گیا اور اب اگر میں تم سے شادی کر لیتی ہوں تو یہ ایک اور معجزہ ہوگا۔ تو جہاں اتنے غیر متوقع واقعات ہو سکتے ہیں تو یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ تم بدل جاؤ۔ سعد رضوان! ایک چیز تسلیم کرنا میرے لئے ناممکن ہے مگر تم ضد ہو کہ میں اسے تسلیم کرلوں پھر جسے ماننے سے تم انکاری ہو، میں اس پہ قائم کیوں نہ رہوں۔ یہ ہو کے رہے گا سعد! کم از کم اس صورت میں تو ضرور ہوگا کہ میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤں۔ اس کے بعد محبت کا یہ نشہ کتنی جلدی ہرن ہوتا ہے، یہ تم ضرور دیکھو گے لیکن صرف اپنی اس ایک پیش گوئی کو سچا ثابت کرنے کی خاطر میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی۔''

''تم سب کچھ مجھ پہ چھوڑ دو بنی! اور مطمئن ہو جاؤ۔'' اس کی مسلسل ضد اور انکار بھی مجھے مایوس نہ کر رہا تھا، نہ ہی میں اپنے اصرار کو ''باقی پھر سہی'' پہ ٹالنا چاہتا تھا۔ میں آج ہی اس معاملے کا مثبت انجام چاہتا تھا اور وہ بھی من چاہا۔

''میں تمہارے سارے واہمے دھو ڈالوں گا، تم میرے ساتھ بہت مطمئن اور خوش رہو گی۔''

''یہی بات بلال احمد نے بھی کہی تھی اور پورے وثوق سے کہی تھی۔'' وہ ہنس پڑی۔

''تم میرا مقابلہ اس کے ساتھ مت کرو۔''

''ہاں، یہ موازنہ تو ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کی بات میں نے اس لئے مان لی تھی کہ میں اس سے محبت کرتی تھی۔ محبت کرنے والوں کو سارے وعدے آفاقی لگتے ہیں لیکن تم سے تو میں محبت بھی نہیں کرتی۔ کیسے اعتبار کر سکتی ہوں۔''

وہ کمرے سے نکل گئی اور میرے دیر تک محاذ پہ جمے رہنے کا ارادہ اِدھر اُدھر بکھر گیا۔

☆=======☆=======☆

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے سعد!'' ماما میرے اس طرح فیصلہ سنا دینے پہ ہکا بکا رہ گئیں۔

''میں بہت سوچ سمجھ کے یہ بات کر رہا ہوں۔''

''تمہاری سوچنے سمجھنے کی تو ساری صلاحیتیں اس نے خبط کر رکھی ہیں۔ تم کل تک کیسے بڑھ چڑھ کے میری ہر بات جھٹلا رہے تھے کہ وہ ایسی نہیں، اس کا کوئی کردار نہیں میری اس حرکت کے پیچھے۔ وہ راضی ہے تب ہی تم شادی تک کا سوچ رہے ہو۔''

''نہیں، وہ راضی نہیں ہے اور اسی ڈر سے راضی نہیں ہو رہی کہ وہ آپ کو دکھ نہیں پہنچانا چاہتی، اسی لئے میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں کہ پلیز ماما! آپ اپنے رویے میں لچک پیدا کریں۔ آپ کو کہیں نہ کہیں میری شادی تو کرنا ہی ہے تو پھر ہانی کیوں نہیں؟ اس میں کیا برائی ہے؟ اگر آپ دل سے تیار ہو جائیں گی اور میرے بجائے آپ خود ہی سے شادی کی بات کریں گی تو وہ ضرور مان جائے گی۔''

''لو..... ایک اور چال..... تم کبھی نہ جان پاؤ گے اس کی چالاکیاں۔ مجھے راضی کرنے کے لئے اس نے ایک اور بازی کھیلی ہے۔ اس طرح تمہیں آگے کر رہی ہے لیکن یہ کان کھول کے سن لو، میں کسی قسم کی اموشنل بلیک میلنگ میں نہیں آؤں گی۔ تم ابھی ناداں ہو، اس کی چلتر بازی بھانپ نہیں سکتے، میں سب سمجھ گئی ہوں اور کبھی اس کے منصوبے پورے نہ ہونے دوں گی۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، میری کروڑوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث۔ خوبصورت، صحت مند، ذہین، تعلیم یافتہ، ہر قسم کے عیب سے پاک۔ کیا ضرورت ہے مجھے جو اس سے اتنے سال بڑی، عام سی شکل و صورت کی طلاق یافتہ عورت کو بہو بنا کے لے آؤں۔''

''آنٹی.....'' ہلکی سی دستک کے ساتھ ہانی اندر داخل ہوئی تو ماما چپ ضرور ہو گئیں مگر اپنے چہرے کے تاثرات سے برہمی کو دور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

''آنٹی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔''

"اب اور کچھ سننے کی حسرت نہیں ہے مجھے۔" وہ بڑبڑائیں مگر ہنی نظر انداز کر گئی۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے، بہت سوچ سمجھ کے..... ہر طرح سے جانچ پرکھ کے.....اور میرا خیال ہے.....اور امید بھی کہ یہی میرے لئے بہتر ہے۔" اس کے پُرسکون لہجے اور مطمئن انداز پہ ماما ٹھٹکیں۔ میں بھی ہزاروں خوش گمانیوں میں گھر گیا۔

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں بلال احمد سے خلع لینے کا ارادہ ترک کردوں۔ میں اس وقت اپنے وکیل کے پاس ہی جارہی تھی، تاکہ مقدمہ واپس لینے کی کارروائی کا آغاز ہوسکے۔ آپ بھی تو یہی چاہتی تھیں ناں آنٹی! کہ میرا گھر بسا رہے، میں نے سوچا کہ بڑوں کی بات مان لینے میں ہی بھلائی چھپی ہوتی ہے۔"

اس نے دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھ کر جتایا، جب کہ میں فی الحال کچھ کہنے یا کوئی بھی ردِعمل ظاہر کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا، وہ مجھے منجمد کر گئی تھی۔

"آپ اب خوش ہیں ناں آنٹی! مجھے دعا ضرور دیجئے گا کہ میں نئے سرے سے اپنی شادی شدہ زندگی کا آغاز کرسکوں اور اسے خوش اسلوبی سے نباہ سکوں۔"

وہ ماما کے قریب آئی تو حیران حیران سی ماما کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔ فقط اس کا شانہ تھپتھپا کے رہ گئیں۔

☆======☆======☆

اس وقت میں سن رائز ہائی وے نیویارک سے گزر رہا ہوں۔ یہاں کے سب سے مہنگے اور پُرتعیش شاپنگ مال J.C-Penny سے اپنی نئی نویلی بیوی رانیہ کو شاپنگ کروانے کے بعد اب میرا رخ بروک لین کی جانب ہے، جہاں میرا نیا اپارٹمنٹ ہے۔ اس سے پہلے میں رچمنڈ ہلز میں ایک فرینڈ کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتا تھا لیکن شادی کے بعد ظاہر ہے کہ میں اسے وہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہیں پاکستان میں ہی میں نے ایسے انتظامات کر لئے تھے کہ جب میں رانیہ کو لے کر واپس آؤں تو ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ میرا منتظر ہو۔ میرے ایک امریکن دوست نے عین میری پسند کے مطابق یہ اپارٹمنٹ تیار کر رکھا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اپنی ضروریات کے مطابق ابھی ہم نے اس میں کئی اضافے کرنے تھے۔

اس وقت میں اور رانیہ ایسی ہی شاپنگ کرکے آرہے تھے۔ گروسری، کچھ ضروری کراکری اور ڈیکوریشن کی چیزیں وغیرہ۔ آج اس کے ساتھ شاپنگ کرتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے رچ بیک گراؤنڈ اور اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے باوجود ایک گھریلو مزاج کی مشرقی لڑکی ہے۔ اپنے گھر کے بارے میں اس کا ذوق اور شوق دونوں قابلِ دید تھے۔

میرے دل نے ایک بار پھر ماما کی پسند پہ مطمئن ہونے کی اداکاری کی..... ہاں اداکاری۔ اب میں مطمئن ہونے کی صرف اداکاری ہی کرسکتا ہوں۔ اطمینان ہے کیا چیز..... اس کا تجربہ اب شاید میں عمر بھر کبھی نہ کرسکوں۔

ہاں..... شاید..... اسی شاید نے ایک بار پھر مجھے بے سکون کردیا ہے۔ حالانکہ اس بار یہ "شاید" میرے حوالے سے نہیں بلکہ ہنی کے ذریعے سے میری زندگی میں شامل ہوا ہے، لیکن اس نے اپنا منحوس اثر ڈالنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

اس دن ہانی نے اپنا خلع کا مقدمہ واپس لینے اور دوبارہ بلال احمد کے گھر جانے کا فیصلہ سنا کر مجھے اس تکلیف دہ حقیقت سے روشناس کرایا تھا کہ میں کچھ بھی کرلوں، چاہے جان بھی دے کر اسے اپنی محبت کا یقین دلاؤں، وہ میرا اعتبار نہیں کرے گی۔ اگر کر بھی لے گی تو میرا ساتھ نہیں دے گی۔ میرا ساتھ اس کے لئے اس حد تک ناقابلِ قبول ہے کہ وہ اس سے بچنے کی خاطر دوبارہ اس جہنم میں جانے کو تیار ہے۔

اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ ہانی فطرتاً بہت نرم مزاج اور صلح جُو ہے۔ جلد بدگمان اور مایوس ہوجانے والی نہیں پھر اگر وہ طلاق لینے کی حد تک مجبور ہوئی ہے تو ضرور اس کے اور بلال کے تعلقات اس سے کہیں زیادہ خراب صورت اختیار کرچکے ہوں گے جتنے کہ وہ بتاتی ہے۔ کون جانے اس کو کس کس اذیت سے گزر کر خلع کا خیال آیا ہوگا اور اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے بعد وہ ماما کی مخالفت کے باوجود اس پہ مضبوطی سے قائم تھی۔ اب اگر وہ اس فیصلے میں ترمیم کررہی تھی تو اس کی وجہ صرف اور صرف میں تھا۔

وہ صرف مجھ سے بچنے کی خاطر یہ کرنا گوارا کررہی ہے۔ وہ میرے بڑھتے قدموں کے آگے بند باندھنے کے لئے یہ تدبیر کررہی ہے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا؟

کیا میں اپنی بات منوانے کی دھن میں اس قدر اندھا ہوچکا ہوں کہ مجھے یہ بھی نظر نہیں آتا کہ صرف میری دیوانگی سے گھبرا کے وہ پھر سے خود کو بلال جیسے خودغرض اور لاپرواہ شخص کے حوالے کررہی ہے۔

اور وہ اس کا خواب..... وہ ٹرسٹ ہاسپٹل بنانے کا پرانا خواب، جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے بلال سے اپنی محبت کو قربان کردیا۔ اپنی زندگی کو داؤ پہ لگا دیا۔ کیا اب وہ اس خواب سے بھی دست برداری اختیار کرلے گی۔

صرف میری وجہ سے۔

کیا میں ایک بار پھر اس کی مشکلات میں اضافہ کرنے جارہا ہوں۔

میں نے یہ سب سوچا اور دل کڑا کر کے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ اتنا تو پتہ چل چکا تھا کہ وہ میرے لئے گنجائش پیدا کرنے کی کوشش تک کرنے پہ تیار نہیں تو اگر نارسائی مقدر میں ہے تو کیوں نہ ہانی کی زندگی کو ہی کچھ سہل بنا دیا جائے۔ اس سے محروم تو مجھے یوں بھی رہنا ہے تو کیوں نہ اسے یہ یقین دلا دوں کہ میں اس کی محبت سے دست بردار تو عمر بھر نہیں ہو سکتا مگر اسے پانے کی خواہش کرنا ضرور ترک کر رہا ہوں تاکہ اگر وہ میرے خوف سے بلال احمد سے سمجھوتا کرنے پہ تیار ہوئی ہے تو اس مجبوری کی زندگی بسر کرنے سے بچ جائے۔

''ہنی! ایسا مت کرو، تم اس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ پاؤ گی۔ تم خود ہی تو کہتی ہو کہ تمہاری اس سے محبت فنا ہو چکی ہے۔''

''کبھی کبھی بغیر محبت کے بھی کسی کے ساتھ زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔''

''کیا واقعی؟ تو پھر میں کیوں نہیں ہنی.....؟'' اس کے آگے اپنی ہار کا اعلان کرنے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں پھر اس انہونی کی تمنا کر بیٹھا۔

''مگر عزت کے بغیر کسی کے ساتھ زندگی تو کیا ایک پل بھی نہیں گزارا جا سکتا۔'' اس نے یہ تمنا بھی واپس لوٹا دی۔

''تمہارے ساتھ میں مجھے اپنے لئے رسوائیاں ہی رسوائیاں اور کٹھنائیاں ہی کٹھنائیاں نظر آتی ہیں۔''

''اور یہ جو سزا تم اپنے لئے منتخب کر رہی ہو، کیا یہ کسی بہت خوشگوار زندگی کی علامت ہے؟ کیوں اپنے ہاتھوں اپنی زندگی میں زہر گھولنا چاہتی ہو ہانی! وہ تمہارا خواب، وہ مقصد.....کیا وہ سب بھول گئیں۔ نہیں ہنی! تمہیں نہ سہی مگر مجھے تمہاری پرواہ ہے۔ تم بس مجھے روکنا چاہتی ہو نا، مجھے باز رکھنا چاہتی ہو۔ لو.....میں باز آیا تمہاری چاہ کرنے سے۔''

میری آواز کپکپا گئی۔ پندرہ سال پرانی محبت.....جو میری جڑوں تک میں اُتر چکی تھی۔ اس سے تائب ہونے کا اعلان، چاہے وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو، آسان نہ تھا۔

''اب تو تم اپنا فیصلہ واپس لے لو۔''

''میرے فیصلے تمہارے وعدوں کی طرح ناپائیدار نہیں ہوتے سعد! آج تم یہ کہہ رہے ہو، کل پھر کبھی ہمارا سامنا ہوگا۔ تمہیں پھر سے اپنی بات کے رد کئے جانے کا ملال ضدی بنا دے گا اور تم پھر سے.....''

''ایسا نہیں ہوگا ہنی! میرا یقین کرو، خدا کے لئے۔ کبھی تو.....میری کسی بات پر تو یقین کر لو۔'' بس اس کے پیروں پہ گر کر گڑگڑانے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔

''میں اس صورت میں اپنا فیصلہ واپس لوں گی اگر تم آنٹی کی بات مان لو اور ان کی پسند کی ہوئی کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لو اور یہ وعدہ کرو کہ تم اس نئے رشتے کو پوری دیانت داری سے نبھاؤ گے۔''

اس نے بالآخر مجھ سے یہ شرط منوالی۔

میں اس کی زندگی سنوارنے کے لئے کچھ بھی ماننے پہ تیار تھا۔ جانتا تھا کہ اگر آج وہ بلال کے آگے ہار مان گئی تو باقی ساری عمر گھٹ گھٹ کے گزارے گی، لیکن اگر وہ آزاد ہو گئی تو کم از کم اپنا خواب تو پورا کر سکے گی۔ اس کے دل میں کسی چیز کی تکمیل کا اطمینان تو جاگے گا اور پھر اس صورت میں آئندہ اس کی زندگی میں کسی خوش آئند تبدیلی کا امکان بھی باقی رہے گا۔

میں محبت تو کر چکا تھا.....تب.....جب مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ محبت ہوتی کیا ہے.....

اب وقت آیا تھا کہ میں اس محبت کو نبھاتا.....اب.....جب کہ میں جان چکا ہوں کہ محبت ہوتی کیا ہے۔ محبت اور کیا ہے سوائے اس احساس کے.....کہ یہ شخص جس سے ہمیں محبت کا دعویٰ ہے، اس کے لئے اچھا سوچنا، اچھے کی تمنا کرنا اور اچھا چاہنا.....اور جس حد تک بس میں ہو، اچھا کرنا۔ میں اس کی شرط مان کر شادی پہ تیار ہوا تھا کہ میں اس کے لئے ''اچھا'' کرنا چاہتا تھا۔

رانیہ پتا نہیں کب سے ماما کی نظروں میں تھی۔ دولت، خاندان اور مرتبہ میں وہ ہمارے ہم پلہ لوگ تھے۔ رانیہ بھی ہر لحاظ سے ایک مکمل شخصیت رکھتی تھی۔ خوبصورت بھی تھی، شائستہ بھی.....خوش ذوق بھی اور خوش گفتار بھی۔ نئے تقاضوں سے مکمل ہم آہنگی رکھنے والا اس کا روایتی رکھ رکھاؤ والا پورا خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس لحاظ سے وہ بھی شاندار اکیڈمک ریکارڈ رکھتی تھی یعنی کہ ذہانت اور قابلیت اس کی اضافی خوبی تھی۔

پھر بھی اس کا ساتھ مجھے مطمئن نہ کر سکا تھا۔ میں اس کی خوبیوں اور حسن کا معترف ضرور تھا مگر اسیر نہ ہو سکا۔ وہ مجھے صرف ایک ''حل'' نظر آتی تھی۔ ایسا حل جسے ماما اور ہنی دونوں نے میری دیوانگی کے سدِباب کے لئے مشترکہ طور پر تجویز کیا ہو۔

کبھی میں بھی ان جذبوں کو دیوانگی ہی سمجھا کرتا تھا.....ان پہ ایمان لانے میں بہت وقت لگا مجھے۔ اب یہ چاہتے ہیں میں پھر سے اپنے اندر کی آواز کو جھٹلانا شروع کر دوں اور خود کو باور کراؤں کہ وہ سب ایک وہم تھا، ایک وقتی جذبہ.....یہ محبت نہیں تھی۔ ہاں، شاید میں اسے محبت سمجھنے لگا تھا۔ زندگی تو یہ ہے، حقیقت تو یہ ہے.....لیکن کیا کروں، میں چاہ کر بھی خود کو یہ دھوکا نہیں دے سکتا۔

میں جان گیا ہوں کہ میں نے زندگی میں کوئی کام اتنی شدت اور مستقل مزاجی سے نہیں

کیا جتنا کہ ہنی سے محبت.....اور شادی کے بعد واپس امریکہ جاتے ہوئے میں اسے ایک بار پھر یہ جتانا نہیں بھولا تھا۔

وہ خلع لے چکی تھی.....حسبِ وعدہ۔

''تم نے مجھے بڑی ہوشیاری سے ٹریپ کیا ہے ہنی! عمر بھر تم نے کبھی کسی کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کی پھر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں؟ تم جانتی تھیں کہ تمہیں بلال احمد سے ملنے والی اذیتوں سے بچانے کے لئے میں سب کچھ کر گزروں گا، اس لئے تم نے.....خیر جو ہوا.....سو ہوا.....شاید یہ سب اسی طرح ہونا تھا، لیکن اب تم مطمئن رہو، میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جا رہا ہوں۔ میری سب نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا، اپنے سارے خوابوں کی تکمیل کرنا اور اپنے لئے ایک نیا گھر بھی تشکیل دینا۔ شاید تمہاری تکمیل اور اطمینان مجھے بھی کچھ سکون بخش دے۔''

میں چلا آیا، دل میں ایک گہرا.....کبھی نہ مٹنے والا ملال لئے۔ جو اس بات کا نہیں کہ میں اسے حاصل نہ کر سکا کیونکہ اسے نہ پانے میں بھی ایک سرخروئی تھی کہ میں کم از کم اس کے لئے کچھ تو کر سکا۔ میرا پیچھے ہٹنا اس کو اس کے ارادے سے باز تو رکھ پایا، جس کے نتیجے میں اس نے بس دکھ ہی دکھ سمیٹے تھے۔

یہ ملال اس بات کا بھی نہیں تھا کہ آج ہنی کے بجائے رانیہ میری ہم سفر تھی جس کی مجھے نہ چاہ تھی، نہ طلب۔ بلکہ رانیہ کو اپنا کر مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے ہنی کی کوئی خواہش پوری کی ہو۔ جنہیں ٹوٹ کر چاہا جائے، ان کے لبوں سے نکلی خواہش پوری کرنے میں بھی ایک الگ مزہ ہے۔

پھر کیا ہے جو مجھے طول کئے رکھتا ہے.....صرف اور صرف یہ احساس کہ میں اپنی محبت ہانی سے تسلیم نہ کروا سکا۔ وہ بھلے میرا ساتھ قبول نہ کرتی، اتنا تو کہہ دیتی۔

''ہاں سعد رضوان پیرزادہ! میں ایمان لائی تمہاری محبت کی صداقت پہ.....میں نے مانا کہ تم سے زیادہ شدت سے کوئی مجھے چاہ ہی نہیں سکتا۔''

لیکن اس کے لئے تو میں اس قدر اَن چاہا تھا کہ صرف اور صرف مجھ سے بچنے کی خاطر اس نے بلال احمد کی رفاقت تک منظور کر لینا چاہی تھی۔ وہ مجھ سے اتنی خائف تھی، اسے لگتا تھا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ اس کا خیال تھا میری محبت جھاگ کی مانند ہے، اسے ڈر تھا کہ میں اسے چھوڑ دوں گا، بدل جاؤں گا۔ اس کے یہ سارے اندیشے مجھے اپنی محبت کے نام پہ گالی کی طرح پڑتے محسوس ہوتے تھے۔ ان گالیوں کی گونج نے مجھے عمر بھر ایسے ہی طول رکھنا تھا۔

''تھینک گاڈ! مجھے تو لگ رہا تھا کہ جیسے نہ جانے کتنے عرصے سے میں سفر میں ہوں۔ اتنا بڑا شہر ہے نیویارک، کہ ایک ایریا سے دوسرے ایریا تک جانے میں لگتا ہے جیسے لاہور سے بائی روڈ اسلام آباد تک کا سفر کر آئے ہوں۔''

رانیہ کی آواز مجھے خیالوں سے کھینچ لائی۔ میں اب اپنے سب ہی معمولات اسی بے دھیانی کے ساتھ کرنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ پتا بھی نہ لگا اور کب میں میکانکی انداز میں اپنے اپارٹمنٹ کے آگے رک گیا تھا۔ میں نے گہری سانس بھری اور خیالات کی اس یلغار سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہوئے خود کو حال میں کھینچا۔ رانیہ اندر جا چکی تھی۔ میں پچھلی سیٹ سے اوور کوٹ میں سے شاپنگ بیگز نکالنے لگا۔

''سعد! یہ آپ کے لئے لیٹر آیا ہے پاکستان سے۔ شاید ماما کا ہے۔'' میرے اندر جانے پر اس نے ایک لفافہ الٹ پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے بتایا جس پر بھیجنے والے کا نام نہ لکھا تھا۔

''ماما کا؟ اگر ایسا ہے تو یہ میرے نام ماما کا پہلا خط ہوگا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ سے لے کر جیسے ہی رائٹنگ کو پہچانا میری مسکراہٹ تھم گئی۔ وہ ہانی کی تحریر تھی۔

''رانیہ! میں ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اسٹڈی میں ہوں۔ ایک کپ کافی بھجوا دینا اور کچھ دیر کے لئے مجھے بالکل ڈسٹرب مت کرنا۔''

میرے اسٹڈی میں جا کر لائٹس وغیرہ آن کرنے اور بیٹھنے تک رانیہ پھرتی سے میری من پسند کافی بنا لائی۔ اس نے مسکرا کر کپ ٹیبل پہ رکھا اور بنا مجھے مخاطب کئے خاموشی سے باہر چلی گئی۔ میں نے اسے ڈسٹرب نہ کرنے کا کہا تھا اور وہ بلا کسی سوال کے صرف اس پر عمل کر رہی تھی۔ میں ایک بار پھر ماما کا مشکور ہوا، جنہوں نے میرے لئے رانیہ جیسی سمجھ دار شریکِ حیات کا انتخاب کیا تھا۔

گرم کافی کے سپ لیتے ہوئے میں نے خط کھولا۔

''سعد رضوان!

ایک بار پھر میں حیران ہوں کہ تمہیں کن الفاظ میں مخاطب کروں، تم سے کیا کہوں؟

تم ہمیشہ سے مجھے حیران ہی کرتے آئے ہو۔ کبھی خوش گوار انداز میں.....کبھی ناخوشگوار طریقے سے.....اور میں ہمیشہ تمہیں مایوس کرتی آئی ہوں مگر کیا کروں، میں نے کبھی بھی جان بوجھ کر تمہارا دل دکھانا نہیں چاہا۔

جب بہت پہلے تم نے اپنے دل کا حال مجھے سنانا چاہا تب، میرا وہ ردِعمل فطری تھا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا، وہ یہی کرتا۔ میں نے ابھی تمہیں بڑا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ تم نے اتنی بڑی بات کہہ دی۔

دوسری بار جب تم نے یہ بات کی، تب میں بلال احمد کی محبت میں سرشار تھی۔ میں تمہیں قبول کیسے کرتی، تمہارے جذبوں کی پذیرائی کیسے کر پاتی۔ الٹا تمہارے جارحانہ عمل نے مجھے بھی بھڑکا دیا اور میں تم سے سخت ترین رویہ اپنا بیٹھی۔

اور پانچ سال بعد تم جس ہانی سے ملے، وہ ایک ٹوٹی ہوئی، ہاری ہوئی عورت تھی جو خود پہ سے اعتماد کھو چکی تھی، کسی دوسرے پہ کیا کرتی۔

میں اپنی محبت کا سوگ منا رہی تھی۔ ایک اور محبت کا استقبال کیسے کرتی۔

ہاں، مجھے یہ اعتراف ضرور ہے کہ اس بار تم نے جو کہا، میں اسے ایک نوعمر کم سن لڑکے کی بات سمجھ کے نظر انداز نہ کر سکی۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔

محبت کا کیا بھروسا، کبھی بھی، کسی سے بھی ہو سکتی ہے، لیکن سعد! سچ یہی ہے کہ محبت کا کیا بھروسا، کبھی بھی..... کہیں بھی نظریں بدل سکتی ہیں۔ مجھے تمہارے جذبوں کی سچائی پہ شبہ نہیں مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ یہ جذبے ہمیشہ برقرار رہتے۔ محبت تو میں نے بھی پوری سچائی اور شدت کے ساتھ کی تھی لیکن آج میرے دل میں بلال احمد کے لئے نفرت اور بے زاری کے سوا کچھ نہیں۔ میں اس وقت سے ڈرتی تھی جب تم بھی مجھے ٹھکرا دو گے۔ اب کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ دنیا میں کہیں ایک شخص ایسا ہے جس کے دل میں میری محبت ہمیشہ رہے گی۔

تم سوچو گے میں نے خود غرضی سے کام لیا ہے، بے معنی وہم پال کر تم پہ شک کیا ہے لیکن سوچو سعد! ایسا ہو بھی تو سکتا ہے۔ شاید تم مجھ سے جتنی محبت کرتے ہو، اتنی ہی نفرت کرنے لگتے۔

شاید تمہیں میری خوشبو تو کیا، سائے سے بھی اُلجھن محسوس ہونے لگتی۔

شاید تم جلد ہی مجھ سے اُکتا جاتے۔"

☆======ختم شد======☆